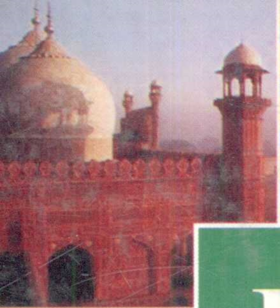

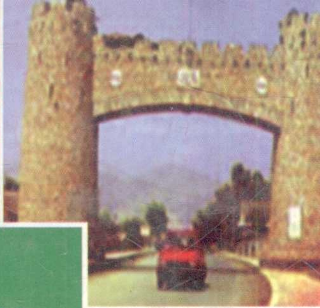

Pakistan
Society and Culture

www.KitaboSunnat.com

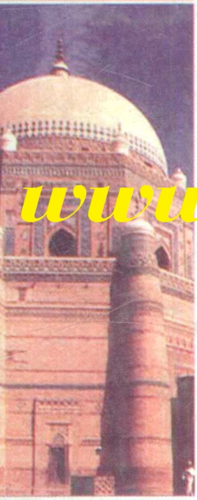

پاکستان
معاشرہ اور ثقافت

مصنفین: جان ایرڈ۔ جان جے ہونگمن۔ ڈینس برنارٹ
میری جین کینیڈی۔ لوسین برنارٹ۔ جیمز ڈبلیو، سپین
زکیہ ایگلر۔ ہربرٹ ایچ، وریلنڈ

مؤلف: سٹینلی میرن

مترجم: غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک

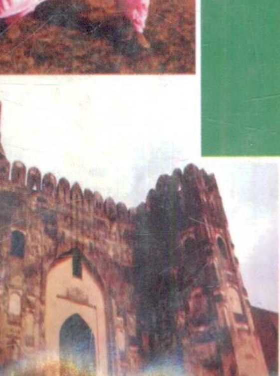

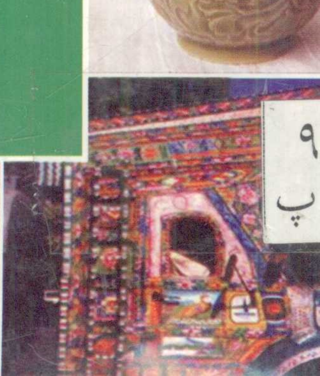

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

پاکستان

معاشرہ اور ثقافت

مؤلف: سٹینلی میرن

مصنفین:

جان ایرڈ .... جان جے ہونگمن
ڈینس برناٹ .... میری جین کینیڈی
لوسین برناٹ .... جیمز ڈبلیو۔ سپین
زکیہ ایگلر .... ہربرٹ ایچ ۔ وریلنڈ

مترجم: غلام رسول مہر
عبدالمجید سالک

www.KitaboSunnat.com

تخلیقات

تخلیقات: علی پلازہ، 3- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-7238014
E-mail: takhleeqat@yahoo.com
Web Site: http://www.takhleeqat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

PAKISTAN : SOCIETY AND CULTURE

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : تخلیقات، لاہور

زیر اہتمام : لیاقت علی

ترجمہ : غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک

ٹائٹل : ریاظ

پروف ریڈنگ : پروین سجل

کمپوزنگ : آزاد کمپوزنگ سنٹر:7598311

پرنٹر : علی فرید پرنٹرز، لاہور

ضخامت : 224 صفحات

تاریخ اشاعت : 2006ء

قیمت : -/150 روپے

مکتبہ رحمانیہ
... ماڈل ٹاؤن۔لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

... دیباچہ از ناشر 5
... پیش لفظ 7
... کوائف مصنفین 8
... دیباچہ 10

تمہید

.. جغرافیہ آب و ہوا اور آبادی 13
.. آب و ہوا 15
.. آبادی 16

پہلا باب

.. بنگالیوں کی شہری نشو و نما اور دیہاتی زندگی 19
.. پس منظر 20
.. ایک خاص معاملے کا مطالعہ 30
.. نتیجہ 58

دوسرا باب

.. چاٹگام کے پہاڑی قبیلے ... 61
.. باشندے 63
.. کھیتی باڑی 69
.. اقتصادی نشو و ارتقا 72
.. دیہاتی زندگی 73
.. نتیجہ 82

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

- پنجاب کی دیہاتی زندگی.... 83
- گاؤں کی کیفیت.......... 84
- نتیجہ 110

چوتھا باب

- پنجاب کا شہری معاشرہ..... 111

پانچواں باب

- وادیِ پشاور کے پٹھان..... 140
- پٹھان معاشرہ............ 155
- منقظم علاقے کا دیہاتی معاشرہ 164
- ایک پٹھان گاؤں.......... 172

چھٹا باب

- قبائلی علاقے کے پٹھان... 181
- قبائلی علاقے کے انتظامات 182
- باشندے 184
- مجلسی تنظیم............... 187
- ملا 188
- جرگہ...................... 189
- لشکر...................... 191
- پختون ولی اور رواج...... 192
- عورتیں 195
- دلیش.................... 196
- مذہب 197
- فنون..................... 198
- ادبیات.................. 199
- قبیلوں کے باہمی تعلقات.. 200
- اقتصادی مسئلہ 201
- پختون اور بیرونی دنیا..... 203

ساتواں باب

- مغربی پاکستان میں عورت. 205
- عورت کے متعلق تصور..... 207
- پردہ...................... 209
- کارہائے منصبی.......... 212
- قانونی حقوق.............. 219
- رسم و رواج.............. 222
- ثقافتی تعلقات.............. 223

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ از ناشر

''ادارہ'' ہیومن ریلیشنز فائیلز کا مقصد یہ ہے کہ یہ ان علوم میں' جو انسان سے متعلق ہیں' تحقیق اور تقابلی مطالعے کی سہولتیں بہم پہنچائے اور اس طرح اقوامِ عالم کی باہمی مفاہمت کو تقویت حاصل ہو اور ان کے طریقہ ہائے بود و باش' مسائل' اقدار اور افکار سمجھنے میں مدد ملے۔ اس کتاب کا مقصد بھی یہی ہے۔

تحقیق میں مزید اعانت کے لیے ادارہ کی مسلیں سولہ یونیورسٹیوں (جن کی فہرست درج ذیل ہے اور اس کے دفتر واقع واشنگٹن میں موجود رہتی ہیں اور ان سے محققین استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان میں متعدد خطوں اور قوموں کے متعلق غور و خوض سے انتخاب کیا ہوا ماخذی مواد شامل ہے جس کی آؤٹ لائن آف کلچرل میٹی رئیلز (1950ء) کے مطابق تلخیص اور درجہ بندی کی گئی ہے۔ ان کے استعمال کا طریقہ گائیڈ ٹو دی یوز آف دی فائیلز (1956ء) میں' جو ہر مسل کا ضمیمہ ہے' بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آؤٹ لائن'' کی فہرست مضامین اس کتاب میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ مسلیں ان یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔

یونیورسٹی آف شکاگو	یونیورسٹی آف کالوریڈو	کارنیل یونیورسٹی
ہارورڈ یونیورسٹی	یونیورسٹی آف ہوائی	انڈیانا یونیورسٹی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سٹیٹ یونیورسٹی آف آیووا	یونیورسٹی آف مشی گن	یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا
یونیورسٹی آف اوکلاہوما	یونیورسٹی آف پنسلوینیا	پرنسٹن یونیورسٹی
یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا	یونیورسٹی آف اوٹا	یونیورسٹی آف واشنگٹن
ژیل یونیورسٹی		

چونکہ ادارۂ ہیومن ریلیشنز فائیلز کو تحقیقی مواد میں اضافہ اور اس کی اصلاح ہمیشہ مطلوب رہتی ہے' اس لیے پیشِ نظر کتاب کے متعلق تنقیدی آرا شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

اس کتاب کی تیاری کے آخری مراحل میں نگرانی کے لیے ہم مندرجہ ذیل اشخاص کے ممنون ہیں۔

میوریئل بی۔لیشٹر (ایڈیٹر) مائیکل لزنا (فنی ناظم اور ڈیزائنر) اور رابرٹ ای-راجرز (سیکرٹری)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

یہ کتاب اس تحقیقی منصوبے کا نتیجہ ہے جو یونیورسٹی آف کیلیفورنیا نے نیو ہیون (امریکہ) کے ادارے بنام ہیومن ریلیشنز ایریا فائیلز کی طرف سے اختیار کیا۔ اس منصوبے کے صدر ڈاکٹر جان ایچ کورتھے جو اپنی اصل اسامی (یونیورسٹی آف میری لینڈ) میں ناظم تحقیق (تجارتی و معاشی) سے رخصت پر تھے۔ نگران کمیٹی کے سربراہ یونیورسٹی آف کیلیفونیا کے ناظم روابط بین الاقوامی، ڈاکٹر ٹامس سی۔ بلیز ڈیل جونیئر تھے۔ میں ان دونوں کی سرگرم تائید اور تعاون کا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے دو پروفیسروں، الزبتھ کے باوئر اور رچرڈ۔ ایل پارک کا بھی تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے کیونکہ انہوں نے اس کتاب کے عمدہ نقشے تیار کرنے میں ایزہاس کی مدد اور حوصلہ افزائی کی۔

نیوہیون کینکٹیکٹ
اپریل 1957ء

ایس۔ایم
نیوہیون کینکٹیکٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوائفِ مصنفین

جان ایرڈ' ماہر عمرانیات۔ یونیسکو مشن کے کارکن کی حیثیت سے ایک برس 1952-1953ء تک مشرقی پاکستان میں رہے اور اس دوران میں اپنے باب کے لیے مواد فراہم کیا۔ ترکیہ کی متعلمۂ انسانیات زکیہ ایگلر کا باب اس مواد پر مبنی ہے جو انہوں نے مغربی پاکستان' بالخصوص پنجاب کے دیہاتوں میں' چھ سال (1949-1955ء) کے عرصے میں جمع کیا۔ انہیں اپنی تحقیق کے لیے اِن اداروں سے وظیفے ملے۔ سوشل سائنس ریسرچ کونسل' وینیر گرین فاؤنڈیشن اور انسٹی ٹیوٹ فار انٹر کلچرل سٹڈیز۔ ڈینس اور لوسین برناٹ نے اپنا باب ان معلومات کی بنا پر تحریر کیا ہے جو انہوں نے 1951-52ء کے دوران میں چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں جمع کیں' جہاں وہ پیرس کے نیشنل فنڈ فار سائنٹفک ریسرچ کی طرف سے گئی تھیں۔ ان کے منصوبے کے دو پہلو تھے۔ لوسین برناٹ کے ذمے انسانیاتی مواد تھا اور ڈینس برناٹ کے ذمے لسانیاتی تحقیق تھی۔

جیمز ڈبلیو- سپین' ماہر سیاسیات کراچی کے امریکی سفارت خانے میں 1951ء سے 1953ء تک ثقافتی امور کے افسر تھے' انہوں نے پاکستان بھر میں دورے کیے۔

میری جین کینیڈی' ماہر انسانیات۔ انہوں نے 1955ء اور 1956ء کے دوران میں مغربی پاکستان (زیادہ تر لاہور) کی شہری زندگی کا مطالعہ کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہربرٹ - ایچ - وریلینڈ (سوم) ماہر انسانیات۔ انہوں نے 1953ء سے 1954ء تک وادی پشاور کی دیہاتی زندگی کا مطالعہ کیا جس کے لیے انہیں سوشل سائنس ریسرچ کونسل سے عطیہ ملا۔

جان جے۔ ہونگمن، ماہر انسانیات۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے تین دیہات میں کام کیا اور پاکستان کے متعلق ان کی تحقیق اور تصنیف اب تک جاری ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ

موجودہ دور کا ایک عجیب وغریب خاصہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد مگر متوازی تحریکیں چل رہی ہیں۔ ایک طرف مشرق و مغرب یعنی اشتمالیت اور سرمایہ داری کی آویزش ہے جو خوفناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ایک معاشرتی نظام دوسرے پر پورا غلبہ حاصل کرنے کے درپے ہے اور حصولِ مقصد کے لیے خطرناک سے خطرناک حربے اختیار کرنا جائز سمجھتا ہے۔ ابھی تک تو یہ کشمکش اعصابی جنگ کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے لیکن اس کا کسی وقت بھی اسلحی جنگ میں تبدیل ہو جانا ممکن ہے۔ ایسی جنگ کے نتائج کے خیال ہی سے دل دہلتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ تہذیبِ انسانی ہی نیست و نابود ہو جائے۔

دوسری طرف بین الاقوامی مفاہمت اور مواخات کی تحریک جاری ہے۔ زیادہ موَثر اور سریع ذرائع آمد ورفت اور مواصلات کے نتیجے میں فاصلے کم ہو کر کالعدم ہو گئے ہیں۔ ہوائی سفر کی بدولت پاکستان اور انگلستان یا امریکہ میں کوئی بُعد نہیں رہا۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ہمارے کسی ہم وطن کا انگلستان جانا تاریخی واقعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب ہزاروں پاکستانی ان ملکوں میں جاتے ہیں جو دُور دَراز ہوا کرتے تھے۔ اس آپس کے میل ملاپ سے دوسری قوموں کے عادات واطوار سمجھنے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش قدرتی طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ اقوامِ متحدہ کا نظام اسی خواہش کا ایک شان دار نتیجہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیرِ نظر کتاب سے بھی یہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ چند امریکی مصنفوں نے' جو اپنے اپنے میدان میں ماہر ہیں' پاکستان کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات اور تاثرات کو کتابی صورت میں قلم بند کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اہلِ امریکہ کو بالخصوص اور انگریزی خواں قوموں کو بالعموم پاکستان سے روشناس کرایا جائے۔

اس میں تو کلام نہیں کہ پاکستان کو بیرونی ممالک میں جتنی بھی شہرت حاصل ہو مفید ہے' لیکن ممکن ہے کسی کے دل میں خیال پیدا ہو کہ ایسی کتاب کا اُردو ترجمہ پاکستان میں شائع کرنا کیوں ضروری ہے؟

اپنے قومی اوصاف کے متعلق رائے قائم کرنا دو وجہ سے مشکل ہوتا ہے۔ اول اپنے جذبات اور تعصبات سے بالاتر ہونا آسان نہیں۔ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے وطن عزیز میں خوبیاں ہی خوبیاں دیکھتے ہیں اور اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ دوم پاکستان اتنا بڑا ملک ہے اور ہماری قوم اتنے مختلف خطوں میں پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا عمومی جائزہ لینا عوام کے لیے ناممکن ہے۔ مغربی پاکستان میں لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد ایسے ہوں گے جنہیں مشرقی پاکستان کا براہِ راست کوئی علم نہیں۔ پاکستان کے دو بازو تو پھر بھی جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں' لیکن کتنے سندھی ہیں جو پٹھانوں سے واقف ہیں؟ کتنے پٹھان ہیں جو بلوچوں کو جانتے ہیں؟ کتنے بلوچ ہیں جو پنجابیوں کو سمجھتے ہیں؟ کتنے شہری ہیں جو دیہاتیوں کی طرز بود و باش سے باخبر ہیں؟ چنانچہ اگر کوئی شخص' ملکی ہو یا غیر ملکی' پاکستان اور پاکستانیوں کا مطالعہ کرنے کی غرض سے نکلے اور کاوش و تجسس سے اپنے تاثرات پیش کرے تو ہم پاکستانیوں کو اس کا ممنون ہونا چاہیے اور اس کے مشاہدات کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بارے میں غیر ملکی مبصر ملکی مبصر سے بہتر ہو گا کیونکہ اس کے لیے غیر جانبدار ہونا مقابلتاً آسان ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس کا ہر باب ایک مختلف غیر ملکی مصنف کے قلم سے ہے اور ہر مصنف نے پاکستان کے کسی ایک پہلو کو منصفانہ نظر سے دیکھا ہے۔ نتیجہ نہایت مفید اور معلومات افزا ہے۔ طرزِ تحریر بحیثیت مجموعی محاکاتی اور واضح ہے۔ کیوں نہ ہو' ہر مصنف نے اپنے منتخب کردہ علاقے میں رہ کر علاقائی معاشرے کا براہِ راست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالعہ کیا ہے اور اس کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی انہی علاقوں میں رہتے ہوئے تصور کرتے ہیں۔ ہم مغربی پاکستانیوں کے لیے کتاب کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ ہمیں نہ صرف مشرقی پاکستان بلکہ مغربی پاکستان کے مختلف خطوں کا بھی حقیقی حال معلوم ہو جاتا ہے جس سے باہمی مفاہمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کئی نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کئی غلط فہمیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ہمیں بہتر پاکستانی بننے میں مدد دے سکتی ہے۔

ہمارے نقطۂ نظر سے اس کتاب میں ایک کوتاہی ضرور ہے۔ یعنی سندھیوں اور بلوچوں پر کوئی باب نہیں۔ تاہم' یہ بہت غنیمت ہے کہ پاکستان کے بیشتر علاقوں کا محققانہ' غیر جانبدارانہ اور ماہرانہ جائزہ میسر ہو گیا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ کسی غیر ملکی کی جانب سے پاکستان کے بارے میں اظہارِ رائے کے متعلق یہ بات تو یقینی ہوتی ہے کہ وہ غیر جانبدارانہ ہوگا لیکن ایک قباحت ضرور ہوتی ہے کہ اکثر غیر ملکی ہمارے ملک کی بعض باتوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ تاہم یہ کتاب ہمارے لیے مفید ہے۔

پروفیسر عبدالواحد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمہید

جغرافیہ' آب وہوا اور آبادی

پاکستان دنیا میں واحد ملک ہے جس کے دو علیحدہ علیحدہ حصے ہیں اور ان میں کوئی ایک ہزار میل کا غیر ملکی علاقہ حائل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الاسکا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے' لیکن ان دونوں کے مسائل بالکل مختلف ہیں' ان میں کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا۔[1]

مشرقی پاکستان ایک ڈیلٹائی علاقہ ہے' جو عرض بلد 20 درجہ 45 دقیقہ شمال اور 26 درجہ 30 دقیقہ شمال کے درمیان اور طول بلد 88 درجہ مشرق اور 92 درجہ 30 دقیقہ مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مغرب اور شمال اور مشرق میں ہندوستانی صوبے یعنی مغربی بنگال اور آسام واقع ہیں اور ایک چھوٹی سی سرحد انتہائی جنوب مشرق میں برما

---

[1] بعض غیر ملکیوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں میں تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے لیکن جیسا زیر مطالعہ مضمون کے راقم نے لکھا ہے امریکا اور الاسکا بھی ایک دوسرے سے کافی دور ہیں اور جزیرہ ہوائی تو' جو امریکا کی پچاسویں ریاست ہے' امریکا کے مغربی ساحل سے تقریباً دو ہزار چار سو میل دور ہے۔ اگر وہ جغرافی فصل باعثِ تعجب نہیں تو یہ فصل باعث تعجب کیوں ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ جنوبی سرحد ایک ساحل ہے جو خلیج بنگال کا ساحل ہے' ایشیا کے دو سب سے بڑے دریا گنگا اور برہم پترا مشرقی پاکستان میں سے بہتے ہیں۔ یہ دونوں مل کر پدما بن جاتے ہیں اور پھر خلیج بنگالہ میں جا گرتے ہیں۔ دریائے سرما آسام کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے' میگھنا کے نام سے مشرقی پاکستان میں بہتا ہے اور آخر پدما سے جا ملتا ہے' ایک اور اہم دریا کرنافلی ہے جو چاٹگام کے پہاڑی خطوں کو کاٹتا ہوا گزرتا ہے اور پھر بندرگاہ کے نزدیک خلیج بنگالہ میں جا گرتا ہے۔ ان بڑے بڑے دریاؤں کے ساتھ بہت سے معاون اور بہت سی نہریں ہیں' جن کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں اکثر سیلاب آتے رہتے ہیں اور یہ ایک زرخیز اور سیر حاصل میدان بن جاتا ہے۔ کل رقبہ 54501 مربع میل ہے۔

مغربی پاکستان عرض بلد 24 درجہ شمال اور 37 درجہ شمال کے درمیان اور طول بلد 61 درجہ مشرق اور 75 درجہ مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کی سرزمین کی ہیئت متنوع ہے اس کے مغرب اور شمال مغرب میں ایران و افغانستان واقع ہیں اور جنوب اور جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب لہریں لے رہا ہے۔ مشرق میں ہندوستان کے صوبے بمبئی راجستھان اور پنجاب ہیں اور شمال مشرق میں جموں و کشمیر کی متنازع فیہ ریاست ہے' اس میں تین بڑے بڑے جغرافیائی علاقے نمایاں ہیں۔ پہلا علاقہ تو اس سلسلۂ کہسار پر مشتمل ہے جس میں قراقرم اور ہمالیہ کے سلسلے شامل ہیں اور جن کی چوٹیاں 28250 اور 25263 فٹ بلند ہیں۔ چین' افغانستان اور ایران کو جانے والے بری تجارتی راستے انہی پہاڑوں کے دَروں سے گزرتے ہیں۔ دوسرا علاقہ ایک بنجر میدان ہے جو دامنِ کوہ کی چھوٹی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے اور تیسرا علاقہ سندھ کا میدان ہے جسے دریائے سندھ بخوبی سیراب کرتا ہے۔ یہ ایک اہم زرعی علاقہ ہے اور اس کی آبادی گنجان ہے' دریائے سندھ کے چار بڑے بڑے معاون مغربی پاکستان میں ہیں۔ جہلم' چناب' راوی اور ستلج' یہ ہمالیہ سے نکل کر سندھ میں جا ملتے ہیں اور پھر سندھ بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے۔ مغربی پاکستان کا کل رقبہ 210236 مربع میل ہے۔ مغربی پاکستان میں سابق وفاقی دارالحکومت کراچی کا رقبہ بھی شامل ہے جسے کسی قدر خودمختار حیثیت حاصل ہے۔ کراچی مغربی پاکستان کے ساحل پر ایک آزاد بندرگاہ گوادر بھی تھی جو عمان کی عرب ریاست کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیرِ انتظام تھی‘ لیکن حال ہی میں یہ بندرگاہ پاکستان کو مل گئی ہے۔

مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ چاٹگام ہے۔ چند جہاز چالنا کی لنگر گاہ پر بھی آتے جاتے ہیں۔

آب وہوا

سال کے بیشتر حصے ہیں‘ یعنی مارچ کے آغاز سے اکتوبر تک‘ مشرقی پاکستان کی آب وہوا منطقۂ حارہ سے کچھ کم ہوتی ہے۔ یعنی درجۂ حرارت خاصا اونچا اور ہوا میں نمی بھی کافی۔ مون سون عام طور پر جون میں شروع ہوتی ہے اور تقریباً چار مہینے رہتی ہے جس میں موسلا دھار بارش ضرور ہوتی ہے۔ نومبر سے فروری تک آب وہوا نہایت خوشگوار‘ رطوبت کم اور بارش مفقود رہتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بحیثیت مجموعی اوسط بارش سالانہ 80 انچ سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے اور دنیا بھر میں زیادہ سے زیادہ بارش کے اعتبار سے اس کا علاقہ صرف آسام سے دوسرے درجے پر ہے۔ پہاڑ اور سمندر کے متصل خطوں میں بارش 140 انچ سالانہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اوسطاً درجۂ حرارت (سردی کے مہینے میں) 64 فارن ہائٹ اور (گرمی کے مہینے میں) 83 فارن ہائٹ کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

مغربی پاکستان کی امتیازی خصوصیت خشکی ہے۔ اس میں سندھ کے ساحلی خطے کے سوا باقی تمام علاقوں میں درجۂ حرارت زیادہ بلند رہتا ہے۔ گرمی کے مہینوں میں مغربی پاکستان کے میدان دنیا کے گرم ترین علاقے ہوتے ہیں لیکن موسم سرما میں درجۂ حرارت انجماد سے بھی گر جاتا ہے۔ جنوری اور فروری سرد ترین مہینے ہوتے ہیں۔ راتوں کو انجماد تک سردی پڑتی ہے لیکن دن کے وقت درجۂ حرارت 75 فارن ہائٹ بلکہ اس سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ موسم گرما کے مہینے جو مارچ سے شروع ہوتے ہیں‘ گرم وخشک ہوتے ہیں اور دن کے وقت درجۂ حرارت 90 فارن ہائیٹ اور 120 فارن ہائیٹ کے درمیان رہتا ہے۔ البتہ راتیں مون سون کے زمانے تک عام طور پر ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ بارش کم ہوتی ہے اور کھیتی باڑی کا انحصار زیادہ تر آبیاری پر ہے۔ پنجاب اور سندھ کے خطوں میں نہروں کا جال بچھا ہوا ہے جس کے ذریعے بڑے دریاؤں سے پانی لیا جاتا ہے۔ صوبے کے شمالی اور مغربی حصوں میں بارش کی اوسط 2 سے 8 انچ تک ہے لیکن پورے پنجاب میں سالانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارش تقریباً 10 انچ سے 14 انچ تک ہوتی ہے۔

آبادی

پاکستان کی آبادی 1951ء کی مردم شماری کے وقت 72842000 تھی۔ منصوبہ بندی کے بورڈ کے تخمینوں کے مطابق 1956ء میں آبادی غالباً 83440000 تک اور 1960ء میں 88420000 تک پہنچ گئی ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ آبادی کی اکثریت مشرقی پاکستان کے تنگ کوتاہ علاقے میں جمع ہے اور مغربی پاکستان میں بڑے بڑے رقبے تقریباً غیر آباد پڑے ہیں۔ آبادی کی کثرت کا یہ حال ہے کہ مشرقی پاکستان کی بعض تحصیلوں میں تو دو ہزار افراد فی مربع میل آباد ہیں اور مغربی پاکستان میں بلوچستان دالبندین کی آبادی صرف ایک کس فی مربع میل پر مشتمل ہے۔ 1957ء کے لیے آبادی کی گنجانی کا تخمینہ مشرقی پاکستان میں 850 افراد فی مربع میل اور مغربی پاکستان میں 120 افراد فی مربع میل لگایا گیا ہے۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں آبادی گنجان ہونے کے باوجود 1951ء میں صرف چار شہری مرکز تھے جن میں پچاس ہزار سے زیادہ باشندے آباد تھے۔ اس کے مقابلے میں اسی سال مغربی پاکستان کے کم وبیش کم گنجان علاقے میں پچاس ہزار یا اس سے زیادہ آبادی کے چودہ شہری مرکز موجود تھے اور کراچی ان کے علاوہ تھا۔

بحیثیت مجموعی نوے فیصد آبادی دیہاتی ہے۔ صنعت کاری کے پروگرام نے شہروں کی آبادی کو بڑھانا شروع کر دیا ہے لیکن شہری مرکزوں کی طرف آبادی کی حرکت عام نشوونما کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مکانات کی کمی ہے۔ حکومتِ پاکستان اس مسئلے پر بے حد توجہ صرف کر رہی ہے اور مکان بنانے کے متعدد بڑے بڑے منصوبے زیر عمل ہیں جن میں سرکاری ملازمین کے لیے مکانات کی تعمیر بھی شامل ہے۔ چونکہ ضروری ساز وسامان کی کمی ہے اور اچھے ہنرمند معماروں کی بھی قلت ہے اس لیے یہ مسئلہ آئندہ بڑی مدت تک پریشانی کا موجب رہے گا۔ مغربی پاکستان میں پناہ گیروں کی بڑی بڑی بستیاں ازمنۂ قدیم کی سی جھونپڑیوں پر مشتمل ہیں' جو سیاسی اعتبار سے ہمیشہ مشتعل کن ثابت ہوتی ہیں۔ ان مہاجروں کے لیے مکانات کی ''کالونیاں'' بنانے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوششیں کی جارہی ہیں۔لیکن اب تک ان کوششوں میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔[1]

آبادی کی موجودہ حرکت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ زیادہ تر شہری مرکزوں میں آباد ہونے کا رجحان رکھتے ہیں۔کالجوں اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ اپنے دیہاتی علاقوں میں واپس جانے سے بے حد گھبراتے ہیں۔وہ اکثر شہروں میں رہنے کے لیے کلرکی کی نوکری کر لیتے ہیں لیکن اپنے دیہاتی گھروں کو واپس نہیں جاتے۔اگر یہی رجحان جاری رہا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقامی حکومتِ خود اختیاری اور صوبائی اور قومی سطح پر سیاسی نمائندگی کے نظام پر اس کا نہایت مضر اثر پڑے گا۔اگر ذہنی سرگرمیوں کو شہروں اور بڑے قصبوں تک محدود کرنے رجحان جاری رہا تو اس سے شہری اشراف وخواص اور دیہاتی عوام کے درمیان فاصلہ زیادہ وسیع ہو جائے گا۔خصوصاً مشرقی پاکستان میں جہاں محدود شہری ترقی کی وجہ سے ان کے درمیان امتیاز ابھی تک غیر واضح ہے۔

ایک اور رجحان مشرقی پاکستان میں یہ ہے کہ وہاں صنعت کاری کو کسی مرکز پر جمع کرنے کے بجائے منتشر کیا جارہا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ شہر حد سے زیادہ پھیلنے نہ پائیں۔غالب خیال یہ ہے کہ شہری ثقافت زمانۂ ماضی کی طرح آئندہ بھی زیادہ تر مغربی پاکستان ہی میں نشوونما حاصل کرے گی۔

آبادی کے اجزا بھی نہایت غیر مساوی اور غیر ہموار ہیں مثلاً مغربی پاکستان تو سارے کا سارا تقریباً مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے' لیکن مشرقی پاکستان میں کوئی ایک چوتھائی آبادی ہندو ہے۔اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں تقریباً ہر شخص بنگالی ہے لیکن مغربی پاکستان پنجابیوں' پٹھانوں' بلوچوں' سندھیوں اور بعض دوسرے نسلی گروہوں کا مجموعہ ہے اور اس کی وجہ سے ایک ایسا غیر واضح سا معاشرتی نظام وجود میں آجاتا ہے جس میں نسلی' ثقافتی اور مذہبی وفاداریاں بعض اوقات متصادم ہو جاتی ہیں۔پاکستان کے حصول کی تحریک میں چونکہ مذہبی بندھنوں اور سیاسی واقتصادی مقاصد کے تقاضے ایک ہو گئے تھے اس لیے مسلمانوں میں بے انتہا مستحکم اتحاد پیدا ہو گیا تھا لیکن بعد میں جو کشیدگیاں رونما

---

[1] یہ کتاب 1957ء میں لکھی گئی تھی۔اب مہاجرین کا مسئلہ حل ہو چکا ہے اور حالات اس وقت کے مقابلے میں بالکل مختلف ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئیں ان کی وجہ سے ایک صوبے میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان اور دوسرے میں پنجابیوں اور غیر پنجابیوں کے درمیان اختلافات بڑھ گئے جب کبھی دونوں وفاداریوں پر حد سے زیادہ بوجھ پڑ جاتا ہے اور بعض مخصوص مفادات کے گرد گروہوں کی ساخت کو قومی یا کمزور کرنے کے لیے مذہبی اور سیاسی مسائل میں عام الجھن اور افراتفری پیدا ہو جاتی ہے تو افراد تعمیری فکر کے بجائے تشویش اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں آج کل جو جذباتی فضا طاری ہے وہ غالباً اسی بنیادی افراتفری کا نتیجہ ہے۔[1]

○●○●○

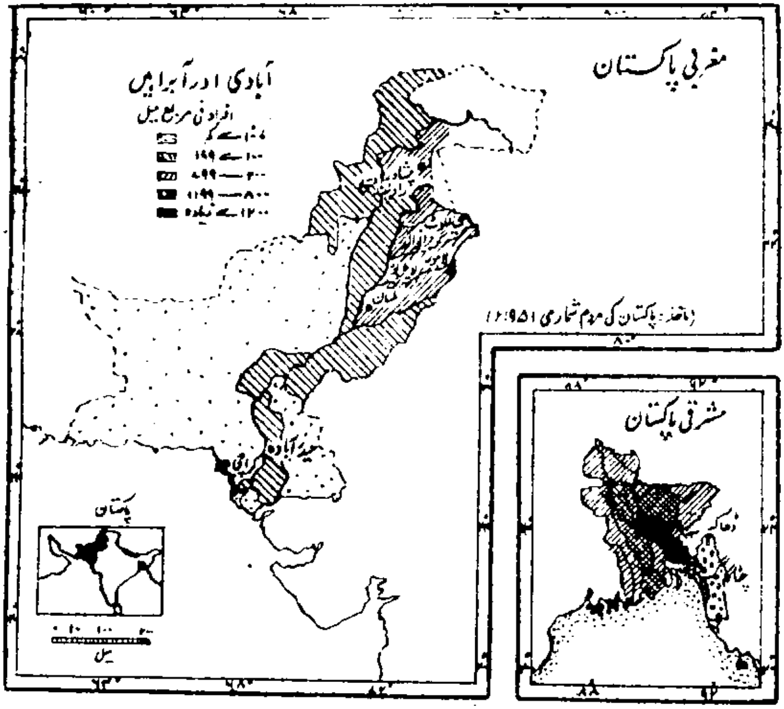

پاکستان کی آبادی اور آب راہیں

[1] یہ اس وقت کی بات ہے جب آئے دن کرسی وزارت پر ایک نہ ایک نئی صورت جلوہ افروز نظر آتی تھی۔ اب معاشرے میں وہ بحران اور افراتفری نہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1

بنگالیوں کی شہری نشو ونما اور دیہاتی زندگی

(جان ایرڈ)

اگر چہ شہری نشو ونما کا علم المعیشت دنیا بھر میں تقریباً یکساں ہے لیکن ایشیا اور مغرب کے اُن کوائف میں جو شہر بندی کے محرک ہوتے ہیں تین اہم فرق نظر آتے ہیں۔ اول شہری صنعتی نظام جو مغربی ثقافت سے نمودار ہوا اور ایشیا میں مقامی زرعی ثقافت پر زیادہ تر استعمار کے ذریعے سے عائد ہوا۔ دوم مغرب میں صنعتی شہر بندی تین صدی سے زیادہ مدت پر پھیلی ہوئی ہے جس میں موزونیت اور تسویہ کے لیے کافی وقت ملا لیکن آج کل کے کم ترقی یافتہ ملکوں میں یہ عمل بیرونی سرمائے اور تکنیکی امداد کی وجہ سے تیز تر ہو گیا۔ سوم شہری معاشرتی نظام کی وجہ سے شرحِ اموات کم ہو گئی جس کے بعد بڑھتی ہوئی شرحِ پیدائش سے آبادی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ مغرب میں یہ توسیع کسی قدر چھدری آبادی کے علاقوں میں واقع ہوئی اور بہت کم ترقی یافتہ رقبوں میں پہنچ گئی لیکن اس کے مقابلے میں آج کل کے ایشیائی ممالک میں آغاز ہی گنجان آبادی سے ہوتا ہے اور لوگ کسی خاص نقل مکانی کے روادار نہیں ہوتے۔

یہ فرق اس ضرورت کے متقاضی ہیں کہ کم ترقی یافتہ ملکوں میں صنعت کاری کے معاشرتی محرکات کا روز افزوں مطالعہ کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں ایک محدود رقبے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احوال و کوائف کے ایک پہلو پر گفتگو کی گئی ہے یعنی اس پر کہ مشرقی پاکستان کی دیہاتی زندگی پر شہری نشو ونما کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

پس منظر

شہروں کا عروج وزوال بنگال کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں۔ صوبے کی قدیم ترین تاریخی یادداشتوں میں بعض ایسے تجارتی مرکزوں کا ذکر ملتا ہے جو ایک خوشحال تجارتی سلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ تاجروں اور سیاحوں کی تحریروں میں سنارگاؤں' وکرم پور' ست گاؤں' گوڑ اور راج محل جیسے نام آتے ہیں اور صوبے کی اس زمانے کی ثروت و خوشحالی کی داستانیں ملتی ہیں جب دنیا کے باقی حصوں نے بنگال کو اپنے تجارتی مقاصد کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

تاہم یہ اغلب نہیں کہ زمانہ ماضی کے تجارتی قصبے اس دیہاتی علاقے کے طرز زندگی پر' جو انہیں غذا اور مواد خام مہیا کرتا تھا' کوئی خاص اثر ڈال رہے تھے بلکہ وہ حقیقت میں بہتر قسم کی منڈیاں سی تھیں جو بقیہ حصہ ملک کی پیداواروں کو فروخت کرتی تھیں مگر اپنے کوچہ و بازار میں پیدا ہونے والے ثقافتی رابطے سے چنداں متاثر نہ ہوتی تھیں۔ زمانہ حاضرہ کی اصطلاح میں اس قسم کے قصبے نہ شہری تھے نہ صنعتی۔ لیکن ان میں جن صنعتوں کی پرورش ہوتی تھی ان میں اعلیٰ درجے کی صنعتِ پارچہ بافی بھی شامل تھی' ان کی حقیقت صرف یہ تھی کہ انفرادی کاریگروں کی محنتوں کو یکجا کر دیا جاتا تھا۔ ان کاریگروں نے اپنی حیثیت' اپنی ہنرمندی اور اپنی روایات ورثے میں پائی تھیں اور وہ کسی نئے شہری معاشرتی نظام کے پیشرو نہ تھے۔

زمانہ حال کے بنگال میں شہری و دیہاتی رابطے کی اہمیت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ آج کل صنعتی شہریت اپنی پیچیدہ اور متنوع تقسیم کار کے ساتھ ایک معاشرتی انقلاب کا حکم رکھتی ہے جو اپنے اندر مسلسل بدلتا رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کے اثرات کام کرتے ہیں وہاں روایتی اسالیبِ زندگی کو خلل پذیر کرتا رہتا ہے۔ قدیم تجارتی مرکز میں یہ بات نہ تھی لیکن آج کل کے شہر کو اپنے متصل دیہاتی علاقے کے ساتھ نہایت گہرا رابطہ رکھنے کی ضرورت بھی ہے اور یہ رابطہ اسے حاصل بھی ہو جاتا ہے۔ شہری ترقی کے نتائج لازماً دیہاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رقبے میں نفوذ کر جاتے ہیں اور اس کے پانچ مختلف ذریعے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی کارفرما ہو جاتا ہے:

1- شہر میں جو اقتصادی اور سیاسی فیصلے کیے جاتے ہیں ان کے بالواسطہ اثرات کے ذریعے سے۔

2- دیہاتی رقبوں میں شہری پیداواروں اور اداروں کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے۔

3- جو ''دیہاتی شہری'' لوگ عارضی طور پر نقل مکانی کرتے ہیں ان کو شہری ملازمتیں مل جاتی ہیں۔

4- شہر کے قریبی دیہات سے آ کر مزدور اور کارکن شہر کے اندر کام پر لگ جاتے ہیں۔

5- آس پاس کے دیہاتی رقبوں کی توسیع کی وجہ سے۔

جب تک نمونے کے دیہاتی رقبوں کا وسیع ہنگامی تجزیہ نہ کیا جائے شہری ترقی کے بالواسطہ اثرات کا سراغ لگانا دشوار ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کا کام ابھی باقی ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ شہری واقعات دیہات کی نقد آور فصلوں کے نرخ اور بازار کی قیمتِ خرید پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ چونکہ شہر کا تعلق دنیا کی منڈیوں سے ہوتا ہے اور اسے انہیں کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دیہاتی کو ہر سال مالیات قومی اقتصادی حکمت عملی اور عالمی تجارت کے نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قوتیں کیا ہیں جو اس کی تقدیر کی تشکیل کر رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے اس بے خبری اور ناواقفیت کی حالت میں دیہاتی کسی نہایت غیر موزوں موسم میں پٹ سن پر اپنا زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگا دے یا ایک ایسے زمانے میں چاول کی کاشت بڑھنے ہی نہ دے جب دنیا کی صورتِ حال برآمدی فصل کے لیے نہایت اُمید افزا ہو۔ اگر پٹ سن کا بورڈ اسے پیداوار کم کر دینے کا مشورہ دے یا حکومت اسے مزید غذا پیدا کرنے کی ترغیب دے' کیونکہ قومی پروگرام کا تقاضا یہی ہو' تو وہ سرِ تسلیم خم تو کر دے گا لیکن چونکہ اصل مصلحت اس کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ لہٰذا اس کی اطاعت اور شرکت مجبوراً اور ناراضامندانہ ہی ہوگی۔ اگر زمانہ خراب آ جائے اور پورا زرعی اقتصاد ہی برباد ہو جائے تو وہ اس آفتِ عظمیٰ کو خاموشی سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برداشت کر لے گا اور اس تحمل و برداشت کے لیے بنگالی کسان ہمیشہ ہی سے مشہور ہے۔

بہر حال بڑے بڑے تباہ کن قحط پے در پے آئے۔ سیاسی جبر و تشدد یا عطایا کے کئی نشیب و فراز بھی واقع ہوئے لیکن دیہاتی آدمی کے طرزِ زندگی میں کوئی گہرا تغیر پیدا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ پاکستان بن گیا۔ بڑے بڑے بلوے ہوئے' بعض علاقوں سے ہندو بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کی جگہ ہندوستان سے آنے والے مسلمان مہاجروں نے لے لی۔ لیکن کاشت کار کی زندگی پر کوئی مستقل اثر نہ پڑا۔ بجز اس کے کہ گاؤں کی معاشرتی ساخت سے ایک قسم کی رنگارنگی رخصت ہوگئی اور دوسری قسم کی گونا گونی نے اس کی جگہ لے لی۔ کیونکہ دیہاتی کی زندگی کی بنیادی حقیقت اس کی معاش ہے۔ جب تک اس کا ذریعہ معاش غیر متبدل ہے اس کے وجود کی بیخ و بنیاد سلامت ہے۔

گاؤں پر شہری پیداواروں اور اداروں کی حملے کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے گو اس میں بعض لوگ آسانی سے مبالغہ بھی کر لیتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر ان شہری پیداواروں کے متعلق صحیح ہے جو مفصلات کے بازاروں میں پہنچ جاتی ہیں مثلاً جب چھاتے' ہریکین' دیا سلائیاں' بٹن' جوتے' قمیصیں اور بے شمار دوسری اشیائے آسائش دیہات میں پہنچ جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے دیہات کے ہنرمند اور کاریگر بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں تو بلاشبہ شہری اقتصاد کے مقابلے میں دیہاتی کی محتاجی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لباس' حیثیت' سیر و تفریح' کھیل کود میں بھی کسی قدر تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن بہر حال یہ تغیرات چنداں اہمیت نہیں رکھتے اور صرف اوپری ہوتے ہیں۔

ممکن ہے دیہاتی اداروں میں شہری تغیرات کے اثرات زیادہ گہرے ہو جائیں گو بعض اوقات گاؤں بیرونی اثرات کی مزاحمت میں خاص شدت اور قوت کا ثبوت دیتے ہیں۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ بنگال میں 1793ء کے دوامی بندوبست نے مزارعتِ اراضی کے نظام کو بے حد تبدیل کر دیا تھا اور آئندہ ڈیڑھ سو سال کے لیے صوبے کی معاشرتی ساخت تک بدل کر رہ گئی تھی۔ لیکن پچھلے دنوں جب روشنی اور صفائی' زرعی طور طریقوں اور تعلیمی اصلاحات کو دیہات سدھار تحریک کا لازمی جزو قرار دیا گیا تو تغیرات کی تمام تر کوششیں صرف کاغذ ہی تک محدود رہ گئیں' جامۂ عمل نہ پہن سکیں۔ اکثر یہی ہوا کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب بیرونی لوگ' جو دیہات میں رہنمائی کے منصوبوں کا سروسامان کر رہے تھے' دیہات کو چھوڑ کر شہروں کو واپس چلے گئے تو وہ ''رہنمائی'' کے منصوبے بھی اپنے راستے سے منحرف ہو کر رہ گئے۔ اگر یہ بات ان منصوبہ بند ترقیات کے متعلق صحیح ہے جن میں دیہاتی بظاہر حصہ لے رہے ہیں تو ان ترقیات کے متعلق صحیح تر ہے جن کو وہ رد کر رہے ہیں۔ 1930ء میں شاردا ایکٹ نافذ ہوا جس کا مقصد بچپن کی شادیوں کو محدود کرنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے بنگال میں شیر خوار بچوں کی بے شمار شادیاں ہو گئیں (بلکہ بعض ایسے بچوں کی بھی جو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے) اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقدس دیہاتی روایات پر حملہ آور ہونا کس قدر فضول اور لاحاصل بات ہے۔

جو تغیر اپنے اثرات زیادہ طویل مدت تک جاری رکھ سکے وہ ممکن ہے زرعی زندگی کے جمود پر غالب آ سکے' مثلاً جب ماضی میں امن وانتظام کے قیام کو باقاعدہ طور پر منضبط کر دیا گیا تو بنگال میں اراضی کی قیمت بھی بڑھ گئی اور قتل و جراحت کے امکانات بھی کم ہو گئے۔ انہی امور سے تغیرات کے اس پورے سلسلے کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جو آبادی میں اضافے' زمین کی تقسیم' وراثت اراضی کے فسادات' عائلی ساخت اور بالآخر ملازمت کی روزافزوں نقل مکانی سے پیدا ہوئے۔ بنگال میں نقل و حمل کا جو صوبائی نظام اندرونی آبی گزرگاہوں سے اور اس کے ساتھ ریلوں کا جال بچھ جانے سے نمودار ہوا اور پھر علاقائی سرکاری افسروں اور ضلعی و صوبائی صدر مقاموں کے درمیان رسل و رسائل کا جو سلسلہ جاری ہو گیا' اس کی وجہ سے قحط کے حالات کی اطلاع اور امداد و اعانتِ قحط زدگان میں سہولت پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں قحط پہلے کی نسبت بہت کم پڑنے لگے اور ان کی شدت میں بھی کمی آ گئی۔ شہری حفظانِ صحت کی سہولتوں کی توسیع کے باعث دیہاتی آبادی چند وبائی امراض سے محفوظ ہو گئی اور شرحِ اموات میں کمی کا ایک باعث یہ بھی ہے۔ ایک خاص مدت کے اندر ان تین ترقیات نے مشرقی پاکستان میں (اور باقی جنوبی ایشیا میں بھی) ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا ہے جس کا تصور بھی اس سے قبل نہ کیا جا سکتا تھا اور اس سے دیہی زندگی کا ہر شعبہ تبدیل ہو کر رہے گا۔ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں شہری اداروں کی مجموعی قوت کا اثر بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ صرف شہری گاؤں کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ گاؤں بھی اکثر نہایت واضح طور پر شہر کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف متوجہ ہوتا ہے کیونکہ مزدوروں کی عارضی نقل مکانی ہوتی رہتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں مزدوروں کی نقل مکانی کوئی نئی بات نہیں۔ مدتِ دراز سے یہ معمول چلا آتا ہے کہ غریب اضلاع کے زرعی مزدور فصل کٹائی کے موقع پر زیادہ خوشحال علاقوں میں پہنچ جاتے ہیں اور جب کبھی کوئی بڑی مصیبت نازل ہوتی ہے تو غریب اور نادار لوگ ہمیشہ بڑی تعداد میں قصبوں اور شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ حال میں جب شہر میں ملازمت و مزدوری کے امکانات وسیع ہوئے تو جن دیہاتیوں کے پاس اپنے گھروں میں کافی کام نہ تھا اور جو اپنی تقسیم در تقسیم شدہ موروثی اراضی کو اپنے گزارے کے قابل نہ پاتے تھے ان کو ایک متبادل ذریعۂ آمدنی مل گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیہات کے لوگ بوقتِ ضرورت اسی کو بآسانی اور باقاعدہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دیہاتی کو اپنی اراضی کے ساتھ جو ثقافتی بندھن وابستہ کیے ہوئے ہے، وہ بہت قومی اور جذباتی قسم کا ہے اور اگر وہ غیر یقینی شہری ملازمتوں کی خاطر محدود اور یقینی لیکن ناکافی ملکیتِ اراضی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اس کے لیے وہ موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر اس کے گھر کی صورتِ حال محض گزارے کو مکتفی ہوتی ہے اور وہ مقروض رہتا ہے تو قرض خواہ بھی اس کے فرار کو روکنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اگرچہ شہروں میں اُجرت کا پیمانہ اونچا ہوتا ہے لیکن ماضی میں کارخانہ دار انتہائی کوشش کرتے رہے ہیں کہ دیہاتی رقبوں سے مزدور بھرتی کریں لیکن نقل مکانی کر کے آنے والا مزدور زیادہ دیر تک ٹھہرتا نہیں، وہ اپنے گاؤں اور اپنے رشتہ داروں کی یاد میں اُداس ہو جاتا ہے۔ اس کی غیر حاضری نیز مزدوری کے کام میں ترقی سے ظاہر ہے کہ اس کی وفاداریاں منقسم ہو جاتی ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ سکونت کے اعتبار سے پاکستان کے شہری مرکز دیہات کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ جب کوئی دیہاتی مزدور اور اس کے متعلقین نقل مکانی کر کے شہر میں آتے ہیں تو ان کی حالت بے حد المناک ہوتی ہے اور انہیں شہروں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کی کوٹھڑیوں میں رہنا پڑتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کو شہروں کے آس پاس دیہات میں جگہ مل جائے لیکن وہ بھی بہت ادنیٰ قسم کی ہوتی ہے۔ صفائی مفقود، غلاظت، شوروغل، فقدان، خلوت، غذا اور مکان پر حد سے زیادہ خرچ، جو شہری زندگی کے عام مصائب ہیں، ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے دیہاتی شہروں سے دامن بچانا ہی مناسب سمجھتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان حالات میں اگر دیہاتی اپنے کنبے کو شہر میں لانے میں تامل کرتا ہے تو یہ ہرگز مقام تعجب نہیں۔[1] اگرچہ صحیح تعداد تو معلوم نہیں لیکن شہری رقبوں میں منتقل ہونے والے دیہاتیوں کی کافی تعداد اپنے گاؤں میں اپنی زمین کے قطعات محفوظ رکھتی ہے جن پر ان کے متعلقین رہتے ہیں اور وہ خود بھی ہر چھٹی کے دن مقامی میلوں پر بیماری' موت اور دوسری تقریبات کے بہانے سے اپنے گاؤں کو جاتے رہتے ہیں بعض اپنی زمین کو کاشت بھی کرتے رہتے ہیں اور شہری ملازمت صرف سردی کے موسم میں کرتے ہیں کیونکہ ان دنوں گاؤں میں کھیتی باڑی کا کام نسبتاً کم ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے مشرقی پاکستان کے دیہات کی مختلف موسمی اور روزانہ دلفریبیوں کو دیکھا ہے وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ دیہاتی اپنے گاؤں پر اس قدر فریفتہ کیوں ہیں۔

مگر بالآخر یہ بھی ممکن ہے کہ دیہاتی کے لیے کوئی اور چارۂ کار ہی باقی نہ رہے۔ ہو سکتا ہے وہ شہری ملازمت کے مواقع کی دلفریبی کا شکار نہ ہو لیکن گاؤں کی پیدائش و اموات کے اعداد و شمار ہی اس کو مجبور کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں شہروں کی طرف دیہاتیوں کی نقل مکانی روز افزوں ہو رہی ہے۔ چونکہ یہ رجحان برابر جاری رہے گا اس لیے اشد ضروری ہے کہ اصلاح معاشرت کی تحقیق کا باضابطہ منصوبہ بنایا جائے تاکہ شہر اور گاؤں دونوں پر اس صورتِ حالات کے نتائج کا صحیح اندازہ متعین ہو سکے۔ جب تک یہ نہیں کیا جاتا صرف چند موٹے موٹے نتائج پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مزدوری کے نتائج عملی میں اضافہ ہو جائے گا تو جو شہری صنعتیں

---

[1] مشرقی پاکستان کی معاشرتی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ شہری مرکزوں میں مردوں کا اجتماع بالکل غیر متناسب ہے جیسا کہ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا۔ صوبے میں بحیثیت مجموعی جنسی تناسب ایک ہزار عورتوں کے مقابلے میں 1101 مردوں کا ہے۔ مشرقی پاکستان کے شہری مرکزوں میں جنسی تناسب۔

تمام شہری مرکزوں میں 1507 (مرد بمقابلہ ایک ہزار عورتوں کے)

ڈھاکہ میں 1652 (مرد بمقابلہ ایک ہزار عورتوں کے) شہری مرکز وہ ہے جس میں پانچ

چاٹگام میں 1827 (مرد بمقابلہ ایک ہزار عورتوں کے) ہزار سے زیادہ آبادی ہو۔

ماخذ: مردم شماری پاکستان 1951ء۔ جلد 3 صفحات 62 تا 64۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیہاتی تارکان وطن پر منحصر ہوں گی۔ ان کی قلیل اجرتوں کے باوجود مزدوری کی لاگت نسبتاً بڑھ جائے گی۔ ایسی صورت میں ضرورت سے زیادہ مزدور بھرتی کرنا اور انہیں تنخواہیں دینا ضروری ہوگا تاکہ اگر کسی وقت دفعتہً بہت سے کارکن نوٹس دیئے بغیر غیر حاضر ہو جائیں تو مشینری کا کام بند نہ ہو۔ عارضی اور وقتی مزدور بھرتی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مزدوروں کی مؤثر اور ذمہ دار تنظیم کا موقع کم نکلے گا' مزدوروں کے متعلق قوانین کی تائید و حمایت کم ہوگی' اجرتوں کے متعلق سودا بازی کرنے میں حیثیت کمزور رہے گی' خاص کاموں میں ہنرمندی کے حصول اور ترقی کا احتمال کم ہوگا اور اسی قسم کے دیگر متعلقہ مسائل پیش آئیں گے۔ مالک کارخانہ کے نزدیک یہ تمام نتائج غالباً قابل افسوس نہ ہوں گے لیکن کچھ مدت کے بعد بالآخر مزدوروں کے پست و درماندہ حالات ملک پر ضرور براہِ راست اثر انداز ہوں گے۔ مثلاً اعتمادِ نفس کم ہو جائے گا' کارکردگی میں فرق آ جائے گا' چوری تباہ کاری اور دوسرے آثارِ بے اطمینانی نمودار ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ غیر مطمئن مزدور مقامی صارفین کی منڈی کے نشوونما میں معاون بھی ہوں اور اس کا اثر بالواسطہ مالک پر پڑے۔

اس کے علاوہ ایک بہت بڑی عارضی اور زیادہ تر مرد مزدوروں کی آبادی کا اثر شہر کی معاشرتی زندگی اور اس کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے اور یہ اثر بہت زیادہ اہم ہے۔ جب تک مزدور اپنے دیہاتی بندھنوں کا پابند رہے گا ظاہر ہے کہ وہ اپنی شہر کی کمائی کو شہر میں کم سے کم صرف کرے گا۔ اگرچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ صنعتی ترقی کے منصوبوں کے ذریعے سے شہروں کے معیارِ زیست کو بلند کرنے کی رفتار کسی قدر مدھم ہو جائے گی لیکن اس کے باوجود اس سے دیہاتی رقبوں میں صنعت کاری کے فوائد کی زیادہ منصفانہ تقسیم کا مسئلہ حل کرنے میں مدد ضرور ملے گی۔ جو وفاداریاں دیہاتی کو گاؤں سے وابستہ کیے ہوئے ہیں وہ بلاشبہ اس کو شہری بننے اور شہری زندگی اختیار کرنے سے روکتی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جس مزدور کا کوئی تعلق دیہات سے نہ بھی ہو اس کے لیے بھی چھوٹی برادری سے نکل کر بڑی برادری میں شامل ہونے کا عمل دشواری سے خالی نہ ہوگا' جو شخص دیہات سے نقل مکانی کر کے عارضی طور پر شہر میں آتا ہے وہ شہر کو لٹیروں کی ایک بہت بڑی مقابلہ گاہ سمجھتا ہے جس میں خود اس کا ذاتی بچاؤ بھی خاص اور متعین فوائد پر موقوف ہوتا ہے۔ دیہات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے آنے والا شخص چونکہ مدتِ دراز تک جنسی تسکین سے محروم رہتا ہے اور شہر اور کارخانے کی گوناگوں معاشرتی و اقتصادی محرومیوں اور رکاوٹوں سے بھی متاثر ہوتا ہے' اس لیے ذرا ذرا سے اشتعال پر فوری اور شدید جنگجوئی پر اتر آتا ہے اور نہایت آسانی سے بلوے اور فساد کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ خصوصاً جب امن و انتظام کی طاقتیں موجود نہ ہوں یا مؤثر نظر نہ آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد دیہاتی تارکانِ وطن شہروں میں مستقل طور پر آباد ہو جاتے ہیں اور شہری طور طریقے اختیار کرنے لگتے ہیں لیکن اس انجذاب کی جو معاشرتی اور اقتصادی قیمت شہر کو اور خود تارکانِ وطن کو ادا کرنی پڑتی ہے وہ ایک ایسے نا استوار معاشرے میں' جس کا اقتصاد محدود ہو' بے حد ناگوار بھی ہو سکتی ہے۔

دیہات پر اس قسم کی نقل مکانی کا اثر مساوی تیقن کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بعض حلقوں میں کہا گیا ہے کہ جب گاؤں کا تارکِ وطن شہر سے واپس آتا ہے تو اپنی ظاہر ٹیپ ٹاپ کی وجہ سے پورے دیہاتی علاقے میں شہروں کا سا ذہنی ہیجان پیدا کر دیتا ہے جس سے انفرادیتِ کارکردگی اور اضافیت کے شہری تصورات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے کسی شہر کا عام مزدور ذہنی ہیجان سے بہت ہی کم متاثر ہوتا ہے اور اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دیہات میں واپس آنے کے بعد کارکردگی اور حسن عمل کا پیکر بن جائے گا۔ شاید یہ واپس آنے والا تارکِ وطن صرف سیر و تفریح کی بعض شہری عادات تو دیہات میں لے آئے لیکن اس سے زیادہ کی اس سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب دیہاتی مزدور کی اُجرت کا سرمایہ شہر سے گاؤں میں پہنچ جائے گا تو ممکن ہے کہ دیہاتیوں کا معیارِ زیست کسی قدر بلند ہو جائے لیکن اس کے برعکس بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دیہاتیوں کا گاؤں سے چلے آنا گاؤں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے ان نوجوانوں کے جنہوں نے گاؤں میں تربیت پائی ہے' بہترین سال ضائع ہو جاتے ہیں اور دیہاتی اقتصاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ تاہم بنگال کے دیہات میں عام طور پر دیہاتی کارکنوں کو پورا اور نفع بخش روزگار مہیا نہیں ہو سکتا اور اگر بیکاری و بے شغلی کے طویل موسم میں ایک ''دہن گرسنہ'' کی کمی ہو جائے تو اس سے گاؤں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر تارکِ وطن بالآخر اپنا قطعۂ اراضی فروخت کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے تو اس کی یہ ہجرت گاؤں کے لیے کسی قدر سہولت ہی کا باعث ہوتی ہے' جہاں مقبوضات پہلے قلیل ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دیہاتی تارکِ وطن کا شہر سے رابطہ بہرحال گاؤں کے لیے اقتصادی نفع ہی کا موجب ہوتا ہے۔

جس حالت میں کسی مشترک کنبے کے افراد اتنے زیادہ ہوں کہ اس کی مملوکہ اراضی ان کے لیے مکتفی نہ ہو سکے' تو ان میں سے ایک دو افراد کا شہر میں ملازمت کر لینا بہرحال مفید ہو گا کیونکہ اس سے کنبے کی اراضی بھی محفوظ رہے گی اور کسی قسم کی افراتفری کے بغیر تنظیم بھی قائم رہ سکے گی خواہ زمین اتنی تھوڑی رہ گئی ہو کہ خالص کھیتی باڑی کا کام کنبے کے گزارے کا کفیل نہ ہو سکے۔ دیہات سے شہروں کو جانے والے مزدوروں نے آبادی کے حد سے زیادہ اضافے کی مصیبتوں کا علاج بہرحال کر ہی دیا ہے۔ بلاشبہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے چونکہ شہری روزگار ماضی سے انقطاع کا حکم رکھتا ہے۔ اس لیے ناگوار بھی ہوتا ہے لیکن اس سے جو ضمنی آمدنی ہو جاتی ہے وہ کسی خاص موسم سے وابستہ نہیں ہوتی اور بہتر اقتصادی حالات پیدا کرتی ہے۔

اس قسم کے شہری دیہاتی رابطے کا مجموعی اثر غالباً یہی ہوتا ہے کہ اس سے روایتی زرعی زندگی کا نظام تلپٹ نہیں ہوتا بلکہ محفوظ رہتا ہے۔ پہلے پیدائش و اموات میں نسبتاً ایک استوار سا توازن ہوا کرتا تھا۔ اس میں خلل پڑنے سے بعض معاشرتی نتائج پیدا ہوئے۔ اس رابطے نے ان میں تخفیف پیدا کر دی لیکن بہرحال عارضی تارکِ وطن کا معاملہ اپنی وسعت اور مدت دونوں کے اعتبار سے محدود ہے۔ یہ صرف ایک قلیل المیعاد مصلحت ہے اور دیہاتی زرعی مشاغل اور شہری روزگار یا صنعتی ملازمت کے درمیان ایک عبوری دَور سے تعلق رکھتی ہے۔

دیہاتی شہری رابطے کی پانچ شکلوں میں سے آخری دو شکلیں اس رابطے کی نہایت انتہائی شکلیں ہیں' یعنی متصلہ دیہات کے باشندوں کی شہری ملازمت اور ان رقبوں میں شہری زمینوں کے استعمال کی توسیع جب ان میں سے پہلی شکل سامنے آتی ہے تو گاؤں ایک قسم کا سکونتی نواح بن جاتا ہے۔ دوسری شکل میں تغیر و حرکت کا طوفان برپا ہوتا ہے اور اراضی محصلہ کے سابق بے دخل باشندوں کے لیے کھیتی باڑی ذریعۂ معاش نہیں رہتی۔ اگرچہ اس چکر میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنے والے دیہات کی تعداد نسبتاً قلیل ہے' لیکن پھر بھی وہ شہر بندی کی زبردست قوت سے بے حد پس رہے ہیں۔ گویا یہاں شہری ترقی کی انسانی قیمتیں پوری پوری وصول کی جاتی ہیں۔

جس نمونے کی زمین شہر کے گرداگرد ہوتی ہے' وہ نہ صرف اس قسم کے سکونتی استعمالات سے گہرا تعلق رکھتی ہے جو ایک خاص سمت میں ممکن نہیں' بلکہ ان سکونتی استعمالات سے بھی متعلق ہے جو روزافزوں شہری نشوونما کے دوران میں جاری رہتے ہیں۔ بعض مقامات پر کھارے کی زمین ایک نشیبی سیلابی میدان ہوتا ہے جس پر کاشت کاروں کی جھونپڑیاں بھی مٹی کے بعض ایسے خودساختہ جزیروں پر بنانی پڑتی ہیں جو بارش کے موسم میں پانی سے اونچے رہ سکیں۔ اس قسم کے خطے پر جو کارخانے قائم کیے جاتے ہیں ان میں پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ایسی اونچی زمین تیار کی جائے جس پر مشینری وغیرہ نصب کی جاسکے۔ پھر اس نئی تیار کردہ زمین کی بنیادوں کو بھی بطور خاص مضبوط بنانا ہوتا ہی۔ اگر بہتر محل وقوع میسر نہ ہو یا دریائی حمل ونقل کے تعلقات کی وجہ سے کوئی خاص مقام ضروری ہو۔ (جیسے آدم جی جوٹ ملز دریائے لکھیا پر ہے۔ اس حالت میں کارخانے ان اراضی پر پھیلنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس قسم کی زمینوں پر سکونتی مکانات بھی نہیں بنائے جاسکتے۔ خشک رقبہ محدود ہوتا ہے اور غیر مقامی مزدوروں کو جو شہر کے قریب رہنے کے خواہاں ہوں' اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ مکانات پر زیادہ روپیہ صرف کرسکیں۔

اونچی زمینوں پر سکونتی اور صنعتی مکانات آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قسم کی عمارات کے درمیان اکثر مقابلہ ہوتا رہتا ہے جس میں بالآخر صنعتی مکانات ہی فائدے میں رہتے ہیں۔ اب جوں جوں شہر کی نشوونما میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آس پاس کے دیہاتی رقبوں میں مکانات کی مانگ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چونکہ اونچی زمین پر کھیتی باڑی کی نسبت مکانات کی تعمیر زیادہ مفید وضروری ہوتی ہے' اس لیے کھیتی باڑی کو بہرحال میدان خالی کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ روایات وجذبات اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ جوں جوں شہر مزید پھیلتا جاتا ہے' کارخانے اور عماراتِ عامہ ان رقبوں میں بھی گھستی چلی آتی ہیں جن میں شہری مزدوروں کی بے شمار جھونپڑیاں بن چکی ہوتی ہیں۔ یہاں پھر زمین کا زیادہ شدید استعمال (یعنی مکانات کی تعمیر) کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا فائدہ اقتصادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفاد سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ نہ صرف عماراتِ عامہ بلکہ بہت سے صنعتی کارخانے بھی سرکاری منصوبہ بندی کے ماتحت قائم کیے جاتے ہیں اور انہیں قانونی طور پر یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ مالک کی مرضی سے یا اس کی مرضی کے خلاف بھی زمین پر قبضہ کرلیں۔ زمین کے سکونتی اور صنعتی استعمالات کے لیے ایک ہی قسم کی اراضی کا تقاضا اور رجحان نشو ونما کو حکومت اور کارخانہ دار کے لیے نہایت گراں اور پُر مصارف بنا دیتا ہے کیونکہ انہیں اس زمین کے مالکوں کو تاوان ادا کرنا پڑتا ہے جو مکانات کے نفع مند کام میں لگی ہوتی ہے۔ اس میں مزدوروں کو انسانی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ اکثر نازک اقتصادی حالات کا شکار ہوتے ہیں۔ پھر ان کو بار بار اکھاڑ پچھاڑ کی مصیبت بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس مسئلے کا کوئی آسان حل نہیں۔

ایک خاص معاملے کا مطالعہ

ہم اب شہر کے سرے پر آباد دیہات پر شہری توسیع کے اثر کا پورا پورا مطالعہ کرنے کے لیے بعض معلومات کا تجزیہ کریں گے جو راقم الحروف اور ایک بنگالی رفیق کار[1] نے 1953ء کے موسم بہار میں ڈھاکہ شہر کے دو شمالی مسلم دیہات میں فراہم کیں۔ دونوں گاؤں میں سے قریب تر کفرل ہے جو نزدیک ترین نقطے پر ڈھاکہ سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے اور ڈھاکہ کے زرعی تجرباتی فارم کی اراضی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ دور کا گاؤں سین پارا پار بتا پہلے گاؤں کے شمالی کنارے کے ساتھ ملحق ہے۔ دونوں گاؤں میں خشک اور تر دونوں قسم کی زمین پائی جاتی ہے اور یہی سارے علاقے کی خصوصیت ہے لیکن یہ خطہ عام طور پر اونچا ہے اور کاشت کاری کے سوا دوسرے مقاصد کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دور کے گاؤں کے شمالی حصے میں زمین بہت بلند اور خشک ہونے کی وجہ سے بہترین کاشت کاری کے لیے ناموزوں ہے اور کسی قدر مادھو پور جنگل کے بنجر خطے سے ملتی ہوئی ہے۔

---

[1] میری مراد مسٹر ایم اے سمیع سے ہے جو اس زمانے میں مشرقی بنگال کے زرعی انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے تھے۔ انہیں دیہاتی لوگوں کی ضرورتوں اور مشکلوں کا اس قدر صحیح احساس تھا کہ دیہاتی ان پر پورا اعتماد کرتے تھے اور ان کے ساتھ غیر معمولی تعاون کا ثبوت دیتے تھے۔ اگر سمیع صاحب اور ان کی ہمت شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ معلومات فراہم نہ ہو سکتیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دونوں گاؤں کے درمیان ایک تنگنائے کی شکل کا نشیبی علاقہ ہے جو مشرقی کنارے پر تنگ اور پایاب ہے لیکن بوڑھی گنگا کے ایک معاون تک پہنچتے پہنچتے مغرب میں وسیع اور عمیق ہوتا چلا جاتا ہے۔ بارش کے ایام میں یہ پانی سے بھر جاتا ہے اور دونوں گاؤں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے جسے کسی ذریعے سے بھی پار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی وجہ سے دور کا گاؤں کسی قدر دور دست اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔

سین پارا پاربتا کے اس انقطاع نے اس کو پچھلی دنوں تک ڈھاکہ کے اثر سے کسی قدر محفوظ رکھا ہے اس لیے اگر ان دونوں گاؤں کا مقابلہ کیا جائے تو روز افزوں شہری رابطے کے معاشرتی تغیر کی سمت کا کسی قدر پتا ضرور چل جاتا ہے۔ کفرل کی موجودہ حیثیت کو دیکھ کر اس امر کا سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ جو گاؤں ابھی تک شہر کے خطرناک چنگل میں گرفتار نہیں ہوئے ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

اس امر کے باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ موجودہ مداخلت ان دیہات کی تاریخ میں پہلی مداخلت نہیں۔ کہتے ہیں کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں شائستہ خاں کے ماتحت ڈھاکہ کے عہدِ زریں کے دوران میں شہر دریائے بوڑھی گنگا سے لے کر تونگی تک بڑھتا چلا گیا تھا جو تقریباً چودہ میل شمال کی طرف ایک قصبہ تھا۔ ٹامس پادری کا دعویٰ ہے کہ "اس کے زمانے میں ڈھاکہ کا دائرہ چالیس انگریزی میل سے کم نہ تھا۔" لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس دائرے کا قطر ہر جگہ یکساں ہوگا۔ اغلب یہ ہے کہ ڈھاکہ سے تونگی تک جو توسیع ہوئی وہ زیادہ تر عمارتوں، مکانوں، دکانوں اور بازاروں کا ایک سلسلہ تھا جو ڈھاکہ اور تونگی کی سڑک پر دونوں جانب چند سو گز تک چلا گیا تھا۔ یہ بات اغلب نہیں کہ کفرل اور سین پارا پاربتا کے موجودہ رقبے بھی زیادہ تر اس توسیع میں آ گئے تھے کیونکہ آج کل ان کی سرزمین پر مغلوں کی پختہ تعمیرات کا کوئی سراغ موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ گاؤں ان دنوں بھی شہر کے سکونتی نواح کا کام دیتے ہوں اور بنگال کے عام دستور کے مطابق ان پر بھی مٹی اور چٹائیوں کی جھونپڑیاں کھڑی کر لی گئی ہوں جو شہر کے زوال کے ساتھ غائب ہو گئی ہوں۔ لیکن یہ بالکل اغلب ہے کہ وہ کسی وقت بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دارالحکومت میں بالکل ہی منضم ہو گئی ہوں۔

جب 1702ء میں صوبائی مغلیہ دربار کا دور ختم ہو گیا تو ڈھاکہ عروج و زوال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے متبادل زمانوں میں سے گزرتا رہا تاآنکہ مشرقی بنگال اور آسام کا ایک صوبہ 1905ء میں قائم ہوگیا اور 1912ء میں غائب بھی ہوگیا۔ آئندہ دو عشروں میں نشوونما معمولی رہی' لیکن 1930ء والے عشرے میں توسیع کی رفتار تیز ہوگئی اور آبادی میں پچاس فیصد کا اضافہ ہوگیا۔ 1940ء والے عشرے میں آبادی تقریباً چالیس فیصد بڑھ گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح اضافہ برابر جاری رہی۔

کفرل اور سین پاراپارتبا کے دیہاتیوں کے لیے اس نشوونما کا مطلب یہ تھا کہ رفتہ رفتہ شہری اثرات کئی شکلوں میں نفوذ کرتے رہے۔

1- زمین شہری استعمال کے ماتحت آنے لگی اور باشندوں کی اکھاڑ پچھاڑ جاری رہی۔
2- روزگار کی شہری صورتیں بڑھ گئیں۔
3- شہری طور طریقے رفتہ رفتہ رائج ہونے لگے۔ ان اثرات میں امتیاز محض تجزیہ کے مقاصد ہی کے لیے کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ آپس میں بے حد مربوط ہیں اور ان کا نفوذ بیک وقت ہوا تھا۔

چونکہ ڈھاکہ کے جنوب میں دریائے بوڑھی گنگا اور مشرق میں نہایت نشیبی زمینیں واقع ہیں اس لیے شہر کی توسیع لازماً شمال اور مغرب کے اونچے قطعاتِ اراضی کی طرف ہی ہو سکتی تھی۔ مغرب کی طرف جو توسیع ہو رہی تھی اس میں بوڑھی گنگا کے ایک خم کی وجہ سے اور اس کے ایک معاون دریائے تورگ کے حائل ہو جانے سے انقطاع پیدا ہو گیا۔ چنانچہ شمال کی مرتفع زمینیں بے حد اُمید افزا ہوگئیں۔ تونگی روڈ اور ایسٹ بنگال (حال پاکستان ایسٹرن) ریلوے چونکہ ڈھاکہ اور دوسرے بنگالی قصبات کے درمیان حمل و نقل کی سہولتیں بہم پہنچاتی تھیں اس لیے ان زمینوں کے جغرافیائی فوائد بیش از بیش ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو دیہات شہر کے شمالی پہلو کے ساتھ ملحق ہیں وہ شہری نفوذ کے خطرے میں مبتلا ہوگئے۔ پہلا نفوذ آج سے چالیس سال پہلے ہوا جب ڈھاکہ فارم قائم کیا گیا۔ اس فارم نے دس مختلف دیہات کی پوری یا جزوی زمین اپنی لپیٹ میں لے لی جس میں کفرل کا جنوبی اور نہایت گنجان آبادی کا کنارا بھی آ گیا۔ جن دیہاتیوں کی زمینیں حکومت نے حاصل کر لیں ان کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

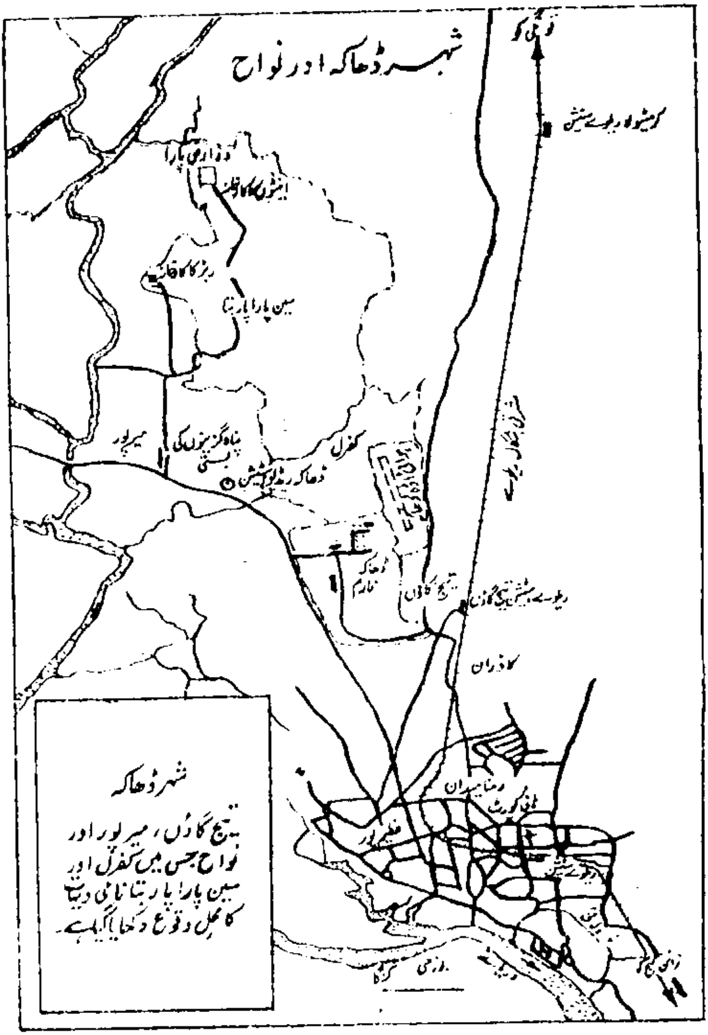

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ معاوضہ بھی ادا کیا گیا۔لیکن کفرل کے ایک باشندے کا بیان ہے کہ ان لوگوں میں سے بہت ہی کم ایسے تھے جنھوں نے دوراندیشی سے کام لے کر اپنا روپیہ نئی زمین کی خرید پر صرف کیا ہو۔بعض نے حاصل شدہ معاوضہ اَندھا دُھند کھانا اڑانا شروع کر دیا اور مفلس و نادار ہو کر رہ گئے۔ دیہاتی کو اتنی سمجھ بوجھ تو ہوتی نہیں کہ ''زمینی دولت'' کو''مالی دولت'' میں منتقل کرنے کا جتن کرے۔ چنانچہ بعض اس بحران کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے' بعض کے معیارِ زیست میں معمولی سی کمی آئی اور انہوں نے کفرل کے غیر متاثر حصے اور دوسرے قریبی دیہات کے رہنے والوں سے زمینیں خرید کر اپنے نقصان کو روک دیا۔ چند سلہٹ اور آسام کے دوسرے حصوں میں منتقل ہو گئے۔بعض غیر معلوم مقامات میں بکھر گئے۔بعض دیہاتی اس افراتفری سے جو نکلے تو ان کے پاس آزادانہ کاشت کاری کے لیے کافی زمین ہی باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ زرعی مزدوروں کے لشکر میں شامل ہو گئے اور اب تک ان کی حالت یہی ہے۔مختصر یہ کہ یہ اکھاڑ پچھاڑ نہایت المناک تھی اور جن لوگوں کو اس کھکیڑ میں سے گزرنا پڑا' وہ اسے اب تک یاد کرتے ہیں۔

دوسری بڑی افراتفری اس وقت ہوئی جب دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں ہوائی اڈا تعمیر کیا گیا اور اس کی وجہ سے کفرل اور ایک چھوٹے سے ہمسایہ گاؤں کا ایک اور حصہ غتر بود ہو گیا۔اس رقبے میں بھی دیہاتیوں کی نہایت گنجان آبادی تھی جن میں سے بعض سابق ''حملے'' کی اکھاڑ پچھاڑ کا شکار بھی ہو چکے تھے۔طرہ یہ ہے کہ اس دفعہ دیہاتیوں کو جو زرِ معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہ کیا گیا۔غیر منقسم ہندوستان کی برطانوی حکومت نے درخواستوں اور اپیلوں پر سبز باغ تو بہت دکھائے لیکن پیسہ ایک بھی نہ دیا۔ پانچ سال کی تاخیر کے بعد پاکستان بن گیا تو یوں دیہاتیوں کے مطالبے پورے نہ ہو سکے۔

یہ بڑی بڑی تحصیلاتِ اراضی تھیں جو کفرل پر آفت بن کر نازل ہوئیں۔لیکن ان کے علاوہ بھی دست برد کے بہت سے واقعات ہوئے۔مثلاً ایک تو 1953ء ہی میں رونما ہوا جب موجودہ مطالعے کی معلومات فراہم کی جا رہی تھیں۔ سابقہ سال میں سین پارا پاربتا کا ایک حصہ' جو میر پور کے نواح میں واقع تھا' ربڑ کی اشیا کے ایک کارخانے کے لیے لے لیا گیا جس میں سے پندرہ یا بیس کنبوں کو اٹھا کر ناقص زمینوں پر بٹھا دیا گیا۔سین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاراپاربتا کے شمالی کنارے سے پرے دوسرے گاؤں میں خشت سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا۔ اس کارخانے کے لیے جو سڑک نکالی گئی وہ سین پاراپاربتا کے شمال مغربی گوشے میں سے گزرتی تھی۔ ملاقاتیں اپریل 1953ء میں ختم ہوئیں اور اس سے تھوڑی دیر قبل یہ افواہیں پھیلیں کہ خودڈھا کہ فارم بھی عنقریب کارخانوں کی نذر ہونے والا ہے اور جو دیہاتی اپنے روزگار کے لیے فارم پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ بھی ذریعۂ معاش سے محروم ہونے والے ہیں۔ اس افواہ کی کوئی حقیقت تھی یا نہ تھی بہر حال تیج گاؤں کے پورے علاقے میں شہری اداروں کی توسیع دیہاتیوں کے نزدیک ایک نہایت خوفناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ ان کی زمینیں کتنی ہی بے مقدار ہوں' بہر حال وہ ان کا ذریعۂ معاش تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی اور مخالف حکومت کے ہاتھوں چھن رہی ہیں تو انہیں شدید بے چینی اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔

اراضی کے شہری استعمالات کے حملے سے کفرل اور سین پاراپاربتا کے توازن میں بھی خاص نتائج پیدا ہوئے۔ بہت سے خارج شدہ اشخاص کفرل اور نواحی دیہات کے بقیہ حصوں میں آباد ہو گئے' جو ادارے ان کے اخراج کا باعث ہوئے تھے۔ اُن ہی کی وجہ سے بے شمار تارکانِ وطن کام کی تلاش میں آ بھی گئے اور زمینیں خرید کر دیہات میں بس گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رقبہ تو کم ہو رہا تھا لیکن آبادی بے حد بڑھ رہی تھی۔ اس اضافے کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مردم شماری کی پہلی رپورٹوں کی دیہاتی فہرستوں کا جائزہ لیا جاتا لیکن اس قصے میں یہ ممکن نہ ہوا تاہم کفرل کی آبادی کی سابق گنجانی کے متعلق اندازہ کرنا ہو تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے اس زمانے کے حالات سننے چاہئیں۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ پچیس سال میں کفرل کے وسطی گاؤں میں صرف سات یا آٹھ گھر تھے جہاں اب کوئی ایک سو چالیس ہیں۔[1] موجودہ مطالعے کے موقع پر کفرل میں گھروں کی پوری تعداد 277 اور سین پاراپاربتا میں 390 تھی۔ اکثر حالات میں دیکھا گیا ہے کہ صرف ایک قطعۂ اراضی پر بارہ بارہ گھر آباد ہیں۔ یہاں دیہاتی لوگ بنگال کی عام ''منتشر آبادی'' سے مشابہ نہیں' بلکہ جنوبی

---

[1] 1919ء کے سروے کا نقشہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں گھروں کی تعداد پندرہ سے بیس تک بتائی گئی ہے' لیکن اضافہ پھر بھی بہت ہی زیادہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایشیا کے دوسرے علاقوں کی طرح آپس میں خوب پیوست ہو کر رہتے ہیں۔

کفرل کی گنجانی 1188 اشخاص فی مربع میل ہے اور سین پاراپاربتا (465 فی مربع میل) کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سین پاراپاربتا میں اضافی نشوونما زیادہ تیز ہو رہی ہے۔[1] 1919ء کے زرعی سروے کے نقشے کے مطابق گھروں کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تیس سال کی مدت کے دوران میں سین پاراپاربتا میں نسبتاً زیادہ اضافہ ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کفرل کو یہ فائدہ محض شہر کے قرب کی وجہ سے پہنچا لیکن اس علاقے میں جو مزید شہر بندی ہوئی اس نے اس فائدے کو بیکار کر دیا۔ بہر حال کفرل میں آبادی ہمیشہ ہی زیادہ گنجان رہی ہے کیونکہ سین پاراپاربتا کا بہت بڑا حصہ خشک ہے اور زراعت کے لیے موزوں نہیں۔ اگر 1951ء کی مردم شماری میں شمار کی کوئی شدید غلطی یا کمی نہیں ہوئی تو سمجھنا چاہیے کہ دونوں گاؤں میں اپریل 1951ء کی مردم شماری میں شمار کی کوئی شدید غلطی یا کمی نہیں ہوئی تو سمجھنا چاہیے کہ دونوں دیہات میں اپریل 1951ء سے اپریل 1953ء تک دو سال کے دوران میں پانچ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یہ رفتار ایک ایسے علاقے کے لیے خاصی تیز ہے جو اب تک زیادہ تر زرعی واقع ہوا ہے۔

آبادی جس قدر گنجان تر ہوتی جاتی ہے، اوسط مقبوضہ اراضی کم ہوتی جاتی ہے۔ کفرل کے باقی حصے کے مالکانِ اراضی نے غالباً اخلاقی یا اقتصادی جبر و تقاضا سے یہ ضروری سمجھا کہ زمین کو اپنے خارج شدہ ہم وطن دیہاتیوں نیز تارکانِ وطن کے ہاتھ فروخت کر دیں جو کم سے کم اتنی زمین خریدنے کی توفیق تو رکھتے تھے جس پر مکان بنا سکیں۔ بعض نے کنبے کے گزارے کے لیے مزید چاول پیدا کرنے کی غرض سے بھی مزید زمین خرید لی لیکن بعض اپنے آپ کو خود مکتفی کاشت کاروں کی حیثیت سے بالکل ہی قائم نہ کر سکے۔

معلوم ہوتا ہے نئے آبادکاروں کے پہلے داخلے سے زمین پر آبادی کا دباؤ کچھ زیادہ نہیں بڑھا کیونکہ بوڑھے دیہاتیوں کے بیان کے مطابق پچیس سال پیشتر یہ حال تھا کہ کفرل کی زمین کا صرف ایک تہائی حصہ کسی ایک موسم میں زیرِ کاشت ہوا کرتا تھا۔ نسبتاً نئے کنبے زمین کا ایک خاصا حصہ بے کاشت چھوڑ دیتے تھے اور چاول کی ''امن'' (موسم سرما)

---

[1] 1951ء میں مشرقی پاکستان کی آبادی کی اوسط گنجانی 777 افراد فی مربع میل تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی فصل ہی ان کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ ہر کنبے کو اپنے گھر کا دودھ مل جاتا تھا اور میٹھے کی ضرورت کھجور کے رَس سے پوری ہو جاتی تھی۔ غذا کے لیے زیادہ شدید جدوجہد کی ضرورت نہ تھی اور کاشت کار کو موجودہ حالت کی نسبت بہت کم محنت کرنی پڑتی تھی۔ غرض خوشحالی عام تھی اور گو یادِ وطن کا جذبہ بھی ستاتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتی کچھ مدت تک مزید آبادی کو آسانی سے جذب کرتے رہے۔ گو انہیں اس کی خبر نہ تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

غرض ایک نسل پیشتر تو گاؤں کی زندگی مسرت واطمینان سے بھرپور تھی لیکن آج کل حالات مختلف ہیں۔ اگرچہ زمین کی افراط ہے لیکن اس کے باوجود آج کفرل کے بیس فیصد اور سین پاراپاربتا کے چودہ فیصد گھر اراضی سے بالکل محروم ہیں۔ ان کے علاوہ کفرل میں 23 فیصد اور سین پاراپاربتا کے 8 فیصد گھر ایسے ہیں جن کے پاس صرف تھوڑی سی اونچی زمین ہے جس پر انہوں نے اپنے گھر تو بنا لیے ہیں لیکن فصلیں کاشت نہیں کر سکتے۔ باقی کفرل کے 56 فیصد اور سین پاراپاربتا کے 78 فیصد گھروں کے پاس اتنی زمین تو موجود ہے کہ وہ کم از کم ایک فصل پیدا کر سکتے ہیں لیکن دونوں دیہات میں یہ مقدار اکثر بے حد قلیل ہوتی ہے۔ ایک تہائی سے زیادہ گھر ایسے ہیں جو ہر سال دس من سے بھی کم چاول پیدا کرتے ہیں۔ صرف کفرل میں 23 فیصد گھر مختلف قسم کی فصلیں اگاتے ہیں جو روایتی زرعی معمول کے مطابق ہوتی ہیں اور سین پاراپاربتا میں ایسے گھروں کی مقدار 46 فیصد ہے۔ ان اعداد سے ظاہر ہے کہ کفرل میں اگرچہ زراعت کے لیے بہتر زمین موجود ہے لیکن یہ گاؤں روز بروز سکونتی صورت اختیار کر رہا ہے اور اس کا یہ رجحان سین پاراپاربتا کے مقابلے میں زیادہ ترقی پذیر ہے۔ اراضی کی مقبوضات میں جو تقسیم در تقسیم ہوئی ہے وہ سب کی سب نئے آبادکاروں کی آمد سے منسوب نہیں کی جاسکتی اور شرح پیدائش بڑھ جانے سے آبادی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ بلاشبہ کفرل اور سین پاراپاربتا میں ایسے گھر موجود ہیں جو ایک زمانے میں کالا کھیتی باڑی پر گزارا کر لیتے تھے لیکن اب وہ اتنے پھیل گئے ہیں کہ صرف اس ذریعے سے ان کے پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اگر وہ تمام گھر جس کے یک جدی افراد اسی گاؤں میں پیدا ہوئے جس میں وہ اب تک آباد ہیں ''ملکی اور وطنی'' قرار

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دے دیئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ کفرل میں چالیس فیصد سے کم ایسے گھر موجود ہیں جو اپنی معاش زیادہ ترکھیتی باڑی سے پیدا کرتے ہیں۔ کفرل کے تقریباً تیس فیصد گھروں کا انحصار غیر زراعتی آمدنیوں پر ہے لیکن سین پاراپاربتا میں صرف چار فیصد خاندان اس زمرے میں آتے ہیں کفرل میں صرف ''غیر ملکی'' گھر' یعنی جن کے زندہ بزرگ کسی دوسری جگہ پیدا ہوئے تھے' زراعتی آمدنیوں پر انحصار رکھتے ہیں۔ سین پاراپاربتا میں یہ حالت نہیں۔

اکثر وطنی و مقامی کنبے روز بروز زراعت کے سوا دوسرے ذرائع آمدنی پر انحصار کرنے لگے ہیں لیکن وہ یقیناً اپنی مرضی سے نہیں کر رہے اور دوسروں کا بھی یہی حال ہے۔ جن ثقافتی بندھنوں نے مشرقی پاکستان کے کاشت کار کو زمین سے وابستہ کر رکھا ہے وہ اکثر حالات میں صرف ضرورت کے دباؤ ہی سے ٹوٹتے ہیں اور یہ شکست زیادہ سے زیادہ مدت تک ملتوی ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے اور نئے باشندے برابر ایک چھوٹی سی قابل کاشت زمین سے چمٹے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ گھر کے کماؤ افراد کھیتوں میں باقاعدہ کام بھی نہیں کرتے اور پیداوار بھی صرف چار یا پانچ من سالانہ تک گر چکی ہوتی ہے۔ یہ بندھن صرف غیر عقلی یا مذہبی جذباتیت پر مبنی نہیں ہوتا۔ زمین سے علیحدہ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ گویا کاشت کار نے گزشتہ نسلوں کی موروثی ہنر مندیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ اس علیحدگی سے زندگی کے آہنگ میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ کاشت کار کی زندگی کیا ہے؟ اس میں موسم کے متعین کردہ چکر ہیں جن میں کبھی شدید مصروفیت ہوتی ہے اور کبھی فرصت ہی فرصت' جس کو وہ اپنی مقامی منڈیوں اور بازاروں میں پان کھا کر اور حقہ پی کر مزے سے بسر کرتا ہے۔ یہ وہ رنگا رنگ دلفریبی ہے جو صنعت و کارخانہ داری کے بندھے ٹکے کام میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ کام کاج اور روزگار کے حالات پر قابو نہ رہنا بھی اس شخص کے لیے بطور خاص اہم ہے جو کسی گھر کا سردار یا اپنی مزدوروں کی ٹولی کا سر دھرا بننے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ جب اس قسم کا کوئی فرد کسی کارخانے کے فورمین کے ماتحت کام کرنے لگتا ہے تو اپنے درجے اور مقام سے گر جاتا ہے اور بہتر اُجرت کی رقم اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ ان تمام اُمور کے پیش نظر سمجھا جا سکتا ہے کہ ان دیہات میں زراعت کا کام محض اس لیے ترک ہو رہا ہے کہ معاشرتی قوتیں مجبور کر رہی ہیں۔ اس قسم کے تغیرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُسی حالت میں ہوا کرتے ہیں جب آبادی میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ مقامی وسائل ان کے بے ملکفی ہونے کے قابل نہ رہیں۔

زراعت سے یہ عبور و تغیر جہاں تک ممکن ہو آہستہ آہستہ ہوا کرتا ہے۔ اس تغیر کا پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب کسی کنبے کی زمین اپنے مردوں کے لیے کام اور گھر کے افراد کے لیے معاش مہیا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس وقت ملازمت کی عمر کے ایک دو نوجوان لڑکے کسی خوشحال کاشت کار کے ہاں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ کھیتی باڑی کے کام میں امداد کریں۔ عام طور پر اس امداد کے معاوضے میں انہیں قیام و طعام کی سہولت دی جاتی ہے اور کبھی دو تین روپے نقد بھی ہر مہینے تھما دیئے جاتے ہیں جو غریب خاندانوں کے لڑکوں کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ زیادہ عمر کے مرد بڑے بڑے زمینداروں کے ہاں زرعی مزدور کی حیثیت سے مقررہ اُجرت پر کام کرتے ہیں یا کفرل میں اور سین پارا یا ربتا کے قریب تر کنارے پر ڈیری فارم میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ ان صورتوں میں دیہاتیوں کو اپنی عادتوں میں کم از کم تکلف اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مزدور ان تمام زرعی طور طریقوں کو برابر استعمال کرتا رہتا ہے جو اس نے اپنے بزرگوں سے سیکھے ہیں اور اس کی سرگرمیاں قریب قریب وہی رہتی ہیں جن سے وہ قبل ازیں آشنا تھا۔ مالک یا فورمین کی حیثیت وہی ہے جو گھر میں بڑے بوڑھے بزرگ کی ہوا کرتی تھی اور مزدور اِسی قسم کی محنت کرتا ہے جو اس سے قبل وہ گھر کے اقتصاد میں انجام دیا کرتا تھا لیکن روزگار کا مقام یقیناً بدل گیا۔ کارکن اور اس کے کنبے کے لوگ دوسروں کی مرضی کے پابند بن کر رہ گئے اور کام کاج کی نگرانی کا کام کنبے کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ مزید برآں مقررہ اُجرت بڑی چیز ہے اور زیادہ کام کرنے پر اُبھارتی ہے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کارکن اپنی زمین کاشت کرتا تھا تو کام کاج پر اس کا دعویٰ کم تھا لیکن اب کام کاج کو کارکن پر زیادہ دعویٰ ہو گیا۔ اگرچہ کسی کسان کا ''زرعی مزدور'' بن جانا خود کاشت کار کو بہت سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے' لیکن درحقیقت اس میں بہت بڑا تغیر پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس عبور کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ کاشت کار روایتی لیکن غیر زراعتی مشغلے اختیار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کاروباری سرگرمی کی بعض شکلیں خصوصاً گھر کی پیداوار، پھل سبزی ترکاری، دودھ، بانس، کھپریل اور ایندھن کی فروخت اسی میں شامل ہیں۔ پھر بعض اجرت کی خدمتیں اور پیشے مثلاً راج کا کام، کھپریل کی چھت پاٹنا، گاڑیاں اور رہڑے چلانا، چوپایوں کی دلالی، پیداوار کی تھوک فروشی دواسازی و دوافروشی اور دوسرے دیہاتی فنون اور صنائع بھی اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ روایتی ذرائع روزگار میں وہ بھی شامل ہیں جنہیں گھریلو صنعت کے پیشے سمجھنا چاہیے مثلاً بیرا (چھوٹے موٹے کام کرنے والا) چپراسی (پیغام لے جانے والا) مالی، چوکیدار، دربان وغیرہ۔ اگرچہ ان میں سے بعض پیشوں کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتی کا زیادہ تر وقت ان کاموں میں صرف ہوتا ہے جن کا تعلق کاشت کاری سے نہیں ہے اور وہ زیادہ تر گاؤں سے باہر بھی رہتا ہے لیکن ان مشغلوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو اپنے علاقے کی دیہاتی ثقافت کے اجتماعی ماضی سے منقطع ہونا پڑے لیکن بہر کیف انفرادی طور پر جو شخص زمین سے جزوی طور پر بھی منقطع ہو جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آتا۔

عبور کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ دیہاتی قطعی طور پر شہری سرگرمیوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ ان میں کاروبار کی بعض شہری قسمیں مثلاً سڑکوں پر چائے خانے، دکانیں اور خوانچے، شہری صنعتیں (مثلاً مشینیں بنانے کا کام، بجلی کا کام، خشت سازی، رکشارانی، ٹرک اور موٹر کی ڈرائیوری یا کلرکی) اور آخر میں دستی محنت۔ اس قسم کے دیہاتیوں سے کوئی اقتصادی بندھن وابستہ نہیں کرتا۔ سوائے اس کے کہ وہ ان کا وطن ہوتا ہے اور جس خاندان کے افراد ابھی اس کی زمین کو کاشت کر رہے ہوتے ہیں ان کے ساتھ رشتہ داری کے تعلقات ہوتے ہیں۔ جہاں تک ان کی شخصی زندگی کی شکل وصورت کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر دیہات نہیں رہتے اور ''عبور و تغیر'' مکمل ہو جاتا ہے۔

ان مرحلوں کا جو خاکہ ابھی کھینچا گیا ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس دیہاتی کی مخصوص تاریخ حیات بیان کی جائے جس کا گاؤں عبور و تغیر کے دور سے گزر رہا ہے۔ بہت قلیل ایسے دیہاتی ہوں گے جو اس ترتیب کے ساتھ پیشوں کے تغیرات میں سے گزارتے ہوں گے۔ بہت سے گھروں میں کافی لچک ہوتی ہے اور وہ کئی مختلف مراحل کے پیشوں کو ملا جلا بھی لیتے ہیں۔ تاہم گاؤں بحیثیتِ مجموعی یقیناً اس تغیر کے دَور سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ کفرل اپنے دور کے ہمسائے کی نسبت اس عبور وتغیر میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے کارکن مردوں میں 19 فیصد زیادہ تر اپنی زمینوں کی کاشت میں مصروف ہیں۔ اس کے مقابلے میں سین پاراپاربتا کے لوگوں میں 41 فیصد ایسے لوگ موجود ہیں۔ سین پاراپاربتا کے باشندوں کا دگنا تناسب زرعی نوکروں کی حیثیت رکھتا ہے۔ کفرل کے زیادہ باشندے اپنا پیشہ ''زرعی مزدوری'' لکھواتے ہیں (یہ 22 فیصد ہیں۔ بمقابلہ سین پاراپاربتا کے 18 فیصد کے) لیکن چار میں سے تین ڈھاکہ فارم میں ملازم ہیں اور سین پاراپاربتا میں چار میں سے ایک ہوگا جو خود گاؤں سے باہر ملازم ہوگا۔ خانگی' ہنر مند' کلرک' ڈرائیور اور مزدور جیسے پیشوں میں کفرل خاصا آگے بڑھا ہوا ہے۔ صرف کاروبار میں سین پاراپاربتا کفرل سے آگے ہے۔ (گیارہ فیصد بہ بمقابلہ کفرل کے 8 فیصدی کے) لیکن یہاں سین پاراپاربتا کے پانچ کاروباری افراد میں سے چار خود گاؤں ہی میں کاروبار کرتے ہیں۔ کفرل میں ایسے شخص دس میں سے ایک کے تناسب سے ہوں گے۔ غرض معلوماتِ حاصلہ ہر اعتبار سے مظہر ہیں کہ سین پاراپاربتا کے مقابلے میں کفرل زیادہ شہری بن چکا ہے۔

اس تسلسل مراحل کے خیال کو ایک اور بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جن اشخاص نے مختلف قسم کے بیرونی روزگاروں میں اپنے گاؤں سے باہر چند سال گزارے ہیں' ان کا تناسب سامنے رکھ لیا جائے۔ ان اعداد وشمار سے ان اشخاص کی مدتِ ملازمت تو واضح نہیں ہوتی جو گاؤں کے اندر کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور بہت کم حالات میں ان کی عمر کا کوئی مؤثر اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان تمام تحدیدات کے باوجود یہ امر بالکل واضح ہے کہ ڈھاکہ فارم کے کاشت کاروں اور گھریلو خدمت گاروں (جن میں سے زیادہ تر ڈھاکہ فارم میں ملازم ہیں) کی طویل ترین اوسط میعاد ملازمت علی الترتیب 12.0 اور 12.1 برس تک پہنچتی ہے۔ کاروباری گروہ درمیانی حیثیت رکھتا ہے اور دستی محنت کرنے والا گروہ تازہ ترین ہے۔ ان دونوں کی میعاد علی الترتیب 10 اور 7.2 سال ہے۔ یہ اعداد صرف کفرل کے متعلق ہیں۔ سین پاراپاربتا میں تجزیہ کے لیے کافی افراد نہیں ملتے' سوائے دستی محنت کرنے والوں کے جنہوں نے اوسط کے اعتبار سے 5.6 سال باہر کام کیا اور نصف کے قریب آدمی ''ایک سال سے کم'' والے زمرے میں آتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دونوں دیہات کے درمیان اس اعتبار سے بھی مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے کارکن اپنے کام کاج کی وجہ سے بیرونی روابط کس درجے تک رکھتے ہیں۔ کفرل میں صرف پینتیس فیصدی برسرِ روزگار مردوں نے اپنے کام کاج کو گاؤں کے اندر جاری رکھا لیکن سین پاراپاربتا میں 78 فیصدی افراد اپنے گاؤں کے اندر رہ کر مصروفِ کار رہے۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈھاکہ فارم سین پاراپاربتا کے مقابلے میں کفرل کے لیے زیادہ اہم ہے لیکن علاوہ بریں کفرل کے تیس فیصدی کارکن ڈھاکہ شہر اور کنارے کے قصبوں میں برسرِ کار ہیں اور اس کے مقابلے میں سین پاراپاربتا میں صرف 17 فیصدی مزدور ہیں جو شہر اور قریبی قصبوں میں کام کرتے ہیں۔

اگر زرعی پیشوں کو چھوڑ کر غیر زرعی پیشے اختیار کرنے کی سب سے بڑی وجہ آمدنی ہی ہوتی تو عبوری حرکت حالتِ موجودہ کی نسبت زیادہ دوررس ہوتی۔ ان دونوں گاؤں میں زرعی مشغلوں کی اوسط آمدنی دوسری قسم کی روزگار کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اگر ان کی اراضی کی کاشت کی وہ اوسط آمدنی دریافت کرنی ہو جو کسی حد تک مقررہ اُجرت کے پیشوں کی آمدنی سے مقابلہ کر سکے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی گھر کی پوری سالانہ پیداوار کی بازاری قیمت کو ان اشخاص کی تعداد پر تقسیم کیا جائے جن کا بنیادی پیشہ کاشت کاری ہے اور ہر کاشت کار کے لیے قطعی اعداد درج کیے جائیں۔ اس طریقے سے کاشت کاری کی نسبتی آمدنی کا غالباً کچھ زیادہ اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ اکثر کارکن جو غیر زراعتی کاموں کو اپنا بنیادی روزگار بناتے ہیں وہ بجائی اور کٹائی کے دوران میں امداد بھی دیتے ہیں لیکن اس سے جو زرعی دولت حاصل ہوتی ہے وہ صرف ان لوگوں سے منسوب کر دی جاتی ہے جو بنیادی اعتبار سے کاشت کار کہلاتے ہیں۔ بڑے کاشت کاروں نے فصلوں کی مصروفیت کے انتہائی زمانے میں اُجرتی مزدوروں کو جو معاوضہ دیا اس کے متعلق کوئی اعداد و شمار حاصل نہیں ہو سکے بلکہ غالباً (خاص کر کفرل میں) ثانوی فصلوں کے متعلق اصل سے کم اطلاعات دی گئیں۔ صرف اوسط کی قیمتیں پیشِ نظر رکھنے سے انتہائی معاملات میں کچھ تخفیف دکھائی دے سکتی ہے لیکن کاشت کاروں کی آمدنی میں پھر بھی دس یا پندرہ فیصدی کا مبالغہ کیا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان اعداد کے باوجود کاشت کاری کا دوسرے روزگاروں سے کوئی مقابلہ نہیں۔

کاشت کاری میں آمدنی کم ہے۔ البتہ ''زرعی مزدوری'' اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ کفرل کی زمین چونکہ اعلیٰ درجے کی ہے اور شہری منڈیوں سے قریب تر بھی ہے اس لیے سین پاراپاربتا کی نسبت بہتر سالانہ آمدنی مہیا کرتی ہے۔ اوسط کی رقوم 417 اور 381 روپے ہیں۔ زرعی مزدور اس سے بھی کم کماتا ہے اور سین پاراپاربتا میں فرق نسبتاً زیادہ ہے کیونکہ وہاں متبادل روزگاروں کی تعداد کم ہے۔ کفرل میں زرعی مزدوروں کی اوسط آمدنی 400 روپے اور سین پاراپاربتا میں 298 روپے ہے۔ سب سے زیادہ خوشحال کاشت کاروں نے اپنی آمدنی دو ہزار روپے سے زیادہ درج کرائی لیکن بہترین اُجرت لینے والے زرعی مزدور کفرل میں سات سو سے اور سین پاراپاربتا میں پانچ سو روپے سے زیادہ آمدنی کا دعویٰ نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جو کاشت کار زرعی مزدور بن جاتا ہے اس کی مالی حالت خراب ہو جاتی ہے اور کوئی شخص زرعی مزدور بننے پر آمادہ نہیں ہوتا جب تک وہ کسی نقصان یا کنبے کی زمین کی تقسیم در تقسیم کی وجہ سے اس ذلت پر مجبور نہ ہو جائے۔ اگر صرف آمدنی کی بنیاد کو مدِ نظر رکھا جائے تو دستی محنت مزدوری کا کام زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے۔ کفرل میں دستی مزدوروں کی آمدنی کی اوسط 494 روپے اور سین پاراپاربتا میں' جہاں نئے کارخانوں میں اُجرت کی شرح کسی قدر زیادہ ہے' 520 روپے ہے۔ اگر صرف آمدنی ہی مؤثر ہوتی تو زرعی مزدوری کے نتائج معتد بہ ہوتے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بہت سے دیہاتیوں کے لیے کھیتی باڑی کے کام کو تج دینا بہت بڑی ثقافتی تبدیلی ہے جو نہایت شدید رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔

کاروبار کے شعبے بے شمار ہیں۔ بڑی بڑی جائیدادوں کی فروخت سے لے کر پان اور بیڑی کے خوانچے لگانے والے مزدوروں کو ٹھیکے پر رکھنا ان کے درمیان بے اندازہ کام کاج ہیں۔ کفرل کے رہنے والے ذرا صاف ستھرا شہری کاروبار کرتے ہیں لیکن سین پاراپاربتا کے دیہاتی زیادہ تر مقامی ضروریات پوری کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے کام اختیار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ان کی اوسط رقوم آمدنی سے واضح ہوگی (کفرل میں 713 روپے سین پاراپاربتا 383 روپے) گھریلو روزگاروں اور ہنرمندانہ پیشوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی نسبتاً زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ سین پاراپاربتا کے متعلق صرف چند اعداد ملے ہیں جن سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا۔ لیکن کفرل میں انہی پیشوں کی علی الترتیب اوسط آمدنی 652 روپے اور 850 روپے ہوتی ہے۔

عمومی حیثیت سے شہر بندی کا اثر یہ ہوا ہے کہ دیہاتی کنبوں کی نقد آمدنیوں میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر بعض افراد خاندان گاؤں سے باہر کام کر کے مزید آمدنی پیدا نہ کرتے تو ان کنبوں کا ہرگز گزارہ نہ ہو سکتا جواب تک بنیادی طور پر کاشت کار چلے آتے ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ گاؤں کے کسی کنبے کا صرف ایک نوجوان شہر میں کلرکی کی آسامی پر فائز ہو کر کنبے کو اتنی رقم مہیا کر رہا ہے کہ باقی افراد خاندان کاشت کاری میں مل کر بھی اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں کہ چھوٹے لڑکے شہر میں دستی مزدوری کرتے ہیں اور سب سے بڑا لڑکا گاؤں میں کاشت کاری کرتا ہے لیکن ان مزدوروں کی آمدنی اس کاشت کار بھائی سے زیادہ ہے۔ ایسے کنبے کے لیے شہری روزگار کی اقتصادی امداد بہت بڑی رحمت ہے بلکہ اس امداد نے اکثر خاندانوں کو تباہی سے بچا لیا ہے۔

اگرچہ کفرل شہر سے قریب تر ہے لیکن کفرل کے جو لوگ گاؤں سے باہر پیدا ہوئے ہیں ان کا تناسب فیصدی سین پاراپاربتا کے مقابلے میں کم ہے۔ کفرل میں 30.4 فیصدی سین پارا میں 35.5 فیصدی۔ لیکن یہ اعداد بجائے خود چنداں معنی نہیں رکھتے کیونکہ ان میں عمر یا جنس (مرد یا عورت) کا کوئی امتیاز نہیں۔ دونوں گاؤں میں بہت زیادہ دلہنیں آس پاس کے دیہات ہی سے آتی ہیں کیونکہ دیہاتی نظام ازدواج کی یہ وسیع اور عالمگیر رسم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نقل مکانی تو شہری اثر کی پیداوار نہیں ہوتی۔ مرد تارکان وطن عام طور پر دور فاصلوں سے آتے ہیں اور بعض اوقات تو کنبے کے کنبے گروہوں کی صورت میں بیک وقت ایک ہی مقام سے منتقل ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں میمن سنگھ کے بے شمار تارکان وطن کفرل میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ سین پاراپاربتا میں اسی قسم کی نقل مکانی ٹیپرا سے ہوئی تھی۔ پچھلے دنوں نقل مکانی پیشوں کے اعتبار سے زیادہ مخصوص و منفرد ہو گئی۔ پرانے زمانے میں جو گروہ در گروہ خاندان نقل مکانی کرتے تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کاشت کے لیے زمین حاصل کریں۔ کفرل میں یہ نقل مکانی تیس سال یا اس سے بھی زیادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرصہ پہلے ہو چکی تھی وہاں جو مرد مہاجر آج کل کھیتی باڑی میں مشغول ہیں ان کی عمر کا اوسط چھتیس سال ہے۔

ابتدائی دور کے یہ مہاجر جو اتنی زمین حاصل نہ کر سکے کہ ان کے کنبے کا گزارا ہو سکتا زیادہ دیر کھیتی باڑی کے سلسلے میں مزدوری کرنے لگے۔ سین پاراپاربتا میں زمین کے خواہشمند مہاجروں کی لہر اب تک جاری ہے۔ بہت سے کاشت کار اور زرعی مزدوروں سے چودہ سال پیشتر تک داخل ہو چکے تھے۔ ان دونوں گاؤں میں جو مہاجر ماضی قریب میں پہنچے وہ زیادہ تر شہری نمونے کی مشغولیتوں میں لگ گئے۔ مہاجروں کے پیشہ ورانہ مقاصد کا رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ تدریجاً زرعی مشاغل کے بجائے غیر زرعی مشاغل اختیار کر لیں۔ قریب کے دیہات میں یہ رجحان دور افتادہ دیہات کے مقابلے میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مہاجروں کے اہل وعیال کا انحصار مستقل باشندوں کے اہل وعیال کے مقابلے میں غیر زرعی آمدنی پر زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ فرق گھٹ رہا ہے اس لیے کہ جو مقامی باشندے کھیتی باڑی میں لگے ہوئے ہیں ان کے بیٹے بھی دوسری قسم کے روزگار کی تلاش پر مجبور ہو رہے ہیں۔

کسی نہ کسی زبان میں خواندگی کا تناسب کفرل کے باشندوں میں 12 فیصد ہے اور سین پاراپاربتا میں 8 فیصد۔ یہ اعداد دیہاتی حلقوں کے لیے چنداں کم نہیں لیکن انہیں قبول کرنا مشکل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جن لوگوں کو بنگالی زبان میں خواندہ سمجھا جاتا ہے وہ بہت ہی معمولی پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ جو چند لوگ اردو اور انگریزی میں خواندگی کے مدعی ہیں ان کی کیفیت بھی یہی ہے۔ باقی رہا عربی زبان میں خواندگی کا دعویٰ تو اس کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ قرآن کے الفاظ نماز و دعا کے لیے پڑھ لیے جاتے ہیں' ان کا مطلب نہیں سمجھا جاتا۔ اصل اصطلاح کے مفہوم کے مطابق ظاہر ہے کہ اسے خواندگی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر عربی میں بیان کردہ خواندگی کا تناسب حساب سے خارج کر دیا جائے تو دونوں گاؤں کی خواندگی بالترتیب 10 فیصد اور پانچ فیصد رہ جاتی ہے۔ عربی میں خواندگی کی اکثریت عورتوں تک محدود ہے اس لیے کہ اس پسندیدہ آرائش کے بعد ان کے لیے شادی کے موقعے بڑھ جاتے ہیں۔ سین پاراپاربتا میں کل خواندہ عورتیں بیالیس تھیں ان میں سے چونتیس عربی پڑھی ہوئی تھیں۔ کفرل میں زیادہ تر عورتیں یا تو صرف بنگالی زبان میں پڑھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لکھ لیتی ہیں یا بنگالی اور عربی دونوں میں۔ خالص عربی میں پڑھی لکھی کوئی نہیں۔ ایک حوصلہ مند خاتون کے متعلق یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ عربی بنگالی' اردو اور انگریزی چاروں زبانوں میں پڑھ لکھ لیتی ہے۔ کفرل میں خواندگی کے تناسب کی زیادتی اور مقامی زبان پر زیادہ زور کا سبب غالباً شہری اثرات ہیں۔

شہری رنگ پیدا کرنے اور پڑھنے لکھنے کے درمیان تعلق کے لیے مزید شہادت مطلوب ہو تو ہمیں ایک طرف تعلیم پانے کی عمر کے ذکور کی شرح خواندگی پر نظر ڈالنی چاہیے۔ دوسری طرف اس گھرانے کے رئیس کا خاص پیشہ سامنے رکھنا چاہیے جس میں وہ رہتے ہیں۔ ہر قابل ذکر دائرے میں یہ تناسبات سین پاراپاربتا کے بجائے کفرل کے لیے زیادہ ہیں۔ کفرل میں کاروباری' خانہ داری اور ہنر مندی کے دائرے کے تناسبات کاشت کاروں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ہنر مند کارکنوں کے گھرانے کے ذکور کا نصف سے زیادہ حصہ خواندہ ہے۔ سین پاراپاربتا میں صرف ہنر مند کارکنوں کے گھرانے کاشت کاروں پر فائق ہیں لیکن جو مثالیں ہمارے سامنے آئیں وہ اعتماد کے لیے ناکافی ہیں۔[1] ان معلومات سے تین عام حقیقتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ خوشحال کاشت کار عموماً اپنے بچوں کو تعلیم دیتا ہے لیکن جن دیہات میں شہری رنگ پیدا ہو چکا ہے وہ غیر زراعت پیشہ ہمسائے کے مقابلے میں پسماندہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ مزدوروں سے آگے ہے جو دوسروں کا ساتھ نہیں دے سکے۔

دیہاتی خواندگی میں افزائش کو مجلسی تبدیلی کے سرچشمے یا نشان کی حیثیت میں زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے۔ کم از کم بہ حالتِ موجودہ یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ دیہاتی خواندہ آدمی شہری خیالات کے پھیلانے کا وسیلہ ہے یا عوامی طور طریقے اندرونی دیہات تک پہنچاتا ہے۔ ایسا سمجھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس کی صلاحیت کا مبالغہ آمیز اندازہ کیا اور اس کے محرک کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔ وہ نہ خود اس غرض سے پڑھتا ہے اور نہ

[1] زرعی مزدوروں اور عام مزدوروں کے کنبوں کی شرح دونوں دیہات میں بمقابلہ کاشت کاران کم ہے۔ کفرل اور سین پاراپاربتا میں تعلیم کے قابل بچوں کا عام تناسب بالترتیب 25.3 اور 14.5 فیصد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے بچوں کو اس غرض سے تعلیم دلاتا ہے کہ اپنے کنبے کو شہریت کے اس اثر کا نشانہ بنائے جو روایتی زندگی کو بگاڑنے کا موجب بنتا ہے۔ دیہاتی خواندہ یا خواندگی کا سرپرست دیکھتا ہے کہ تعلیم ایک خاص حیثیت کا نشان ہے اور دیہاتی حلقے کی مسلمہ ثقافت کے دائرے میں عزت اور امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر اس میں استطاعت ہوگی تو وہ قریب کے کسی کالج یا یونیورسٹی کے طالب علم کے لیے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کر دے گا تاکہ اس کے بچوں کو سبق پڑھایا کرے۔ کفرل میں ایسے نوجوان ''اتالیقوں'' کی ایک تعداد موجود تھی جو زراعتی انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم پا چکے تھے اور ان کے شاگرد بعض اوقات شام کے اوقات میں مٹی کی دیواروں کے پیچھے سے زور زور سے سبق پڑھتے ہوئے سنے جاتے تھے اور بنگال میں ابتدائی تعلیم کا عام نقشہ یہی ہے۔ ایسی درسگاہوں کے گریجویٹ فوراً شہری بنگالی اخباروں کے مشتاق نامہ نگار نہیں بنتے۔ جب تک دیہاتی زندگی اور شہری زندگی کے درمیان گہرا ربط وضبط پیدا نہ ہوگا جس کی وجہ سے پڑھنا لکھنا روزانہ کی ضروری چیز بن جائے، نری دیہاتی خواندگی مجلسی تبدیلی کا اہم ذریعہ نہیں بن سکتی۔

اس معاملے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہ شہری ربط وضبط کی وجہ سے مشترکہ کنبے داری کے رشتے ڈھیلے پڑتے گئے۔ ثبوت میں بہت سی عامیانہ باتیں کہی جا چکی ہیں لیکن محکم معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ دیہات میں مشترکہ کنبوں کے ٹوٹ جانے پر ماتم کرنا قبل از وقت بھی ہے اور بعض فوائد کے لحاظ سے اسے مناسب بھی نہیں سمجھا جا سکتا[1] لیکن مشترکہ کنبہ داری اور اس کے گوناگوں فوائد کے متعلق خواہ مخواہ رومانی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک سردار کے ماتحت کنبے کو اکٹھا رکھنے سے رشتہ داری کے واجبات پھیلتے ہیں اور محنت مزدوری کے لیے ایک مناسب گھرانے کی ضرورت کے ساتھ مساوی حصوں میں زمین کی میراث کا نظام ملا دیا گیا ہے تاکہ اس قسم کے کنبے کی تنظیم پیدا ہو چکے اور اسے قائم رکھا جا سکے۔ مشترکہ کنبہ داری اپنی بہترین صورت میں تمام ارکان کے لیے اہم ضرورتیں پوری کرتی ہے۔ مگر اس میں بھی خرابیاں ہیں بعض حالتوں میں

---

[1] ہندوستان کی مردم شماری بابت 1921ء جلد اول حصہ اول جے۔ ٹی۔ مارٹن کلکتہ۔ سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پرنٹنگ کی رپورٹ بابت 1924ء صفحات 46,47۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح زمین کی زیادہ تقسیم رک جاتی ہے اور ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی کہ جس کنبے کا گزارہ کم از کم زمین پر ہو رہا ہے اس کی ملکیت چار یا پانچ حصوں میں تقسیم ہو کر انہیں بالکل قلاش بنا دے' تاہم اس قسم کی مہلت زیادہ سے زیادہ صرف ایک نسل تک باقی رہتی ہے۔ جب کسی گھرانے کی آبادی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی مملوکہ زمین میں نہ تو سب کے لیے کام کی گنجائش رہتی ہے نہ اس پیداوار پر گزارہ ہو سکتا ہے تو مشترکہ کنبہ داری کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔ یہ درست ہے کہ تمام دیہات میں اس نظام کو یکا یک چھوڑ دینے سے دیہات کی مجلسی تنظیم میں سخت خلل پیدا ہو گا لیکن مشترکہ کنبہ داری زرعی کنبوں کے دوسرے اکثر نمونوں کی طرح قائم ہے اور کسی معقول وجہ کے بغیر ناپید نہ ہو گی۔

کفرل اور سین پارا پار بتا میں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ مشترکہ کنبہ داری تیزی سے فنا ہو رہی ہے۔ ایسے مشترکہ گھرانوں کی تعداد بہت کم ہے اور دونوں دیہات میں یہ قریباً یکساں ہے۔ کفرل میں 15 فیصد اور سین پارا پار بتا میں 14 فیصد ہو سکتا ہے کہ یہ عمل دونوں گاؤں میں مساوی مرحلے پر پہنچ چکا ہو لیکن اگر اس مشتبہ نتیجے کو قبول کر لیا جائے تو رجحان کو شہری اثرات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایسی کنبہ داریوں کی درجہ بندی کنبے کے سرداروں کے خاص پیشوں کے مطابق کی جائے تو مشترکہ کنبہ داری کا نظام زیادہ تر وہیں پایا جاتا ہے۔ جہاں کنبے کا سردار کھیتی باڑی کے کام میں لگا ہو۔ جہاں کنبے کا سردار کاملاً زرعی پیشہ میں مشغول ہو وہاں یہ کمتر پایا جاتا ہے لیکن مشترکہ کنبوں کے سرداروں کی خاصی تعداد ایک حد تک غیر زرعی مشاغل میں بھی لگی ہوئی ہے۔ سین پارا پار بتا میں مشترکہ کنبوں کے جو رئیس جزوی طور پر غیر زراعت پیشہ کاروبار میں مصروف ہیں ان کی تعداد خالص زراعت پیشہ سرداروں کے مقابلے میں زیادہ ہے ایسے مشترکہ کنبوں کی تعداد بہت کم ہے جن کے تمام افراد اپنی زمین کے اندر کاشتکاری میں مصروف ہیں۔ تمام مشترکہ کنبوں کی تعداد بہت کم ہے جن کے تمام افراد اپنی زمین کے اندر کاشتکاری میں مصروف ہیں۔ تمام مشترکہ کنبوں کے کارکنوں میں سے 38 فیصدی کفرل میں اور 39 فیصدی سین پارا پار بتا میں زیادہ تر کھیتی باڑی کر رہے تھے۔ باقی یا تو کھیتی باڑی کے سلسلے میں مزدوری کر رہے تھے یا کسی غیر زرعی مزدوری میں لگے ہوئے تھے ان اعداد میں غیر زرعی ثانوی پیشوں کا حساب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں لگایا ان دیہات کے نظام کنبہ داری میں مشترکہ کنبہ داری کو معمولی حیثیت حاصل ہے تاہم یہ اپنے اجرا کے لیے زیادہ تر غیر زرعی اور امداد پر بھی منحصر ہے اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ مشترکہ کنبہ داری دیہات میں مکمل شہری رنگ پیدا ہونے کے بعد بھی باقی رہے گی۔ اغلب یہی ہے کہ باقی نہ رہے گی۔ عبوری دور میں اس کی موت جزوی طور پر انہی قوتوں کے باعث ملتوی ہوگئی ہے جنہیں عموماً اس کے خاتمے کا موجب سمجھا جاتا ہے۔

کفرل اور سین پارابتا کی شادی شدہ عورتوں کے بچوں کی تعداد کے اوسط میں بہت کم فرق ہے۔ ڈھاکہ شہر سے فاصلہ بھی اس پر کوئی مستقل اثر نہیں ڈالتا۔ البتہ شوہر کا پیشہ بچوں کی شرح پیدائش پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جن بیویوں کے شوہر زرعی پیشے کے ساتھ غیر زرعی پیشے میں مصروف ہیں ان کی شرح پیدائش خالص ایک یا دوسرے پیشے والے شہریوں سے زیادہ ہے لیکن پیشہ ور گروہوں کے درمیان یہ فرق صرف زراعت پیشہ گروہ کے سلسلے میں قابل توجہ ہے۔ اس لیے کہ بچے پیدا کرنے کی عمر کے اوقات میں شادی کی مدت کے لحاظ سے یہ شرح واضح طور پر توقع سے کمتر ہے۔ آمدنی بھی بظاہر بچوں کی پیدائش پر اثر انداز ہوتی ہے جن کی آمدنی کم ہے ان کے ہاں بچوں کی پیدائش ایک حد تک کم ہو جاتی ہے جن کی آمدنی زیادہ ہے ان کے ہاں ایک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ ان معلومات کو سامنے رکھ کر ایک سرسری نتیجہ نکل آتا ہے اور وہ یہ کہ شہری اثرات کے ماتحت کاشتکاروں کی معاشی اصلاح ہو جائے گی تو دیہاتی آبادی میں شرح پیدائش اس سطح سے ایک حد تک بڑھ جائے گی جس پر انتہائی مفلسی نے اسے پہنچا دیا ہے۔ ان دیہات میں شرح پیدائش کی کمی کا سراغ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا جسے عموماً شہری رنگ اختیار کرنے سے وابستہ کیا جاتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہری اثرات شرح پیدائش میں صرف بالواسطہ اور محدود درجے میں مؤثر ہوتے ہیں۔

شرح پیدائش کے ساتھ گہری وابستگی رکھنے والا مسئلہ شادی کی عمر کا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بچپن کی شادی خاندانی عمل کا ایک بنیادی جزو ہے اسے وہاں کی ثقافت میں گہرا جماؤ حاصل ہے۔ شہری ثقافت میں جو مغربی قدریں رائج ہیں وہ اس کی سخت مذمت کرتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شہری اور دیہاتی حلقوں میں ربط ضبط زود یا بدیر کشمکش کا ذریعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن جائے۔ اگر یہ کشمکش کسی نہ کسی حد تک موجود ہے تو اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ کسی بیرونی فرد کو دیہاتی بیوی کی نوجوان یا شادی کی عمر بتانے میں حد درجہ تامل کیا جاتا ہے کم از کم ایک تعصب ضرور موجودہ معلومات میں عمل پیرا رہا ہے۔ اس وجہ سے جو حقائق پیش کیے جا رہے ہیں وہ خاص توجہ کے محتاج ہیں اس لیے کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفرل اور سین پاراپاربتا میں بچپن کی شادی[1] کا رواج زیادہ ہے۔ پورے کفرل میں چودہ سال سے اوپر عمر کی ایک بھی عورت نہیں جو کم از کم ایک مرتبہ شادی نہ کر چکی ہو۔ سین پاراپاربتا میں ایسی چار عورتیں ملیں اور ان چاروں کی عمریں بیس سال سے کم تھیں۔ تیس سال سے کم عمر کی عورتوں کے متعلق جب یہ پوچھا گیا کہ ان کی شادیاں کب ہوئی تھیں تو معلوم ہوا کہ کفرل میں پیدائش سے تیس سال کی عمر تک اور سین پاراپاربتا میں تین سے بیس سال کی عمر تک شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان میں سے بعض شادیاں ہر اس کے اس عالم میں ہوئیں جو 1930ء میں شاردا ایکٹ کے نفاذ کے وقت پیدا ہوا تھا۔ شادی کے وقت عورتوں کا اوسط نکالا گیا تو کفرول میں 11.7 سال نکلا اور سین پاراپاربتا میں 11.1 سال چونکہ ان معلومات میں متعدد خامیاں ہیں اس وجہ سے اعداد یقیناً زیادہ نظر آتے ہیں اور یہ امر مشتبہ ہے کہ دیہات کے درمیان اختلاف قابل توجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ سن رسیدہ عورتوں نے شادی کے وقت عمر غلط بتائی کفرل میں غالباً یہ غلطی زیادہ ہوئی اس لیے سین پاراپاربتا کے بجائے بیرونی لوگوں کی روش کے متعلق کفرل والوں کو بظاہر زیادہ علم ہے۔ مختلف عمر کی عورتوں کے گروہوں میں شادی کی عمر کا اوسط، ان عورتوں کی عمر میں جواب زندہ ہیں، نہ زیادہ اونچا ہے نہ زیادہ نیچا ہے۔

شادی کے وقت مردوں کی عمر کا اوسط عورتوں سے ایک حد تک زیادہ ہے۔ کفرل میں یہ اوسط 19.4 سال ہے اور سین پاراپاربتا میں 19.6 سال۔ اگر مختلف عمر کے گروہوں کے لیے اوسط کا مقابلہ کیا جائے تو یہ اعداد کوئی خاص رجحان ظاہر نہیں کرتے۔ معلومات کے سلسلے میں وہی تعصبات یہاں بھی کام کرتے رہے۔ آج کل دیہات میں شادی کے وقت اوسط عمر مردوں کے لیے سترہ اور اٹھارہ سال کے درمیان اور عورتوں کے

[1] اس کتاب کی اشاعت کے وقت نافذ عائلی قوانین کا مقصد انہیں باتوں کو ختم کرنا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے دس سال ہے۔ جو شواہد ہمارے سامنے ہیں ان سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو سکے کہ دیہات میں شہری اثرات کے ماتحت شادی کی عمر میں کوئی تغیر ہوا۔

بچپن کی شادی کی طرح تعددِ ازدواج بھی مشرقی پاکستان کے دیہات میں عام ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ شہری ثقافت پھیلنے سے اس رسم پر کچھ اثر پڑے گا۔ شہری حلقوں میں مغربی ثقافت کے جو اثرات پھیلے وہ بھی ان دونوں چیزوں (بچپن کی شادی اور تعددِ ازدواج) کے یکساں خلاف ہیں اگرچہ تعلیم یافتہ شہری معاشرے کے بالائی حلقے میں تعددِ ازدواج کو سراسر ناپید قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تعددِ ازدواج ہر اس معاشرے میں بھی عموماً کم رہا ہے جہاں اس کا رواج ہے۔ اس کا سبب زیادہ تر اقتصادی تحدیدات ہیں لہٰذا اجنبی ثقافت کی مشتبہ اجتماعی قوت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر دیہات میں شہری رنگ پیدا ہونے سے لوگوں کا اقتصادی درجہ بلند ہوا تو ممکن ہے اس طرح دیہاتیوں کی زیادہ تعداد اس مجلسی تعیش سے مستفید ہو سکے۔ کفرل میں ایسی شادیوں کا تناسب کل کے مقابلے میں 14 فیصد ہے اور سین پاراپاربتا میں 12 فیصد۔ یہ اعداد ایسے نہیں جن کی بنا پر سمجھا جا سکے کہ یہ سلسلہ خود بخود کم ہو رہا ہے تاہم معلومات سے ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اقتصادی عوامل کو خاص حیثیت حاصل ہے۔ کفرل میں جو کاشتکار صرف کاشتکاری میں لگے ہوئے ہیں وہ عموماً متوسط درجے کی خوشحالی سے مستفید ہیں۔ ان کی شرح سین پاراپاربتا کے مقابلے میں بلند ہے۔ دونوں گاؤں میں زرعی مزدوروں اور غیر زرعی مزدوروں کو چونکہ کم معاوضہ ملتا ہے اس لیے ان کی شرح گاؤں کی اوسط سے نیچے ہے۔ اس کے مقابلے میں کاروباری خانہ داری اور ہنر مندی کے حلقوں میں یہ شرح عموماً اونچی ہے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں شہری اثر درجۂ معیشت بلند کرتا ہے وہاں تعددِ ازدواج میں بھی ایک حد تک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اضافہ کتنا ہوا ہے اور یہ کب تک جاری رہے گا۔

ان دیہات میں طلاق ذرا عمر رسیدہ عورتوں کے بجائے نوجوان عورتوں میں زیادہ ہے۔ بچپن کی زیادہ تر شادیاں طلاق پر ختم ہوئیں جبکہ بیویوں کی عمر چودہ یا پندرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ یعنی جب ان کے بچے بھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ دوسری شادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقابلتاً آسان ہے اور جن عورتوں کو جوانی میں طلاق مل جاتی ہے ان میں سے اکثر کو بہ آسانی دوسرے شوہر مل جاتے ہیں۔ اگرچہ طلاق کی زبانی مذمت بہت کی جاتی ہے لیکن یہ عام ہے اور جو اعداد یہاں دیئے جا رہے ہیں وہ یقیناً حقیقت سے کم ہیں۔ دونوں صنفوں کے جن لوگوں نے شادی کے بعد کم از کم ایک مرتبہ طلاق کے ذریعے سے مفارقت کی ان کا تناسب کفرل کے بجائے سین پاراپاربتا میں ذرا بلند ہے مثلاً کفرل میں مرد 20 فیصد اور سین پاراپاربتا میں 30 فیصد کفرل میں عورتیں 17 فیصد اور سین پاراپاربتا 20 فیصد۔ دیہات کے درمیان اختلاف زیادہ قابل توجہ نہیں۔ دونوں صنفوں میں جو فرق ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اطلاع دینے والے ہمیشہ شوہر تھے جو ممکن ہے وقتاً فوقتاً بعض واقعات کا ذکر کرنا بھول گئے ہوں یا انہیں علم ہی نہ ہو کہ ان کی بیویاں پہلے ہی ایک مرتبہ طلاق پا چکی تھیں۔ سین پاراپاربتا میں دو یا زیادہ طلاقوں کے واقعات کفرل کے مقابلے میں زیادہ پائے گئے اور عورتوں کے بجائے مردوں میں یہ واقعات زیادہ عام تھے لیکن ایسے واقعات کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ پیشوں کے لحاظ سے طلاق کی شرح میں اختلاف چنداں معنی خیز نہیں۔ مختصر یہ کہ شہری ربط وضبط طلاق پر بظاہر اثر انداز نہیں ہوا۔

احوال معیشت کی ناہمواری میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ خاندانی ثقافت کے نمونوں میں تبدیلیوں کے بجائے بیوگی میں زیادہ منعکس ہو سکتی ہیں البتہ خاندانی ثقافت کے نمونوں میں تبدیلیاں گھروں کے اندر بیویوں کے کام یا صحت کے حالات پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ امید یہ ہو سکتی ہے کہ شہری اوضاع اختیار کرنے کی وجہ سے پہلے مرد کارکنوں کے حالات بدلتے ہیں لیکن شہری اوضاع واطوار سے مردوں کے بجائے عورتوں کے لیے بیوگی کے مواقع زیادہ اثر پذیر ہو سکتے ہیں اور یہی حقیقت ہے۔ مردوں کے رنڈوے ہونے کی شرح دونوں دیہات میں عملاً یکساں ہے۔ کفرل میں 25 فیصد اور سین پاراپاربتا میں 26 فیصد اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہروں نے شہری روزگار کا بندوبست کر لیا تو بیویوں پر بہت کم اثر پڑا۔ ان کی کیفیت وہی رہی جو ہمیشہ سے چلی آتی تھی لیکن عورتوں کے لیے کفرل میں بیوہ ہونے کے مواقع بظاہر سین پاراپاربتا کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ سین پاربتا میں جن عورتوں کی شادی ہوئی ان میں سے کم از کم 28 فیصد ایک مرتبہ بیوہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرور ہوئیں۔ کفرل میں یہ شرح صرف 17 فیصد ہے۔ عمر کا معاملہ پیش نظر رکھے بغیر ان اعداد سے نتائج نکالنا خطرناک ہے۔ بہ ایں ہمہ بدیہی نتیجے کی تائید دوسری معلومات کرتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سین پارا پارتا میں اموات کی شرح بہ مقابلہ کفرل عموماً قدرے زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں عمر کی کوئی قید نہیں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ سین پاراپارتا میں بیواؤں کا ایک سے زیادہ مرتبہ شادی کرنا نسبتاً عام ہے۔ اس گاؤں کی بیواؤں کا بڑا حصہ دوسری مرتبہ شادی کر سکا۔ ایسی شادیوں کا تناسب سین پاراپارتا میں 46 فیصد اور کفرل میں 29 فیصد تھا۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ کفرل کے تناسب میں کمی آیا شہری اثر کی وجہ سے ثقافتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے؟ اگر واقعہ یہی ہے تو یہ امر قابل توجہ ہے کہ طلاق پائی ہوئی عورتوں کی دوبارہ شادی کا سلسلہ اس سے یوں متاثر نہیں ہوا۔ دونوں گاؤں میں 86 فیصد عورتوں نے جنہیں طلاق ہو چکی تھی' دوبارہ شادی کر لی اور جو عورتیں نہیں کر سکیں ان میں سے بھی زیادہ تر ضرور کر لیں گی۔ چونکہ بیوائیں مطلقہ عورتوں کے مقابلے میں عموماً زیادہ سن رسیدہ ہوتی ہیں خصوصاً ان دیہات میں جو زیادہ تر شہری حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس وجہ سے بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کی شرح بحیثیتِ مجموعی غالباً گھٹ رہی ہے۔ بلا شبہ بیوہ عورتوں کے لیے دوبارہ شادی کے اچھے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ان کا تناسب کم ہی رہے گا۔ جب تک نوجوان شوہروں کے کاروباری حالات زیادہ محفوظ اور بہتر نہ ہوں گے۔ پچاس سال سے زیادہ عمر کی بیوہ عورتوں کا تناسب سین پاراپارتا کے بجائے کفرل میں زیادہ ہے۔ کفرل میں 55 فیصد اور سین پاراپارتا میں 46 فیصد۔ ان حالات میں بیوگی پر شہری اثر بھی پڑتا ہے اور پیدائش نیز اموات کے عوامل پیش نظر رکھے جائیں تو عورتوں کے لیے بحالتِ بیوگی دوبارہ شادی ان کے شوہروں کی صحت و حیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

شہری ربط و ضبط سے دیہات میں مجلسی تبدیلیوں کی جو قوتیں پہنچیں خاندانی نظام ان کا خاصا مقابلہ کرتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صرف انہیں پہلوؤں میں تبدیلیاں ہوئیں جو شہری اثرات کے اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے۔ یہ تبدیلیاں بھی بہت معمولی حیثیت رکھتی تھیں لیکن عام بیانات سے ظاہر ہے کہ خاندان تو گردوپیش کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوتوں سے محفوظ رہے لیکن گاؤں کا مجلسی نظام عموماً اس پیمانے پر محفوظ نہ رہ سکا۔ پرانے باشندوں نے جن بعض تبدیلیوں کا ذکر کیا وہ معمولی تھیں بعض میں بلاشبہ مبالغہ سے کام لیا گیا تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کچھ نہ کچھ تغیرات ضرور ہوئے جن کی وجہ سے دیہات کے مجلسی تعلقات کی روایتی حیثیت خاصی بدل گئی۔

جو باشندے کفرل میں رہتے ہیں ان کے نزدیک تغیر کا پہلا بڑا دور اس وقت شروع ہوا جب ڈھاکہ میں فارم قائم کیا گیا۔ فارم کے قیام سے پیشوں میں تبدیلی ہوئی۔ اس طرح گاؤں کے نظام میں بڑے ردوبدل کی ضرورت پیش آ گئی ہوگی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حکومت نے دیہاتیوں کو زمین سے نکال کر فارم قائم کیا اور اس کے معاوضے میں روپیہ دیا تو یہ روپیہ کس طرح غیر دانشمندانہ طریق پر خرچ کیا گیا اور بعض حالتوں میں بہت سے لوگ خاصی خوشحالی کے بجائے قلاش بن گئے۔ چونکہ روزگار کے دوسرے وسیلے پیدا ہو گئے تھے اس وجہ سے دیہاتی زندگی پر وہ اقتدار بڑی حد تک کمزور ہو گیا جو دولت مند دیہاتیوں کو پہلے حاصل تھا۔ جو لوگ گرتے گرتے زرعی مزدوروں کے درجے پر پہنچ گئے وہ دیہاتی امیروں پر انحصار سے بچ نکلنے کے اہل بن گئے۔ چونکہ یہی لوگ دیہات میں رسمی یا غیر رسمی سربراہ سمجھے جاتے ہیں لہٰذا ان کا سیاسی اور مجلسی اقتدار اقتصادی اقتدار کے ساتھ ہی غالباً ختم ہو گیا۔ زیادہ تر دیہاتی خاندانوں کے لیے پہلے کی طرح زراعت کافی نہیں رہی لیکن شہری اقتصادیات پر انحصار سے دیہات پر انحصار بھی گھٹ گیا۔ گوناگوں پیشوں اور ان کی جلو میں چلنے والے اقتصادی انقلابوں کی وجہ سے بھی غریب و امیر میں مجلسی دوری بڑھ گئی۔ ساتھ ہی نئے مجلسی طبقات کا ایک حیران کن سلسلہ پیدا ہو گیا جس کے اضافی مجلسی مقام کا فوراً تعین نہیں کیا جا سکتا۔ نقل مکان کرنے والوں کی یورش نے بھی تنوع کا ایک نیا عنصر پیدا کر دیا۔ ابتدا میں صرف زراعت پیشہ لوگ اپنے ضلع کو چھوڑ کر کھیتی باڑی کے لیے نئی زمینوں کی تلاش میں باہر نکلتے تھے۔ ان کی آمد کے باعث گاؤں میں روزگار کے طریقوں کے اندر زیادہ تبدیلی پیدا نہ ہوسکتی تھی چونکہ محض خاندان ہی نہیں بلکہ خاندانوں کے جھنڈ ایک گاؤں سے اٹھ کر کفرل اور سین پارا پاربتا پہنچ گئے لہٰذا یہ تصور درست نہ ہوگا کہ نقل مکان کرنے والے لوگ ٹھیٹھ مغربی اصلاحات کے مطابق اپنے تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے روابط سے بالکل بے تعلق ہو چکے تھے اور ایک اجنبی فضا میں ایسے لوگوں کی حیثیت رکھتے تھے جن کی غرض صرف یہ تھی کہ روزگار پیدا کریں' ان پر کنٹرول بھی نہ ہوا اور ان کے بارے میں معین طور پر کچھ کہا بھی نہ جا سکے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی پہلی ثقافت بجنسہٖ لے آئے۔ نئے گاؤں میں اکٹھے آباد ہوئے' گویا جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ''میمن سنگھ'' اور چھوٹے چھوٹے ''ٹیپرا'' قائم کر لیے[1] اگرچہ ان کے رہنے سہنے کے طریقے اور عادات مقامی باشندوں جیسے ہی تھے لیکن ان کی مشترک ابتدا نے بظاہر انہیں پرانے دیہاتی خاندانوں سے الگ رکھا اور گاؤں کے اندر چھوٹے چھوٹے نئے طبقے پیدا ہو گئے۔ گاؤں والوں کے لیے وہ مخالفت کا مرکز بن گئے۔ اب تک گاؤں میں رہنے والے مقامی لوگوں کو یاد ہے کہ ان نو واردوں نے ایندھن کی تلاش میں پھل والے درخت تباہ کر دیئے' دیہاتی سرگرمیوں میں تعاون سے انکار کر دیا۔ خوشی کے دنوں میں بھی اپنے جھگڑے فراموش نہ کیے' لباس میں تبدیلیاں پیدا کیں اور گاؤں کی روایتی یکجہتی اور ہم آہنگی میں خلل ڈال دیا۔ جو امتیازات ان سے منسوب کیے جاتے ہیں بلاشبہ وہ سب ان کے پیدا کردہ نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ گاؤں کی آغوش اجنبیوں کے لیے غالباً بہ آسانی نہیں کھلتی۔ باہر سے آنے والے لوگ عموماً موردِ الزام بنتے ہیں اور گاؤں میں جو دشمنیاں دوسرے وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں ان کی ذمہ داری بھی انہیں غریبوں پر ڈالی جاتی ہے۔ وجہ کوئی ہو' باہر سے آنے والے لوگ گاؤں کے مجلسی نظام میں ایک نئے پہلو کا اضافہ کرتے ہیں اور تبدیلی کا ایک عنصر برسرکار آ جاتا ہے۔

اگر ایسے افتراق ان کاشتکاروں کے ذمے لگائے جا سکتے ہیں جو تیس سال پیشتر نقل مکان کر کے آئے تھے تو گاؤں کے پرانے باشندوں اور موجودہ دور کے غیر زرعی مہاجروں کے درمیان اختلاف زیادہ وسیع ہونا چاہیے' جن کے ساتھ ربط و ضبط کے

---

[1] میمن سنگھ اور ٹیپرا مشرقی بنگال کے دو ایسے ضلعے ہیں جو ضلع ڈھاکہ سے متصل ہیں اور جن کی آبادی بہت گھنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے ضلعے کے دیہات سے وہ لوگ اٹھے اور اجنبی مقامات پر اپنا تمدن اور اپنی معاشرت بھی لے گئے' گویا انہوں نے باہر جا کر اپنی پہلی حالت قائم رکھی۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امکانات بہت کم ہیں۔ نئے مہاجروں کے ساتھ تعلقات کی سرسری حیثیت کا اندازہ کرنا ہو تو ان تین بہاری مہاجر خاندانوں کا معاملہ پیش نظر رکھنا چاہیے جو ہماری تحقیق سے صرف چھ ماہ پیشتر گاؤں میں آباد ہوئے تھے۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد ان خاندانوں کے تین رئیسوں کے نام ان ہمسایوں کو بھی معلوم نہ تھے جو ایک سوگز کے اندر تھے۔ خود یہ لوگ دیہاتیوں اور اجنبیوں سے اتنے خوفزدہ تھے اور ان کے دل میں ایسا شک بیٹھا ہوا تھا کہ وہ کسی سے ملنے جلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ صورتحال ایسی تھی کہ یہ لوگ انتہائی گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کشیدگی کے واضح نشان دکھائی دیتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئے مہاجرین کی وجہ سے زیادہ خلل انگیز مجلسی انقلاب پیدا ہوسکتا ہے خصوصاً اس حالت میں کہ مہاجرین نہ محض غیر زراعت پیشہ ہوں بلکہ پناہ گیر ہوں اس قسم کے حالات میں انجذاب کا عمل بہت کم جاری ہوا اور گاؤں کے نظام یا روایت میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو اس عمل کو رضا کارانہ اور سہل بنا سکے۔

گاؤں کی پرانی آبادی کے جن لوگوں سے ہمیں معلومات حاصل ہوئیں ان کا کہنا یہ تھا کہ ماضی قریب میں وسیع مجلسی سرگرمیوں کی تعداد گھٹ گئی۔ وطن کے متعلق پرانی یادوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی میں میلوں اور عام اجتماعات کا سلسلہ زیادہ وسیع تھا۔ یہ مقامی ہنرمند لوگ کھیلوں کا بندوبست کرتے تھے۔ شادیوں اور دوسری تقریبات پر جو دعوتیں ہوتی تھیں وہ آج کل کی دعوتوں کے مقابلے میں زیادہ شاندار تھیں۔ اب دیہاتیوں کے درمیان زمینوں اور جائیدادوں کے متعلق جھگڑے زیادہ ہو گئے ہیں اور مقدمات میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ گاؤں میں جو باشندے نئے نئے آباد ہوئے ہیں انہیں نشوو ارتقا کی اسکیموں سے کوئی دلچسپی نہیں اور ان میں عمومی بہبود کے لیے جذبہ نہیں پایا جاتا۔ بڑوں کا ادب واحترام گھٹ گیا اور مسلمہ جماعتی لیڈروں کے اختیارات سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔ یہ ان شکایتوں کی فہرست ہے جو پرانے باشندے موجودہ نسل کے خلاف پیش کر رہے ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر شکایتوں کے متعلق سمجھا جا سکتا ہے کہ سن رسیدہ لوگوں کا طرز عمل اس دور کے متعلق عموماً یہی ہے جس نے اپنی میراث کا ایک حصہ ترک کر دیا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی ایسے گاؤں سے اس قسم کی شکایات کی فہرست حاصل کرنا ممکن نہیں جو شہری اثرات سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یقیناً کفرل اور سین پارا پاربتا میں اجتماعی عمل ختم نہیں ہوا۔ اس تحقیقات کے دوران میں دونوں دیہات کے بہت سے لوگوں نے ایک سڑک کے لیے زمین دی جو کفرل اور سین پارا پاربتا کے درمیان بننے والی تھی پھر سڑک کی ابتدائی دوستی کا کام اپنے ذمے لے لیا اور چاند نکل آنے کے بعد بھی عموماً کام کرتے رہتے تھے۔ اہل کفرل نے ایک درسگاہ کی تعمیر کے لیے روپیہ زمین اور لکڑی دی جب بڑے ستون بن گئے تو اس پر بڑی خوشیاں منائی گئیں اور گاؤں کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ یہ دونوں کوششیں گاؤں والوں نے کیں۔ پورا روپیہ اپنے پاس سے دیا اور گاؤں کے سربراہ ان کی تنظیم کر رہے تھے۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں جو چھ ہفتے کی اسی مدت میں رونما ہوئیں۔ اجتماعی تعاون کی زیادہ تر مثالیں جواب ہمارے سامنے ہیں وہ دراصل ان شہری قوتوں کا اجتماعی جواب ہیں جو باہر سے اثرانداز ہو رہی تھیں تاہم انہیں آگے بڑھانے اور منظّم کرنے کا سارا کام ان دیہاتی بزرگوں نے انجام دیا جو مدت سے وہاں رہتے تھے اور گاؤں کے ساتھ ان کا نہایت گہرا تعلق تھا۔ ایسے اجتماعی کاموں کی زیادہ تر مخالفت یا ان سے بڑی حد تک بے پروائی صرف وہ لوگ کرتے رہے جو باہر کے تھے اور ماضی قریب میں گاؤں کے اندر آباد ہوئے تھے یا پرانے خاندانوں کے وہ فرزند مخالفت اور بے پروائی پر عمل پیرا رہے جنہیں شہری ملازمتوں نے روایتی پیشے سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ برائیوں کا ماتم ایک حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

کفرل اور سین پارا پاربتا کی تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ چند سال کے اندر ڈھاکہ کی پھیلتی ہوئی صنعتیں تونگی اور میرپور کی سڑکوں کے ساتھ ساتھ بہت آگے بڑھ جائیں گی اور درمیانی زمین کارخانوں کے لیے لے لی جائے گی۔ ڈھاکہ کا فارم بھی انجام کار یہاں سے ہٹا لیا جائے گا۔ کاشتکار آہستہ آہستہ ناپید ہو جائیں گے۔ ممکن ہے صرف ان نشیبی زمینوں کے حاشیوں پر کاشتکاری کا تھوڑا سا سلسلہ باقی رہ جائے جو دونوں دیہات کے مغربی حصے کو جدا کرتی ہیں۔ یہاں پہلے مکان بنیں گے پھر کارخانے قائم ہو جائیں گے۔ آبادی پہلے دباؤ کے ماتحت چھوٹے حلقوں میں سمٹ آئے گی پھر شہر سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور کسی مقام پر منتقل ہو جائے گی۔

جب ان گاؤں کی مقامیت تباہ ہو جائے گی تو اس کے ساتھ پرانے مجلسی نظام کے آخری اثرات بھی مٹ جائیں گے' بعد کے باشندوں میں بہت سے لوگ صرف عارضی طور پر اس توقع پر سکونت رکھیں گے کہ شاید انہیں شہر میں ملازمت مل جائے۔ ان کی کوشش یہ ہوگی کہ یا تو صنعتی کام میں فروغ حاصل کریں یا ضرورت کے مطابق روپیہ جمع کر کے دور افتادہ گاؤں میں چلے جائیں۔ کفرل میں عارضی طور پر کرایہ دار کی حیثیت میں رہنے والے لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ کام کی تلاش میں ہیں۔ بلا شبہ یہ لوگ بڑھتے ہوئے سیل کے پیش خیموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سیل جیسے جیسے ترقی کرے گا گاؤں کی حیثیت لازماً ایسی صورت اختیار کر لے گی جو زیادہ پر پیچ اور بہت ناپائیدار ہوگی۔ جن لوگوں کو خطے سے کوئی وابستگی نہ ہوگی ان سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ ان مکانوں سے ربط وضبط رکھ سکیں گے جن کا مستقبل سراسر غیر یقینی ہے۔ ان کے گرد وپیش اور مجلسی حالات میں اصلاحات ضرور ہوں گی اور یہ اصلاحات باہر کے سول افسروں کے ایما پر عمل میں آئیں گی۔ جلد یا بہ دیر کوئی نہ کوئی شہری کوشش عمل میں آئے گی تا کہ موجودہ دور کی صنعتی نشو وارتقا کے لیے ضرورت کے مطابق اچھے کارکنوں کی بہم رسانی کا مستقل انتظام یقینی ہو جائے۔ اس اثنا میں گاؤں کے جو ابتدائی باشندے ان تبدیلیوں سے مطابقت کے اہل نہ ہوں گے وہ یا تو افلاس کا شکار ہو جائیں گے یا زمین اور مکانوں سے محروم ہو کر اپنے غیر معین طور طریقوں پر قائم رہیں گے جو لوگ باقی بچیں گے وہ شہری بن جائیں گے اور مستقل دیہاتی طریقوں کی جگہ معیشت کے شہری درجوں سے مطابق پیدا کر لیں گے۔

نتیجہ:

دیہاتی اور شہری ربط وضبط کے معاملے میں وہ گاؤں ایک انتہائی مثال ہے جو حاشیے پر آباد ہے' اس لیے کہ یہاں زندگی کے دیہاتی اور شہری طریقوں کے درمیان براہِ راست تصادم موجود ہے۔ جو دیہات زیادہ دور افتادہ ہیں ان میں شہری طور طریقوں کے مجلسی اثرات بہت کم ہیں اور ان اثرات کو دیہاتی زندگی کا تسلسل تباہ کیے بغیر جذب کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اقتصادی اثرات گاؤں کے مجلسی نظام کو قائم رکھنے میں معاون بن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے ہیں اس لیے کہ دورِ حاضر کے طور طریقے اختیار کرنے کے ساتھ ہی پیدائش وفوتیدگی کے تیز دباؤ میں عارضی طور پر کمی ہو جاتی ہے۔ جو دیہات عین حاشیے پر واقع ہیں وہاں ایسے اقتصادی فوائد کی زیادہ فراوانی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی مجلسی برہمی کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کفرل اور سین پارا پار بتا میں شہری طور طریقے اختیار کرنے کی جو قیمت ادا کی گئی اس میں وقتاً فوقتاً دیہاتی باشندوں کو اپنی جگہیں چھوڑنی پڑیں، مجلسی تعلقات میں بدنظمی پیدا ہوئی، باہر سے لوگوں کی آمد کے باعث دیہات کی وحدت کو نقصان پہنچا کھیتی باڑی میں روایتی ہنرمندیاں باقی نہ رہیں اور بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئیں جن کا تعین پوری طرح نہیں کیا جا سکتا نیز جن کی وجہ سے دیہاتیوں کے تحفظ پر برا اثر پڑا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تک خاندانی نظام میں کوئی خلل پیدا نہ ہوا۔ ہو سکتا ہے شہری طور طریقے کاملاً اختیار کر لیے جائیں لیکن بایں ہمہ عورتوں کے روایتی وظیفے یا دوسرے خاندانی تعلقات پر کوئی فوری اثر نہ پڑے۔ جو معلومات ہمارے سامنے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاؤں کا مجلسی نظام بدستور قائم رہتا ہے اور اس پر براہ راست اثر زبردست اقتصادی نیز پیدائش وفوتیدگی کی قوتوں سے پڑتا ہے لیکن مشرقی پاکستان میں تبدیلی کی رفتار تیز ہو رہی ہے اور بہت سے ادارے جو اس وقت تک صحیح سالم چلے آئے اب بہت جلد طوفان کی زد میں آ سکتے ہیں۔

سب سے آخر میں یہ کہ دیہاتی زندگی کے بیشتر پہلوؤں میں مجلسی تبدیلی ناگزیر ہے۔ سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انسانی مصارف کو مناسب حدود کے اندر رکھا جائے اور بنگالی معاشرے کے کسی ٹکڑے سے ایسا مطالبہ نہ کیا جائے جو اس کی بساط سے بہت باہر ہو چونکہ حاشیے پر رہنے والے لوگ سیاسی لحاظ سے ایک بے کار اقلیت ہوتے ہیں اس لیے ایک ایسے خطے میں ان کے مفاد نظر انداز کیے جا سکتے ہیں جہاں عوامی ہمدردی کے لیے دوسرے بہت سے مراکز موجود ہیں اور نقار خانے میں طوطی کی آواز اکثر سنی نہیں جاتی بایں ہمہ تعداد کے مقابلے میں ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ حاشیے کا رقبہ شہر کی ترقی کے ساتھ گھٹتا ضرور ہے مگر اس کا اثر بہت سے باشندوں پر باقی رہتا ہے جو بعد ازاں شہری کارکنوں کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ابتدا میں دیہات کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باشندے ہوتے ہیں جن کا تعلق زمین سے یکایک ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسرے وہ مہاجر ہوتے ہیں جو شہری زندگی کی ابتدائی عارضی آزمائش کے لیے حاشیے پر تھوڑی دیر کے لیے آباد ہو جاتے ہیں۔ اگر حاشیے کا یہ قیام ان دونوں گروہوں کے لیے انتشار انگیز تجربہ ثابت ہو تو شہر کو ایک ایسی آبادی ملے گی جو رہنے سہنے کے لحاظ سے اور عادات و خصائل میں غیر مستقل ہوگی۔ وہ غیر معقول خطرات اور ہر لحظہ بدلنے والے جذبات کا شکار رہے گی اسے کام پر لگایا جائے گا تو نااہل ثابت ہوگی۔ پولیس کو اس کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہوگی اور اسے جذب کرنا مشکل ہوگا۔ موجودہ زمانے کے صنعتی معاشرے کا حد درجہ مرتبط نظام اگر ایسے آدمیوں پر مشتمل ہو تو وہ ٹھیک ٹھیک عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ اس طرح ممکن ہے کہ ہر فرد اپنی فنی مصلحتوں کو حل کرنے کے سلسلے میں ان انسانی مصلحتوں سے شکست کھا جائے جو خود اس نے پیدا کیں۔

اس معمے کا حل یہ ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں مجلسی کاروبار کا ایک منصوبہ بنالیا جائے تاکہ ایک زرعی مجلسی نظام میں یکایک شہری طور طریقے رائج کرنے کے زیادہ تباہی خیز اثرات کو یا تو بالکل ختم کیا جاسکے یا کم از کم ان میں ایک حد تک ترمیم کرلی جائے۔ مؤثر مجلسی منصوبہ بندی کے لیے مجلسی چھان بین کا مؤثر پروگرام لازم ہے۔ مشرقی پاکستان میں ایسی چھان بین قریباً ناپید ہے۔ یونیسکو نے نرائن گنج کے حلقے میں صنعت و حرفت کے حالات کا جو مطالعہ حال میں مکمل کیا ہے اور جو ابھی تک سامنے نہیں آیا ایک امید افزا آغاز کا پتا دیتا ہے لیکن ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ ہونا چاہیے۔ ڈھاکہ' کھلنا' چاٹگام' چندر گونا اور متعدد دوسرے قصبوں نیز صنعتی مقاموں میں شہریت کے مختلف مراحل نظر آتے ہیں۔ ان سب کا تجزیہ لازم ہے اس کے بعد ہی پتا چل سکے گا کہ صوبے بھر میں عمل کی کیا کیفیت ہے۔ اس وقت مجلسی منصوبہ بندی کا کام انجام پاسکے گا جس میں ایک طرف قومی نشو و ارتقا کے تقاضے پیشِ نظر ہوں گے تو دوسری طرف دیہاتی آبادی کی بہبود سامنے رہے گی۔

○●○●○

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2

چاٹگام کے پہاڑی قبیلے

ڈینس اور لوسین برناٹ

جزیرہ نما کی وضع کا ایک ارضی ٹکڑا جو مشرقی پاکستان کے جنوب مشرق میں واقع ہے، دو ضلعوں پر مشتمل ہے، ایک چاٹگام اور دوسرا چاٹگام کا پہاڑی علاقہ۔ جو حصہ خلیج بنگال کے حاشیے پر واقع ہے وہاں مدت سے ماہی گیر اور تاجر آباد ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر بندرگاہ چاٹگام کے اردگرد رہتے ہیں۔ ساحل کے میدانی علاقے سے آگے منی پور کے رقبے کی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں جنہیں دریاؤں اور وادیوں نے جگہ جگہ سے قطع کر رکھا ہے۔ آباد علاقہ ضلع چاٹگام ہے جس کا نظم و نسق صوبے کے دوسرے اضلاع کی طرح ہوتا ہے لیکن وہ سطح مرتفع علاقہ جسے چاٹگام کا پہاڑی علاقہ کہا جاتا ہے، ایک مستقل انتظامی حلقہ ہے۔ یہاں زیادہ تر قبائلی لوگ آباد ہیں اور انہی کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہے۔

جنوب کی جانب دریائے ناف[1] بہتا ہے جو برمی ارکان کی طبعی سرحد بن گیا ہے۔ مشرقی اور شمالی سرحدوں پر لوشائی پہاڑیوں کا ضلع اور تری پورہ ریاست واقع ہیں۔ ان دونوں کا تعلق بھارت سے ہے۔ اگرچہ دریا اور پہاڑیاں آگے کے علاقوں کے ساتھ ربط وضبط میں بظاہر رکاوٹ کا باعث ہیں لیکن تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ

---

[1] NAPF۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو علاقے آج کل برما' بھارت اور پاکستان کہلاتے ہیں ان کے باشندوں کے درمیان پہلے بہت میل جول تھا۔ جنوب اور شمال کے پہاڑی قبیلے چاٹگام کے پہاڑی علاقے ہیں' ان بنگالیوں کے ساتھ ساتھ' جو میدانوں سے آئے تھے' یا ان مسلمان مہاجروں کے ساتھ جو بھارت سے یہاں پہنچے تھے' آباد ہو گئے۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آباد ہیں۔

ضلع میں آمدورفت کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ دریاؤں کے ساتھ ساتھ سفر بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ دریا پہاڑیوں اور جنگلوں کو کاٹتے ہوئے نکلے ہیں۔ مشرقی پہاڑیوں کی بلندی میں دریاؤں نے آبی راستوں کا ایک نہایت عمدہ جال تیار کر رکھا ہے۔ زیادہ تر دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہیں' پھر یہ مغرب کی جانب مڑ کر خلیج بنگال میں گر گئے ہیں۔ سب سے بڑا دریا' جو مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے' کرنافلی ہے۔ یہ بندرگاہ چاٹگام سے ذرا نیچے خلیج میں گرتا ہے اور چاٹگام اس کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ دوسرا دریا سنگو ہے جو ارکان کی سرحدی پہاڑیوں سے نکلا ہے۔ پہلے شمالی جانب بہتا ہوا بندرابن پہنچتا ہے پھر مغرب کی جانب مڑ کر دوہزاری کے پاس سے گزرتا ہوا خلیج میں گر جاتا ہے۔

ضلع میں سڑکیں بہت کم ہیں۔ صرف خشکی کے موسم میں جیپوں کے ذریعے سفر کیا جاتا ہے۔ بڑی سڑک وہ ہے جو چاٹگام سے رنگاماٹی جاتی ہے۔ یہی ضلع کا صدر مقام ہے۔ ایک سڑک شمالی جانب چلی جاتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اسے دوہزاری کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ جنوبی سمت میں مشرقی بنگال کی ریلوے لائن کا آخری مقام ہے۔[1]

سڑکوں اور دریاؤں کے علاوہ بے شمار پگڈنڈیاں ہیں جو مکانوں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے جھنڈوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔ بعض مقامات پر جنگل صاف کر کے چاول اور دوسری غذائی جنسوں کی کاشت کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ پگڈنڈیاں ان مقامات کو بھی باہم ملاتی ہیں۔ شاذ ہی کوئی ایسا گاؤں ملے گا جس میں دس سے زیادہ گھر ہوں اور گاؤں اکثر بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کا ضلع رقبے میں قریباً پانچ ہزار مربع میل ہے لیکن آبادی اڑھائی لاکھ سے تھوڑی ہی زیادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں

---

[1] اس کا نام اب پاکستان ایسٹرن ریلوے رکھ دیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آبادی کا پھیلاؤ ساٹھ نفوس فی مربع میل ہے۔ صوبے کے دوسرے اضلاع میں آبادی چارسو فی مربع میل سے پندرہ سو فی مربع میل تک ملے گی۔[1]

چاٹگام کے پہاڑی علاقے کی جو جنس سب سے زیادہ تجارت کے کام آتی ہے وہ بانس ہے، میدانی علاقوں کے لوگ کثیر تعداد میں بانس خریدتے ہیں، اس لیے کہ ان علاقوں کی ساری زمین زیر کاشت ہے جہاں پہلے کبھی جنگل ہوں گے۔ بانس بہت سے کام دیتا ہے۔ خصوصاً مکان اور دکانیں اسی سے بنتی ہیں۔ چند سال ہوئے چندر گونا میں دریائے کرنافلی کے کنارے ایک بہت بڑا کارخانہ بنایا گیا ہے جو بانس کی کثیر مقدار کاغذ سازی میں استعمال کر رہا ہے۔ جب یہ کارخانہ کاغذ سازی کی انتہائی حد پر پہنچ جائے گا تو اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس سے نہ صرف پاکستان کی مقامی ضروریات ہی پوری ہوں گی بلکہ فالتو کاغذ باہر بھی بھیجا جا سکے گا۔

پہاڑی لوگ یا تو خود بانس کاٹ کر دریا میں بہا دیتے ہیں اور یہ قریب ترین منڈی تک پہنچ جاتا ہے یا میدانی علاقے کے لوگوں کو اجازت دے دیتے ہیں کہ وہ ان کے ہاں آئیں اور ایک طے کردہ رقم کے مطابق بانسوں کی خاص مقدار کاٹ لیں۔ میدانی علاقے کے مشرقی پاکستانی تاجروں نے زیادہ تر مقامی منڈیوں یا بازاروں میں اپنے مرکز قائم کر لیے ہیں جہاں وہ کپڑا یا سستی مصنوعات بکثرت فروخت کرتے ہیں۔ تجارتی اغراض کے لیے ان کے ساتھ مسلسل تعلق نے ان پہاڑی لوگوں کے لباس اور عادات پر بھی خاص اثر ڈالا ہے۔ ان میں سے اکثر نے تھوڑی سی بنگالی سیکھ لی ہے۔ اگرچہ ان کے رہنے سہنے کے بنیادی طور طریقوں میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔

باشندے:

پہاڑی باشندوں اور بنگالیوں میں فرق بہت زیادہ ہے۔ مثلاً زبان کو سامنے رکھا جائے تو بنگالی زبان کا رشتہ پاک و ہند کے برعظیم کی بہت سی زبانوں سے ظاہر ہوتا ہے

---

[1] چاٹگام کے پہاڑی علاقے کا رقبہ پانچ ہزار سات سو مربع میل ہے اور اس کی آبادی دو لاکھ ستاسی ہزار چھ سو اٹھاسی نفوس بتائی جاتی ہے (ملاحظہ ہو پاکستان کی مردم شماری بابت 1951ء جلد سوم نقشہ نمبر 1)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن جو زبانیں پہاڑی قبیلے بولتے ہیں وہ اپنی اصل کے اعتبار سے تبتی بری ہیں۔ قریباً تین چوتھائی بنگالی مسلمان ہیں اور ایک چوتھائی ہندو۔ ان کے مقابلے میں پہاڑی علاقے کے باشندے یا تو بدھ ہیں یا مسیحی یا مظاہر پرست۔ البتہ ٹپیرا کے باشندے ہندو ہیں۔ ان پہاڑی لوگوں کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ابتدا میں جنوبی و مشرقی ایشیا سے نقل مکان کر کے آئے تھے۔ ممکن ہے کہ بعض جنوبی چین سے آئے ہوں۔

چاٹگام کے پہاڑی ضلع کا نظم ونسق ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں ہے جس کا صدر مقام رنگامائی ہے۔ اس ضلع کے تین سب ڈویژن ہیں۔ ہر سب ڈویژن میں ایک سب ڈویژنل افسر رہتا ہے۔ ایک کا صدر مقام رنگاماٹی ہے' دوسرے کا رام گڑھ' تیسرے کا بندرابن۔ ان سب ڈویژنوں میں تین سرکل ہیں۔ چکما' مانگ[1] اور بوہ مونگ۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قبیلوں کے بڑے گروہ یہی تین ہیں اور ہر ایک گروہ کا ایک موروثی سردار چلا آتا ہے۔ سب ڈویژنل افسر اور سرکل کا سردار بلحاظِ درجہ یکساں ہیں۔ لیکن ان کے منصب مختلف ہیں۔ سب ڈویژنل افسر صوبائی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تر انتظامی امور کی نگرانی کرتا ہے اور مختلف علاقوں کے درمیان تعاون کا ذمہ دار ہے۔ سرکل کا سردار قانون و امن کے قیام کا ذمہ دار ہے اور اپنے علاقے کے اندر محاصل جمع کرتا ہے' سرکلوں کو بہت سے موضعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر موضع کا ایک مقدم ہوتا ہے۔ پورے ضلع میں تین سو تہتر مواضع ہیں۔ ہر موضع میں قریباً دس گاؤں یا جھونپڑیوں کے جھنڈ شامل ہوتے ہیں۔ ان موضعوں کی حیثیت پاڑے کی سی ہوتی ہے اور ہر پاڑے کا سرپنچ ''کارباری'' کہلاتا ہے۔ ''مقدم'' اور ''کارباری'' کے منصب موروثی ہیں۔

زرعی زمین' دوکانوں' بازار کے کاروبار اور تمباکو پر خاص محصول عائد ہیں اور جو محصول قریباً سب سے لیا جاتا ہے وہ ''جھم'' (کاشت کاری) کہلاتا ہے۔ ہر گھرانے

---

[1] مانگ کے سرکل میں سردار کا منصب باپ سے بیٹے کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور بیٹی کی طرف بھی۔ وہاں ایک رانی سردار تھی جو 1952ء میں فوت ہوئی اور آخری وقت تک سردار رہی چکما کے سرکل میں باپ کی میراث صرف بیٹوں کو ملتی ہے۔ بوہ مانگ کے سرکل میں کسی حد تک گڑبڑ ہوئی اور حکومت پاکستان کو پہلے سردار کے مرد جانشینوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑا۔

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

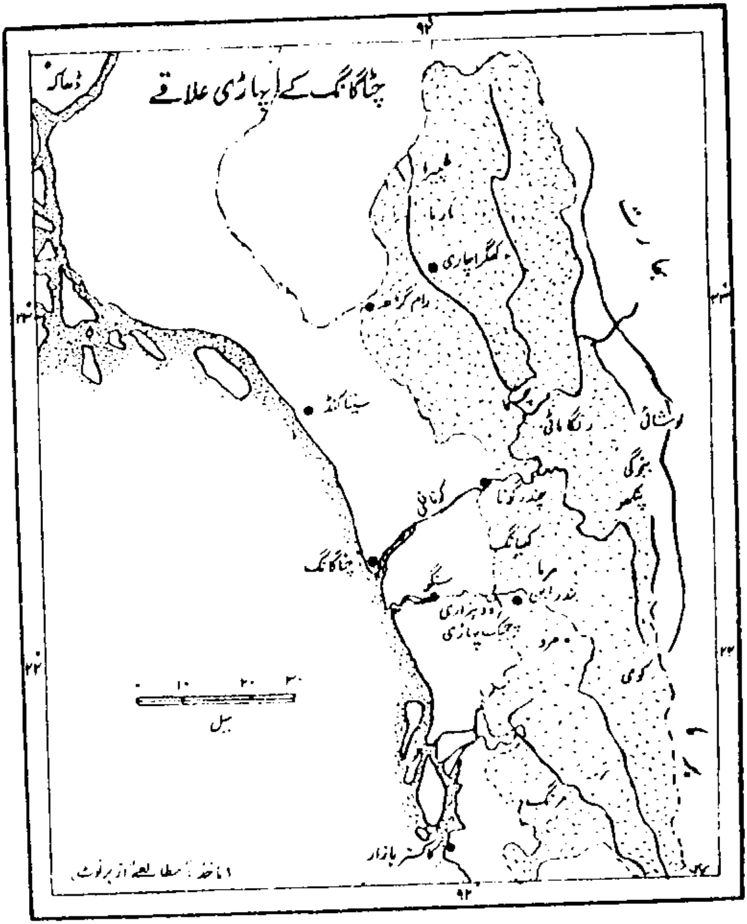

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے لازم ہے کہ چھ روپے سالانہ محصول ادا کرے۔ ساتھ ہی وہ روز مزدوری کی کوئی خدمت انجام دے جس کیلئے معمولی معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ ہر گھرانے کا ذمہ دار محصول کی رقم ''کارباری'' کے حوالے کرتا ہے۔ وہ پوری رقم مقدم کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ مقدم ایک تہائی اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دو تہائی سرکل کے سردار یا راجا کو پہنچا دیتا ہے۔ راجا بھی وصول شدہ رقم میں سے ایک تہائی اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دو تہائی سب ڈویژنل افسر کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ رقم دست بدست سرکاری خزانے میں پہنچ جاتی ہے۔

پہاڑی لوگ بہت سے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جو تعداد، اصل اور یکسانی کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ چھوٹے گروہوں میں بنجوگی پنکھو اور لوشی شامل ہیں۔ یہ سب مل کر غالباً پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے اور عام طور پر یہ چکما سرکل میں جمع ہیں۔ نظر بظاہر یہ لوگ اس علاقے کے قدیم ترین باشندوں کی اولاد ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض اب تک مظاہر پرست ہیں لیکن خاصی بڑی تعداد مسیحی بن چکی ہے۔ لوشیوں میں مسیحی اثر خاص طور پر بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی زبان بھی لاطینی حروف میں لکھنی شروع کر دی ہے۔

ایک اور چھوٹا سا گروہ کھیا تنگ کہلاتا ہے۔ یہ کوئی پانسو کے قریب ہیں اور بوہ مانگ کے سرکل میں آباد ہیں۔ یہ بھی اصل کے اعتبار سے برما کے ان لوگوں کے بھائی بند ہیں جو ''چن'' کہلاتے ہیں۔ ایچ-این-سی سٹیونسن کا بیان ہے کہ ''چن'' لوگوں نے اٹھارہویں صدی کے آخری حصے میں چاٹگام کی پہاڑیوں پر حملے شروع کیے۔ ان کی زبان جنوبی چن کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اس میں برما اور بنگالی کی اصطلاحات زیادہ شامل ہوگئی ہیں۔[1] یہ لوگ زیادہ تر بدھ ہیں اگرچہ ان میں سے بعض چندر گونا کے بپٹسٹ مشن کی زیر اثر مسیحی ہوگئے ہیں۔

ایک اور چھوٹا سا گروہ ''مرو'' کہلاتا ہے۔ یہ لوگ بوہ مانگ کے سرکل میں رہتے ہیں اور اکثر اپنے دیہات کی قلعہ بندیاں کر لیتے ہیں۔ لیون کی رائے ہے کہ یہ قبیلہ اراکان سے آیا تھا۔ لیکن ہچنسن کہتا ہے کہ یہ لوگ ضلع کے اصل قدیم باشندے ہیں۔ ان کی زبان

---

[1] ڈینز اور لوسین برناٹ کی فرانسیسی کتاب جو زیر طبع ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لکھی نہیں جاتی' البتہ اس گروہ کے بعض لوگ برمی اور بنگالی رسم الخط پڑھ سکتے ہیں۔

بوہ مانگ سرکل کے مرنگ اور مانگ سرکل کے ٹیپرا کی اصل بھی وہی ہے۔ اگر چہ اب ان کی طبقہ بندی الگ کرلی گئی ہے۔ٹیپرالوگ ٹیپرا کی پہاڑیوں سے جو شمال میں واقع ہیں آہستہ آہستہ جنوب کی طرف منتقل ہوئے۔مرنگ کے متعلق روایت یہ ہے کہ انہیں ایک اراکانی بادشاہ قید کر کے جبراً جنوب کی طرف لے آیا۔ان دونوں گروہوں کی زبان اور عام رسم ورواج یکساں ہیں۔اگر چہ ٹیپرا گروہ کے لوگوں میں ہندویت کا اثر زیادہ معلوم ہوتا۔

یہ تمام گروہ باہم رلتے ملتے گئے۔اب طبقہ بندی کی بنا پر انہیں قبیلے قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ انسانی ولسانی گروہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ان میں کوئی رسمی قبائلی تنظیم بھی نہیں پائی جاتی' البتہ ان کے خانوادے اور برادریاں قطعی طور پر مسلم ہیں کہ ان کے برعکس مرما اور چکما کی تعداد بھی زیادہ ہے اور وہ اس درجہ منظم ہیں کہ انہیں قبیلے کہا جاسکتا ہے۔

''مرما'' (جنہیں بعض اوقات مگھ کہا جاتا ہے) دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک گروہ مانگ کے سرکل میں رہتا ہے جس کے افراد کی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہوگی۔دوسرا گروہ بوہ مانگ کے سرکل میں مقیم ہے وہ کوئی پچاس ہزار کے قریب ہوگا۔چکما کے سرکل میں بھی چند ہزار مرما رہتے ہیں۔یہ لوگ اراکان سے آئے تھے اور بعض بیانات کے مطابق ممکن ہے مزید جنوبی علاقوں مثلاً تلانگ یا پیگو سے آئے ہوں۔اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری دور کی برمی اور انگریزی دستاویزوں میں بار بار مرماؤں کا ذکر آتا ہے۔بتایا گیا ہے کہ یہ پناہ گیر تھے تعداد بہت زیادہ تھی اور خاصے مفسد تھے۔اٹھارہویں صدی کے آخر میں برمیوں نے اراکان پر حملے شروع کیے تو وہاں کی دو تہائی آبادی بھاگ کر چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں پہنچ گئی۔

جو مرما آج کل مانگ کے سرکل میں رہتے ہیں وہ یہاں پناہ گیروں کے گروہوں میں سے ہیں جو 84-1783ء کے برمی حملوں میں اراکان سے باہر نکالے گئے۔یہ دریائے ماتاموری کے راستے آئے تھے۔پہلے کاکسز بازار کے آس پاس میدانوں میں جم کر بیٹھ گئے پھر 1787ء اور 1800ء کے درمیان شمال کی جناب سیتا کنڈ چلے گئے۔1826ء تک وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میدانوں کو چھوڑ کر اپنے موجودہ وطنوں میں یعنی پہاڑیوں کے اندر پہنچ گئے۔

مرما قبیلے کا جو گروہ جنوب میں رہتا ہے وہ مختلف راستے سے آیا تھا اور اس کے آنے کا زمانہ بھی مقدم ہے۔ 1599ء میں اراکان کے بادشاہ نے مرمیوں کی پیگو کی تسخیر میں مدد دی اور اس کے معاوضے میں اسے تلائنگ کے بہت سے قیدی مل گئے۔ ان میں شاہ پیگو کا بیٹا بھی تھا جسے بعد ازاں چاٹگام کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے قیدیوں کی بھی ایک تعداد آئی۔ اس شہزادے کی اولاد کئی نسل تک معمولی راجا کی حیثیت میں چاٹگام پر حکمراں رہی۔ جنوبی مرما قبیلے کا دعویٰ ہے کہ وہ لوگ ان تلائنگ حکمرانوں کی اولاد ہیں، لیکن اس دعویٰ میں شبہ بدیں وجہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ تلائنگ کی زبان سے بالکل ناواقف ہیں اور یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ زبان انہیں بالکل بھول گئی۔

بہ حالتِ موجودہ بوہ مانگ اور مانگ سرکل کے مرما نہایت پکے بدھ نیز مظاہر پرست ہیں ان کی زبان ایک اراکانی برمی بولی ہے جو عموماً برمی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ علاوہ بریں وہ اکثر بنگالی بولتے ہیں اور بعض بنگالی بھی لکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ انتظامی لحاظ سے وہ پاکستان کا حصہ ہیں لیکن وہ اپنی ثقافتی زندگی کا مرکز بدستور برما کو سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ وہ پاکستان کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے حکام سے ان کے تعلقات بڑے ہی خوشگوار ہیں۔

وہ اپنے آپ کو مرما کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ''برمی'' عام طور پر انہیں مگھ کہا جاتا ہے جسے وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اصطلاح بنگالی اور انگریزی میں ڈاکو اور بحری قزاق کے مترادف بن گئی ہے۔ ان دونوں گروہوں کے الگ الگ بادشاہ ہیں۔ شمالی گروہ کے زیادہ تر آدی پلنگسا جتھے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قبیلے کا بادشاہ مانگ کے سرکل کا سردار ہے۔ جنوبی گروہ کے زیادہ تر لوگوں کا تعلق وگر یسا جتھے کے ساتھ ہے اور ان کا بادشاہ بوہ مانگ سرکل کا رئیس ہے۔ جن چھوٹے گروہوں کا ذکر اوپر آچکا ہے ان کے برعکس مرما قبیلے کے لوگ ندیوں اور وادیوں کے قریب رہنے کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ بعض میدانی علاقوں میں آباد ہیں۔

چکما قبیلے کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بیان کی جاتی ہے۔ چاٹگام کے قبائلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گروہوں میں سے کسی پر بنگال کا اتنا اثر نہیں پڑا جتنا چکما قبیلے پر پڑا ہے۔ اگرچہ قدیم مخطوطات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں چکما زبان کے لیے برمی رسم الخط استعمال ہوتا تھا اور غالباً یہ برماہی کی ایک بولی تھی لیکن آج جو بولی عام ہے وہ بنگالی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ممکن ہے چکما قبیلہ بھی ان مرما پناہ گیروں کا ایک حصہ ہو جو اٹھارویں صدی کے آغاز میں نقل مکان کر کے آئے تھے لیکن خود چکما قبیلے کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ اصل میں ہندوستان کے چھتری تھے۔ اگرچہ وہ سرکاری طور پر بدھ لکھے جاتے ہیں لیکن ان کے درمیان ہندو یت بہت زیادہ ہردلعزیز ہے۔ مرما کی طرح یہ لوگ بھی وادیوں اور میدانوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں جو اور چھوٹے چھوٹے گروہ رہتے ہیں ان میں سے چک اور شنڈ ویا لکھیر بھی ہیں جن کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ اس علاقے میں آخر پُرامن حملہ آور بنگالی ہیں جو بڑے بڑے دیہات اور منڈیوں والے قصبوں میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے رہے۔ انہوں نے مکان بنائے دوکانیں تعمیر کیں اور مسجدیں یا مندر کھڑے کر لیے۔ 1947ء سے ہندوستان کے مسلمان مہاجروں کی بھی خاصی آبادی ہوگئی۔

کھیتی باڑی:

کھیتی باڑی کا عام طریقہ جھم کہلاتا ہے اور کھیتی باڑی کرنے والے کو جھومیا کہتے ہیں۔ دیہات کے آس پاس جو پہاڑیاں ہیں جنوری یا فروری کے مہینوں میں لوگ ان پر چڑھ جاتے ہیں' خاص جگہیں چن لیتے ہیں اور وہاں سے بانس اور درخت کاٹ دیتے ہیں کٹے ہوئے بانس اور درخت چند مہینے تک پڑے رہتے ہیں تاکہ سوکھ جائیں پھر انہیں جلا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد خاص سرگرمی کا دور شروع ہوتا ہے جس میں جھومیا کو اپنے کنبے کے ساتھ عارضی جھونپڑی بنا کر پہاڑی پر ہی رہنا پڑتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت زمین کی تیاری اور تخم ریزی میں صرف ہو' جو پودے یا جھاڑیاں جلنے سے رہ جاتی ہیں انہیں کھود کر باہر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ زمین صاف ہو جائے۔ یہ چیزیں عموماً کھیتوں کی باڑوں پر اکٹھی کر دی جاتی ہیں تاکہ ہمسایوں کے کھیتوں کے درمیان حد بندی کا نشان بنی رہیں۔

عورتیں داؤ یعنی ایک بڑے پھل والی چھری کی مدد سے زمین میں سوراخ کرتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور بیج ڈالتی جاتی ہیں۔ بہت سی قسموں کے بیج ٹوکریوں میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ تناسب یہ ہوتا ہے کہ دس حصے چاول میں ایک حصہ مکئی، تل، کپاس، کدو یا سرخ مرچ کے بیج ڈالے جاتے ہیں۔ بعض اوقات مکئی دوسری جنسوں سے پہلے بوئی جاتی ہے مئی کے اخیر یا جون کے شروع میں نلائی کی جاتی ہے اور فصل کاٹنے سے پہلے کم از کم دو مرتبہ نلائی ضرور ہوتی ہے۔ نلائی کے لیے چکما، مرما اور ٹپیر اداؤ استعمال کرتے ہیں۔

جس زمانے میں زمین کو کھیتی باڑی کے لیے تیار کیا جاتا ہے گاؤں بڑی حد تک خالی ہو جاتے ہیں۔ صرف چھوٹے بچے یا سن رسیدہ آدمی گھروں میں رہتے ہیں لیکن وقتاً فوقتاً دعوتیں اور دیوتاؤں کے لیے قربانیاں ہوتی ہیں۔ ان میں لوگوں کو اکٹھے ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ قربانیاں ایک ایک خاندان کے لیے بھی ہوتی ہیں اور بہت سے خاندانوں کے لیے بھی۔ بعض اوقات ایک گاؤں یا بہت سے دیہات کی طرف سے قربانی کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو نمک، مصالحوں اور بعض دوسری چیزوں کی خریداری کے لیے وقتاً فوقتاً بازار جانا پڑتا ہے۔ کوئی بیمار ہو جائے یا کسی کو مدد کی ضرورت پڑ جائے تو گاؤں کے لوگوں کے لیے باہم ملنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے۔

اگست کے مہینے میں جانور فصلوں کے لیے خطرے کا باعث ہو جاتے ہیں انہیں بھگانے کے لیے کئی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس غرض سے گھنٹیاں یا پیپے بجائے جاتے ہیں یا وقتاً فوقتاً آوازے لگاتے جاتے ہیں۔ پھندے اور زہر بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔ جانور تعداد میں زیادہ نہیں ہوتے لیکن ایک ریچھ پوری فصل برباد کر دیتا ہے۔ ستمبر میں فصل کی کٹائی شروع ہوتی ہے۔ کٹائی ایک دم نہیں کی جاتی بلکہ جو پودا پک جاتا ہے اسے کاٹ لیا جاتا ہے، دھان اس وقت کاٹے جاتے ہیں جب پک کر تیار ہو جاتے ہیں اور یہی طریقہ دوسری فصلوں کے تعلق میں استعمال ہوتا ہے۔ روئی سب سے بعد میں چنی جاتی ہے۔ نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں کٹی ہوئی فصل سے غلہ نکالا اور صاف کیا جاتا ہے۔

پہاڑی لوگ تمباکو بہت استعمال کرتے ہیں جنہوں نے باغ لگا رکھے ہیں وہ تمباکو بھی لگا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ روزانہ خاصی مقدار میں تمباکو پیا جاتا ہے۔ اس میں یا تو شیرہ ملا لیا جاتا ہے اور اسے حقے میں پیا جاتا ہے یا معمولی پائپوں میں پیتے ہیں یا سگار بنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیتے ہیں جیسے برمیوں کے چرٹ ہوتے ہیں۔

ہر سال کاشتکار کھیتی باڑی کے لیے زمین کا نیا ٹکڑا صاف کرتا ہے۔ اسی طرح جگہ جگہ کاشت ہوتی رہتی ہے اور جہاں ایک مرتبہ فصل ہو جاتی ہے اسے پانچ چھ سال کے لیے افتادہ چھوڑ دیا جاتا ہے' پھر اس میں کاشت ہوگی۔ زمین کو افتادہ چھوڑنے کی کوئی مدت مقرر نہیں۔ اگر غذائی اجناس کی ضرورت پڑ جائے تو کاشتکار پانچ چھ سال کی مدت کا انتظار نہیں کرتا بلکہ پیشتر ہی پہلی کاشتہ زمین میں کاشت شروع کر دیتا ہے۔

اگرچہ بظاہر زمین کے بڑے بڑے خطے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت پر نظر رکھی جائے تو چاٹگام کے پہاڑی علاقے کی آبادی قابل زراعت زمین کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ چونکہ کاشتکار اپنی خواہش کے مطابق کھیتی باڑی کے لیے جنگل کو تباہ کر دیتے تھے اس لیے حکومت نے ایک ہزار چار سو تیرہ مربع میل کا رقبہ محفوظ جنگل قرار دے دیا ہے جسے پہاڑی لوگ استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ پورے ضلع کا قریباً ایک تہائی حصہ ہے۔ چونکہ زمین پر دباؤ بڑھا ہوا اس لیے بعض اوقات پہاڑی لوگ جنگل کے نئے ٹکڑے صاف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ گاؤں کے آس پاس ہی رہنا پسند کرتے ہیں اور جو زمین ان کی دسترس میں ہوتی ہے اسی میں کاشت پر قناعت کر لیتے ہیں۔ پہاڑی علاقے کے لوگ جن خطوں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں ان خطوں پر ملکیت کی حیثیت وہ نہیں جو میدانوں میں ہے۔ مثلاً ان کی ملکیت کے رسمی وثیقے یا قانونی کاغذات نہیں مل سکتے۔ ہر شخص اردگرد باڑھ لگا لیتا ہے اور تمام لوگ اس باڑھ کا احترام کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی فصلوں پر جھگڑا ہو جائے یا کوئی شخص چوری کر لے' لیکن جب کوئی شخص کسی ٹکڑے میں کھیتی باڑی کا فیصلہ کر لیتا ہے تو دوسرا شخص اجازت کے بغیر اس میں داخل نہیں ہوتا۔

اس عارضی کاشت کے لیے چکما' مرما' ٹپیرا اور کھیانگ قبیلے کے بعض آدمیوں کے پاس دھان کی کاشت کے لیے سطح زمینیں بھی ہیں۔ ان میں کھیتی باڑی کے لیے بنگالی کسانوں کے سے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ لوگ دوسرے پہاڑی لوگوں کے مقابلے میں بنگالی زبان بھی زیادہ بولتے ہیں۔ میدانی علاقوں کے کسانوں کی طرح یہ بھی ہل چلاتے ہیں جسے آدمی یا بیل کھینچتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنگیزی وادی اور سانگو وادی کے زیریں حصے اس قسم کی کاشتکاری کے لیے بہت موزوں ہیں۔ یہ زمینیں ذاتی جائیداد میں متصور ہوتی ہیں اور مالک زمیندار کہلاتا ہے۔ ''کارباری'' یا مقدم کی حیثیت میں وہ کوئی انتظامی کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت بڑھ جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ روپیہ سود پر دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح قرضہ داروں اور ضرورت مندوں کا ایک گروہ اس کے اردگرد جمع ہو جاتا ہے۔ خانہ بدوشی کی عادتیں ترک کر دی گئی ہیں اور جو لوگ زیادہ دولت مند ہو گئے ہیں انہوں نے بانس کے مکانوں کی جگہ بنگالی ٹھیکداروں سے مٹی کے مکان بنوا لیے ہیں۔

اقتصادی نشو و ارتقا:

ضلعے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اول تو فنی سہولتیں میسر نہیں' دوسرے آمدورفت اور حمل و نقل کے ذرائع بہت کم ہیں لیکن حکومتِ پاکستان نے نشو و ارتقا کا ایک ایسا منصوبہ شروع کر دیا ہے جس سے خاصی اصلاح کی توقع ہے۔ 1952ء میں بجلی پیدا کرنے کے صرف تین نجی جنریٹر تھے جو تین سرکلوں کے سرداروں کے محلات میں لگے ہوئے تھے۔ ایک بڑا جنریٹر تھا جس سے رنگ متی کے قصبے کو ہر روز خاصے وقت کے لیے بجلی پہنچائی جاتی تھی۔ ٹیلی فون کی ایک لائن تھی جو رنگ متی میں ڈپٹی کمشنر کے مرکز کو چاٹگام سے ملاتی تھی۔

اب دریائے کرنافلی پر پن بجلی پیدا کرنے کا ایسا انتظام کر لیا گیا ہے جو چاٹگام کے پہاڑی خطوں کے بیشتر حصوں میں بجلی پہنچا سکے گا۔ آبیاری کے وسیع انتظامات دائرۂ امکان میں آ جائیں گے۔ اس طرح مقامی باشندوں کے مجلسی اور اقتصادی طور طریقے بالکل بدل جائیں گے۔ اغلب ہے صوبے کے دوسرے حصوں سے نقل مکان کر کے آنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ جائے اور انجام کار وہ پہاڑی لوگوں پر چھا جائیں۔ مٹی' لوہے اور لکڑی کی چیزیں بنانے کا فن پہاڑی قبیلوں خصوصاً ٹیپرا' چکما اور مرما کو آتا ہے' لیکن اس وقت یہ دستکاریاں کہیں نظر نہیں آتیں' مثلاً کمہار' لوہار یا بڑھی موجود نہیں۔ اگرچہ کسی علاقے کا کوئی بھی گاؤں ان پیشہ وروں سے خالی نہیں' تاہم تمام برتن یا اس قسم کی دوسری چیزیں میدانوں میں بنتی ہیں اور بازاروں میں بیچی جاتی ہیں۔ قریباً تمام بازاروں میں بنگالی لوہار موجود ہیں جو داؤ بناتے ہیں' مختلف اوزار تیز کرتے ہیں' مٹی کے تیل کے پرانے پیپوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ٹرنک بناتے ہیں۔ چھتریوں کی مرمت کرتے ہیں اور کبھی کبھی بندوقیں بھی درست کر دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی بانس سے کام لینے کی مہارت اب تک باقی ہے' لیکن بڑھئی کا زیادہ تر کام بنگالی انجام دیتے ہیں۔ پہلے کپڑا عام طور پر بنا جاتا تھا اور اب بھی قریباً ہر گھرانے میں بننے کا سامان موجود ہے' لیکن بازاروں میں کارخانوں کا بنا ہوا سستا کپڑا بہ کثرت ملتا ہے اور اس نے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی جگہ لے لی ہے۔ خرید و فروخت صرف بازاروں تک محدود نہیں' بعض بنگالی ٹوکریوں میں سامان لے کر گاؤں گاؤں پھرتے ہیں اور کپڑا' الارم والے کلاک' کنگھیاں' خوشبوئیں' نمک' مچھلی' چھتریاں یا چمچے' پلیٹیں' گلاس' پیالیاں' زیوارت نیز اس قسم کی دوسری چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ بازار کہیں کہیں سڑکوں کے نزدیک واقع ہیں یا دریاؤں کے قریب ضرور ہوں گے۔ تاکہ سامان بہ آسانی کشتیوں کے ذریعے سے وہاں پہنچایا جا سکے۔ ان کی تعداد تیزی سے بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیوس نے 1869ء میں لکھا تھا کہ پورے ضلع میں صرف چار بازار ہیں۔ 1952ء میں ایسے بازاروں کی تعداد اکتیس تھی۔ پانچ' چھ اور بازار زیر تعمیر تھے۔ دس یا زیادہ بازار بنانے کی تجویز ہو چکی تھی۔ بازار ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ مقررہ دنوں میں لگتا ہے۔ اردگرد کے پہاڑی لوگ میلوں کا فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچتے ہیں اور عموماً ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر بازار میں تیس سے پچاس تک دوکانیں ہوتی ہیں۔ دوکاندار زیادہ تر بنگالی ہیں' اگرچہ مرما اور چکما قبیلے کے بعض لوگوں نے بھی تجارت شروع کر دی ہے۔

دیہاتی زندگی:

چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں بنگالیوں کے داخل ہونے سے دیہاتی زندگی کے بنیادی طور طریقوں پر کوئی اثر نہیں پڑا اور آبادی میں زیادہ اختلاط بھی نہیں ہوا۔ تمام دیہات پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں کاروبار' ہیئت ترکیبی اور تنظیم کا انتہائی ربط ضبط موجود ہے۔ روایات دیہاتی زندگی میں اب بھی بہت اثر رکھتی ہیں' اگرچہ بیرونی اثرات کے باعث ان میں تھوڑی بہت ترمیم ہو چکی ہے۔ جونہی دن نکلتا ہے دیہات کو ملانے والے راستے آدمیوں' عورتوں اور بچوں سے پٹے ہوئے نظر آتے ہیں' البتہ کاشتکاری کے موسم میں یہ کیفیت نہیں ہوتی اس لیے کہ تمام سرگرمیاں پہاڑیوں کی چوٹیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک محدود ہو جاتی ہیں۔ عورتیں خصوصاً بہت مصروف ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ باہر سے پانی لاتی ہیں' کھانا پکاتی ہیں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اگرچہ خوراک بہت محدود ہوتی ہے' لیکن اسے پکانے میں بڑا وقت لگتا ہے اور خاصی محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ اگر گھر کے قریب سبزیاں بو رکھی ہوں تو عورت ہی ان کی خبرگیری کرتی ہے۔ بعض دیہات میں فرصت کے اوقات روئی کاتنے اور کپڑا بننے میں صرف ہوتے ہیں۔ گھر میں ایک نبیذ چاولوں سے تیار کی جاتی ہے جسے بوتلوں میں بھر لیا جاتا ہے' تاکہ خاص موقعوں پر اور مہمانوں کی آمد کے وقت اسے پیش کیا جاسکے۔ مرد اپنا وقت زیادہ آرام سے گزارتے ہیں جب موسم خشک ہو تو وہ بدھ مندروں میں چلے جاتے ہیں یا مردانہ بیٹھک والے مکانوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں حقہ یا چرٹ پیتے ہیں' نمکین چائے نوش کرتے ہیں' پان کھاتے ہیں اور لگاتار باتیں کرتے جاتے ہیں۔ البتہ برسات کے موسم میں انہیں کھیتوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور خاصے مصروف رہتے ہیں۔

ہر قبیلہ اپنے خاص لباس کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے گروہوں کے افراد کو بھی لباس ہی سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔ مختلف قبیلوں کے لباس کی بعض یکسانیتوں اور بعض اختلافات کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کب مختلف گروہ قریب قریب رہے اور کب ان میں کسی قسم کا قرب باقی نہ رہا۔ اس بنا پر لباس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر مرما قبیلے کی عورتیں ایک لہنگا پہنتی ہیں جو ایڑیوں تک پہنچتا ہے اور ایک بلاؤز استعمال کرتی ہیں۔ چند نسل پیشتر لہنگے کے رنگ سے چھوٹے چھوٹے قبیلے پہچانے جاسکتے تھے' مثلاً گریسیا قبیلے کی عورتیں ایسے لہنگے پہنتی تھیں جن کی سیاہ دھاریاں سرخ دھاریوں پر چھائی ہوئی نظر آتی تھیں اور ٹامیا قبیلے کی عورتیں جو لہنگے استعمال کرتی تھیں ان کی سیاہ دھاریوں کے درمیان باریک سفید دھاریاں ہوتی تھیں۔ پلنگ قبیلے کی عورتیں ایسے لہنگے پہنتی تھیں جن میں سرخی باقی رنگوں پر فائق ہوتی تھی۔ اب لہنگے کے کپڑے میں مختلف قسم کی دھاریاں ناپید ہو رہی ہیں' لیکن سرخ دھاریاں اب بھی ہوتی ہیں اور مرما قبیلے کی عورتیں انہی دھاریوں کی بنا پر پہچانی جاتی ہیں۔

مرد بھی عورتوں کی طرح ایک لمبا کرتا پہنتے ہیں لیکن اس میں رنگ کو کوئی خاص

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہمیت حاصل نہیں۔ وہ لمبی آستینوں والا کرتا بھی پہنتے ہیں جس کے بالائی حصے میں بٹن لگے ہوتے ہیں اور پگڑی بھی باندھتے ہیں۔ یہ لباس ویسا ہی ہے جس کا ذکر لیون نے اسی سال سے بھی زیادہ مدت پیشتر کیا تھا' اس سے ظاہر ہوا کہ وضع قطع میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

ٹپیرا قبیلے کی عورتیں گلے میں رنگین دانوں کا ہار پہنا کرتی تھیں اور اسی سے یہ قبیلہ پہچانا جاتا تھا لیکن اب ان پر پرانے ہاروں کی جگہ وہ ہار زیادہ رواج پا رہے ہیں جو بازاروں میں ملتے ہیں۔ رنگ قبیلے کی عورتیں کانوں کے زیور سے پہچانی جاتی ہیں۔ مرو قبیلے میں لہنگے کے حاشیے پر رنگ دار دانے لگا لیے جاتے تھے۔ اب یہ امتیازات ختم ہو رہے ہیں لیکن مختلف گروہوں میں ہنوز انہی کی بنا پر امتیاز ممکن ہے۔

ہر گروہ کے بالوں کا نمونہ بھی بالکل الگ الگ ہے مرما اور چکما کی عورتیں سر کے بالوں کا پیچھے کی طرف گدی پر جوڑا باندھتی ہیں' اگرچہ بعض ابھی تک برمیوں کے انداز میں اسے سر کے اوپر باندھتی ہیں۔ مردوں نے گزشتہ چند نسلوں سے بال کٹانے شروع کر دیئے ہیں۔ بن جوگی عورتیں بالوں کو سر کے اوپر باندھتی ہیں۔ پنگھو عورتیں بال سر کے پیچھے آراستہ کرتی ہیں۔ ان کے برعکس شنڈو کے مرد و زن اپنے سر کے بالوں کی گرہ پیشانی پر رکھتے ہیں۔ مرو قبیلے کی عورتیں سر کے بال پیچھے کی طرف باندھتی ہیں اور مرو مرد سر کے اوپر باندھتے ہیں۔ ان مردوں کے لیے بال کٹانا بہت سخت مجلسی انحراف سمجھا جاتا ہے۔ ایک مثال معلوم ہے۔ مرو قبیلے کا ایک آدمی چھوٹا سرکاری افسر بن گیا اور بنگالیوں کے زیر اثر آ کر اس نے بال کٹا لیے' نتیجہ یہ نکلا کہ قبیلے کے دوسرے لوگوں نے اپنے ہاں کی کسی لڑکی کو اس سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی جب تک اس نے از سر نو بال بڑھا نہ لیے۔

مرما اور ٹپیرا قبیلے میں سگوتی شادی (گوت کے اندر شادی) کا رواج ہے' البتہ مرما قبیلے کی بیوہ عورتوں کو اپنے سے نیچے کی گوت والے آدمی سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور ایسا آدمی عموماً عمر میں عورت سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مرو قبیلے کے درمیان لازم ہے کہ گوت سے باہر شادی کی جائے۔ مرما قبیلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ شوہروں اور بیویوں کے نسب ناموں کی خوب دیکھ بھال کی جائے کہ پیشروؤں میں سے کسی نے گوت سے باہر شادی تو نہیں کی تھی۔ مرما قبیلے کے آدمی ایسی چیز سے دور بھاگتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شوہر عموماً اپنی بیوی کی چھوٹی بہن (سالی) سے ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح بیوی شوہر کے چھوٹے بھائی (دیور) سے ہنسی مذاق کرتی رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیوی یا شوہر میں سے کوئی فوت ہو جائے تو بیوی اپنے دیور سے اور شوہر اپنی سالی سے شادی کر لیتا ہے' لیکن کوئی عورت اپنے شوہر کے بڑے بھائی سے کسی حال میں بھی شادی نہیں کر سکتی اور اس سے عموماً الگ تھلگ رہتی ہے' وہ آپس میں شاذ ہی بات کرتے ہیں اور ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نہ چھوئیں۔

شادی کی تقریب بڑی سادگی سے ادا کی جاتی ہے جس میں ایک دوسرے کو چند تحفے دیئے جاتے ہیں۔ عام تحفے دو ہیں' سؤر اور روپیہ۔ کوی قبیلے میں اب تک ایک سو برچھیوں کے جہیز کا رواج ہے' کھیا تگ قبیلے میں چوزے بطور جہیز دیئے جاتے ہیں۔ شوہر کی طرف سے ایک سؤر پیش کرنے کا طریقہ تمام قبیلوں میں عام ہے۔

گاؤں کے باشندے عموماً شادی کے ذریعے سے ایک دوسرے کے رشتہ دار بن جاتے ہیں' لیکن یہ لازم ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان تین پشت اوپر تک کوئی قریبی رشتہ نہ ہو۔ عموماً کارباری گاؤں کی بنیاد رکھتا ہے اور وہی اصل مرکز ہوتا ہے جس سے دوسرے وابستگی پیدا کرتے ہیں۔ مرما' مرو' کھیا تگ اور ٹپیرا قبیلے کے بہت سے گاؤں ایسے ہیں جن کی آبادی صرف دو گھرانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ سب ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ کارباری عام لوگوں کا سرپرست اور بالادست افسروں کا دیہاتی ترجمان ہوتا ہے۔ مرما اور چکما قبیلے میں اسی کو بدھ مندر کا ناظم سمجھا جاتا ہے۔ زیادہ تر وہی نئے افکار و اعمال اختیار کرتا ہے اور اسی پر زیادہ تر بنگالی اثر پڑ سکتا ہے۔

چکما قبیلے کے لوگ اپنی اصل زبان بھول چکے ہیں جو بولی اب بولتے ہیں وہ بنگالی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور بنگالی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہے۔ مرما نے اپنی اصل زبان قائم رکھی اور وہ رومن رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ لوشی کی اپنی زبان بھی برقرار ہے لیکن وہ لاطینی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے گروہوں مثلاً مرو' ٹپیرا اور کھیا تگ کی زبانیں لکھنے میں نہیں آتیں۔

بنگالی عموماً ثانوی زبان کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑتی ہے کہ تاجروں اور سرکاری افسروں کے ساتھ جو عموماً بنگالی ہوتے ہیں' ان کے لیے بات چیت کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ چکما اور مرما قبیلے کے لوگ زیادہ تر دریاؤں کے ساتھ نشیبی زمینوں میں رہتے ہیں۔ مرو کی بودوباش پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ہے۔ دوسرے گروہ بیچ میں جا بہ جا بکھرے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں چکما اور مرما ہی بنگالیوں اور دوسرے پہاڑی باشندوں کے درمیان واسطے اور وسیلے کا کام دیتے ہیں۔ اس لیے دوسرے قبیلوں نے بنگالی کے بجائے چکما یا مرما قبیلے کی زبانیں سیکھ لینا مفید سمجھا۔ خود چکما اور مرما کے لیے بیرونی لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے بنگالی سیکھنا فائدہ مند ہے۔ پہاڑی قبیلوں کے چھوٹے گروہوں کے درمیان مرما زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ ایک اراکانی بولی ہے جس کا تعلق لسانیات کے اس سرچشمے سے ہے جسے تبتی برمی کہتے ہیں' باقی پہاڑی بولیاں بھی اسی سرچشمے سے نکلی ہیں' لہٰذا اسے سیکھ لینا آسان ہے۔ چکما سیکھنا آسان نہیں اس لیے کہ وہ چاٹگام کی بنگالی بولی سے زیادہ قریب ہے۔

چونکہ مرما کا اپنے رسم الخط ہے اور انہوں نے اپنے سکول قائم کر رکھے ہیں' اس لیے دوسرے گروہوں کے مقابلے میں مرما زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کی عزت کی جاتی ہے۔ مرو' کھیانگ اور کومی' مرما قبیلے کے لوگوں پر بہت بھروسا رکھتے ہیں اور حکام تک اکثر انہی کو واسطہ بناتے ہیں' تاہم علاقے میں مجلسی اور اقتصادی نشوو ارتقا کا دباؤ آہستہ آہستہ لوگوں کو بیرونی باشندوں سے زیادہ گہرا تعلق پیدا کرنے کی طرف لا رہا ہے اور بنگالی زبان ان کے لیے روز افزوں اہمیت حاصل کر رہی ہے' چونکہ انگریزی زبان بھی خاصی حد تک استعمال کی جاتی ہے اس لیے مطلب یہ ہوا کہ کم از کم خط کے تین طریقوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ برمی' بنگالی اور لاطینی......اور کم از کم یہ زبانیں سیکھنا بھی ضروری ہے۔ جب سیاسی لیڈر اس امر پر زور دے رہے تھے کہ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان مانا جائے تو تھوڑی مدت تک یہ کہا جاتا رہا کہ ایک چوتھے رسم الخط کا اضافہ ہو جائے گا۔

زیادہ زبانوں کے استعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دوسری زبان سے الفاظ مستعار لے لیے گئے' مثلاً اوزار اور مصنوعات کے بہت سے انگریزی اور بنگالی نام قبائلی زبانوں میں داخل ہو گئے' بعض پھلوں اور سبزیوں کے نام بھی اصلاً اجنبی ہیں۔ مرما قبیلے کے لوگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹماٹر کو بلیتی کرنگ کیوسی (میٹھا یورپی پھل) کہتے ہیں۔ انگریزی وزن اور پیمانے عموماً اختیار کر لیے گئے ہیں اور ان کے نام بھی وہی رہے ہے۔ بعض اوقات لفظ بالواسطہ منتقل ہو جاتے ہیں' مثلاً انگریزی زبان کا لفظ ٹیبل (میز) بنگالی زبان میں ٹیبل اور مرما زبان میں ٹیبلی بن گیا۔ اسی طرح گلاس کو گلوئی کہنے لگے یعنی اس کے آخری حصے کا تلفظ بدل گیا۔ بری زبان کی طرح مرما زبان میں بھی اگر آخری حرف صحیح ہو اور وہ ناک سے نہ بولا جانے والا ہو تو تلفظ میں نہیں آتا' بلکہ یا تو اسے بالکل دبا دیا جاتا ہے یا اس کے پیچھے کوئی حرفِ علت لگا دیا جاتا ہے' مثلاً ٹیبلی۔

ضلع بھر میں قریباً تیس پرائمری مدرسے ہیں جو بڑے بازاروں کے نزدیک واقع ہیں ان کی عمارتیں مٹی کی ہیں اور یہ دیہات کے عام مکانوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہیں۔ مدرسوں میں لکڑی کے بنچوں اور میزیں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ بھی دیہاتی گھرانوں کے عام طور طریقوں سے مختلف ہے' اس لیے کہ دیہاتی گھروں میں عموماً کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ بنگالی زبان ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور مدرس زیادہ تر بنگالی ہیں۔ اگرچہ بعض مدرس چکما' مرما اور ٹپیرا قبیلے کے بھی ہیں۔ رنگ متی میں ایک ثانوی مدرسہ ہے جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے۔

ان مدرسوں میں زیادہ تر طالب علم مقدموں یا کاریوں کے بچے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ عام دیہاتی بچوں کی تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ چونکہ مدرسے بڑے بڑے دیہات کے نزدیک واقع ہیں' اس لیے اگر دوسرے دیہات سے بچے پڑھنے کے لیے آئیں تو ضروری ہے کہ ان کے لیے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا خاص انتظام کیا جائے۔ باقی رہا چاٹگام یا دارجلینگ بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنا تو ان کا خرچ وہی لوگ برداشت کر سکتے ہیں جو بہت دولت مند ہیں عموماً سرکل کے سرداروں یا راجاؤں کے تین ہی گھرانوں کے بچے اس تعلیم سے مستفید ہوتے ہیں۔

مرما قبیلے کے دیہات میں بدھ مندروں کے ساتھ بھی مدرسے بنے ہوئے ہیں جہاں پردہت بچوں کو پڑھنا اور برمی حروف میں لکھنا سکھاتے ہیں۔ وہاں بچے پالی زبان میں بعض دعائیں بھی سیکھتے ہیں۔ بدھ مت کے ان مدرسوں کو "کیونگ" کہتے ہیں۔ یہ سرکاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدرسوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ قریباً ہر مرد گاؤں میں ایک ایسا مدرسہ ضرور ہوتا ہے جو اونچی زمین پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ عمارت گاؤں کی عام جھونپڑیوں کی مانند ہی ہوتی ہے، یعنی کھمبے کھڑے کر کے بانس کی چھت ڈال دی جاتی ہے، لیکن ان مدرسوں کی وضع قطع عام جھونپڑیوں سے مختلف ہوتی ہے۔ چونکہ ان مدرسوں میں کوئی فرنیچر نہیں ہوتا اس لیے بچے پڑھتے پڑھتے فرش ہی پر استراحت کے لیے سہارا سا لے لیتے ہیں۔ لڑکیوں کو ان مدرسوں میں داخل نہیں کیا جاتا اور وہ بیچاری شاذ ہی گھر پر تعلیم پاتی ہیں۔ بدھ پروہت تعلیم کے لیے کوئی فیس وصول نہیں کرتے، لیکن بچے عام خدمات انجام دیتے رہتے ہیں، مثلاً وہ پانی اور ایندھن لاتے ہیں، مدرسہ صاف کرتے ہیں، صبح کے وقت پروہت کے لیے کھانا لاتے ہیں اور عبادت کے اوقات میں گھنٹیاں اور جھانجنے بجاتے ہیں۔ بدھ طلبہ کا عام دستور یہ ہے کہ کھانے کی چیزیں مانگ کر لائیں، چنانچہ وہ صبح اٹھ کر گاؤں میں مانگنے کے لیے گھر گھر جاتے ہیں اور اپنے برتن کھانے کی چیزوں سے بھر کر لوٹتے ہیں۔ ہر گھر سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے جن بچوں کی عمر ذرا زیادہ ہوتی ہے وہ گوشہ نشینی کے لیے کچھ وقت مدرسے میں گزارتے ہیں۔ بدھوں کے لیے گوشہ نشینی لازم ہے۔ اس اثنا میں وہ پالی زبان کی کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن باقی کاموں میں چھوٹے بچے بھی شریک رہتے ہیں۔ جن لوگوں میں خانقاہی زندگی کی طرف رغبت پائی جاتی ہے، وہ ان مدرسوں میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ بعض لوگ جنہیں بدھ دھرم سے خاص دلچسپی ہوتی ہے وہ بڑے بڑے مندروں یا خانقاہوں میں چلے جاتے ہیں اور خاصی مدت وہاں تعلیم صرف کر دیتے ہیں۔ آخر کار پروہت بن جاتے ہیں۔

چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں خواندگی کا دائرہ بہت محدود ہے عام لوگوں کو روزمرہ کے حالات اور بیرونی دنیا کے معاملات کے متعلق بہت کم علم ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض پہاڑی لوگ بری زبان پڑھ سکتے ہیں لیکن کوئی بری اخبار ضلع میں نہیں پہنچتا۔ البتہ بنگالی اخبار اور اردو زبان کے چند پرچے آ جاتے ہیں لیکن یہ صرف سرکاری افسروں، ٹھیکیداروں اور تاجروں کے مطالعے میں آتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت سے انگریزی زبان کے جو اخبار نکلتے ہیں وہ بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں، لیکن ان کا دائرہ صرف بڑے بڑے قصبوں تک محدود ہے۔ پہاڑی لوگوں میں باقاعدہ اخبار پڑھنے والے لوگوں کی تعداد ہرگز قابل توجہ نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ اور جغرافیے کے متعلق بھی بے خبری بہت زیادہ ہے۔ ایک تصور یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان تمام یورپی باشندوں کی زبان ہے' نیز انگلستان اور یورپ ایک ہی چیز ہیں۔ اسکولوں میں زیادہ وقت ان زبانوں کی تعلیم کے لیے صرف کیا جاتا ہے جن کی فوری ضرورت پڑتی رہتی ہے لیکن معلومات حاصل کرنے کا شوق بہت پایا جاتا ہے۔ خصوصاً جو چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدیدار مثلاً مقدم یا کاروباری ہیں وہ اپنی پہاڑیوں سے باہر کی دنیا کے لیے بڑے شوق کا اظہار کرتے ہیں اور دور افتادہ مقامات کی تصویروں کے لیے ان میں خاصی کشش ہے۔ جب وہ بازار سے چیزیں خریدتے ہیں اور یہ چیزیں اخباری کاغذوں میں لپٹی ہوئی آتی ہیں تو ان کاغذوں میں سے اکثر تصویریں کاٹ لیتے ہیں اور اپنے گھروں کی دیواروں پر لگا لیتے ہیں پھر ہر تصویر کو بغور دیکھتے ہیں تاکہ بیرونی دنیا کے متعلق زیادہ صحیح تصور قائم کیا جا سکے۔ ایک مثال ایسی بھی ملی کہ ایک مقدم کے گھر میں ملوا کی[1] بیئر کا اشتہار لٹک رہا تھا جو لائف میگزین سے کاٹا گیا تھا۔ اسے یورپ اور امریکہ کے طریق بود و ماند کی ایک شاندار نمائش سمجھا جاتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ جن لوگوں کی تصویریں اس مرقعے میں آئی ہیں وہ ضرور بہت بڑے رئیس ہوں گے۔

تفریح کا حد درجہ عام ذریعہ ناٹک کے کھیل ہیں اور انہی کو تعلیم کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ کھیل عموماً رات بھر جاری رہتا ہے اور دور و نزدیک سے لوگ بڑی تعداد میں دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ باہر ایک سٹیج بنائی جاتی ہے اور کھیل کھلے میدان میں شروع ہوتا ہے۔ حاضرین باتیں بھی کرتے ہیں اور حقہ بھی پیتے ہیں' عورتیں بھی دیکھنے کے لیے آ جاتی ہیں۔ ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی جاتی ہیں۔ گھر کے تمام لوگ کھیل دیکھنے کے لیے آ جاتے ہیں اور عموماً زمین پر سو جاتے ہیں۔

دیہاتی لوگ خود بھی ان کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں' خصوصاً مرما قبیلے کے لوگ جن کے ہر بڑے گاؤں میں اداکاروں کی ایک جماعت ہوتی ہے اور اس میں تمام نوجوان شریک ہوتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی تقریریں یاد کر لیتے ہیں اور گھنٹوں ایک انداز میں بولتے

---

[1] Milwaukee جمہوریہ امریکہ کا ایک شہر جھیل مشی گن کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ وہاں کی بیئر بہت مشہور ہے۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چلے جاتے ہیں۔ اب یہ رسم گھٹتی جا رہی ہے اور زیادہ تر کھیل بنگالی اداکار دکھاتے ہیں۔ تفریحات کا ایک خاص وقت ہوتا ہے جب کھیتی باڑی کا محصول وصول کیا جاتا ہے۔ سرکل کا سردار یا راجہ ایک بہت بڑے جشن عام کا انتظام کرتا ہے جس میں باہر سے بنگالی اداکاروں کو بلایا جاتا ہے' تاکہ وہ کھیل دکھائیں مقامی اداکاروں پر انحصار نہیں کیا جاتا۔ تھیٹروں کے ساتھ عام طور پر گانے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ موسیقی کے آلات وہی استعمال کیے جاتے ہیں جو بنگالیوں کے ہاں مستعمل ہیں۔ مرما قبیلے کے لوگ برمی آلات اور ستار استعمال کرتے تھے' لیکن اب ان کا رواج نہیں رہا۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں جو ستار استعمال ہوتے ہیں اُن میں سے بہت تھوڑے باقی رہ گئے اور ایک اب پیرس کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے برعکس مرو قبیلہ اپنے ہی آلات استعمال کرتا ہے اور اس کے رقص بھی اپنے ہی ہیں۔

جنوبی مرما قبیلے نے اپنے بعض تال سر اب تک قائم رکھے ہیں اور ان کی حیثیت بالکل یگانہ ہے۔ رزمیہ گیتوں اور عشقیہ گیتوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک عشقیہ گیت ایسا بھی ہے جس میں گانے والا پنکھا ہلاتا جاتا ہے۔ لوری کے گیتوں اور مذہبی گانوں کے خاص سر ہیں۔ بڑے بڑے دیہات میں فوٹوگراف بھی ناپید نہیں۔ برمی' بھارتی اور انگریزی ریکارڈ بھی محدود تعداد میں ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے دیکھا کہ بندرابن کے بڑے مدرسے میں ایک مذہبی تقریب میں گراموفون بج رہا ہے اور امریکہ کے گلہ بانوں کا گیت گایا جا رہا ہے۔ پروہت' مرمی' برمی اور پالی زبانیں جانتا تھا مگر انگریزی نہیں جانتا تھا' حاضرین انگریزی نہیں سمجھتے تھے اور انہیں انگریزی الفاظ پر کوئی توجہ نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مرما قبیلے کے لوگوں کے لیے صرف سر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سر ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گیت کا موضوع محبت ہے یا افسانہ یا مذہب۔ اس گیت کا سر بالکل اجنبی تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ یہ مذہبی تقریب کے لیے بالکل موزوں ہے۔

شمالی مرما قبیلے میں بھی اپنے گیت گائے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ گیت جو جھم کاشتکاری کے موسم میں لڑکے اور لڑکیاں مل کر گاتے ہیں۔ گانے کے ساتھ ایک آلہ بھی استعمال کیا جاتا تھا جو یہودیوں کے بربط سے مشابہ تھا۔ یہ بانس کا بنا ہوا تھا۔ اب جرمنی سے دھات سے بنے ہوئے آلے آ رہے ہیں اور بازاروں میں ملتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتیجہ:

رہن سہن کے بنگالی طور طریقوں اور رسم ورواج نے قبائلی معاشرے اور ثقافت کے لیے خاصا خطرہ پیدا کر دیا ہے وہ لوگ اب تک اپنی روایتوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں' لیکن بنگالی ثقافت اور یورپ و امریکہ کی ثقافت کے جو عناصر پہنچ گئے ہیں وہ نئے اور جاذب ہیں۔ اس پر آبادی کا دباؤ مستزاد ہے۔ اگر چہ چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں اکثریت پہاڑی لوگوں ہی کی ہے' لیکن صوبے بھر کی چار کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ آبادی میں پہاڑی لوگوں کی تعداد اڑھائی لاکھ سے بھی کم ہے۔ اگر وہ دوسرے اضلاع سے آبادی وہاں پہنچنے لگی جس کا زیادہ امکان ہے تو پہاڑی لوگ غالباً اس آبادی میں یوں جذب ہو جائیں گے کہ ان کی مستقل حیثیت باقی نہ رہے گی یا وہ نکال باہر کیے جائیں گے۔

پہاڑی لوگوں میں سے جو اعلیٰ تعلیم پا چکے ہیں ان کے نزدیک بنگالی ثقافت کا خطرہ ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ اس ثقافت کے ردعمل نے مختلف صورتیں اختیار کیں اور ہم ان کے نمونے تین علاقوں کے سرداروں کے بیٹوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ تینوں نے مقامی دفتری حکومت میں بڑے اہم عہدے حاصل کر لیے۔ ان میں سے ایک عزم و ارادے کے ساتھ بنگال کی جانب جھک گیا اور اس نے تمام بنگالی رسمیں اختیار کیں اور ہم ان کے نمونے تین علاقوں کے سرداروں کے بیٹوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ تینوں نے مقامی دفتری حکومت میں بڑے اہم عہدے حاصل کر لیے۔ ان میں سے ایک عزم و ارادے کے ساتھ بنگال کی جانب جھک گیا اور اس نے تمام بنگالی رسمیں اختیار کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا اپنی قبائلی روایات پر نازاں رہا اور مضبوطی سے ان پر جما ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ ملک چھوڑ کر رنگون چلا جائے تیسرے نے بنگالی اور قبائلی روایات میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ ترکیب انجام کار پائیدار ثابت ہوگی لیکن جن مثالوں کا ہمیں علم ہے ان سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی روایات پر بنیادی حیثیت میں قائم رہتے ہوئے بعض بنگالی اثرات قبول کر لیے وہ پیش رو بن گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3

پنجاب کی دیہاتی زندگی

(زکیہ ایگلر)

پنجاب کے معنی ہیں پانچ دریاؤں یعنی ستلج' بیاس' راوی' چناب اور جہلم کی زمین۔ بیاس اب بھارت میں چلا گیا ہے باقی چار دریا مغربی پاکستان ہی میں ہیں۔ ان میں سے تین کے سرچشمے کشمیر میں واقع ہیں اور یہ سب دریا سندھ میں مل جاتے ہیں جو بحیرۂ عرب میں گرتا ہے۔ یہ علاقہ اصل میں زرعی ہے اور قیام پاکستان سے پیشتر اسے بھارت کا اناج گھر ہونے کی شہرت حاصل تھی۔ زمین کی زرخیزی کا بڑا ذریعہ نہروں کا جال ہے جو مختلف دریاؤں سے نکالی گئی ہیں اور دنیا بھر میں نہری آبیاری کے جتنے اعلیٰ نظام موجود ہیں' ان میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ زمین کا نظام صوبے کے نظم ونسق کی ایک حد درجہ منظم شاخ ہے۔

یہ علاقہ اپنے عشقیہ لوک گیتوں' زمین اور رزمیہ نظموں کے لیے مشہور ہے۔ پنجابی زبان بڑی بلیغ ہے۔ جب بولی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اس کی بہت سی بولیاں ہیں جنہیں پس نظر رکھتے ہوئے اس پنجابی مثل کی تصدیق ہوتی ہے کہ زبان ہر پندرہ میل کے بعد بدل جاتی ہے۔

نظم ونسق' تجارت اور تعلیم کے اعتبار سے پنجاب پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ ہے۔ البتہ کراچی کو مستثنیٰ کر لینا ضروری ہے۔ یہ صدیوں سے آباد چلا آتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور یہاں ایک ایسا معاشرہ موجود ہے جسے بڑی خوبی سے منظم کر لیا گیا ہے۔ مجلسی اور پیشہ ور گروہوں کے درمیان واضح امتیازات موجود ہیں۔ مزدوروں میں تقسیم کار پر عمل ہے۔ تفریح کے لیے مشاعرے سے کیے جاتے ہیں اور گانے سنے جاتے ہیں۔ عرس وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مجلسی زندگی کا ایک پہلو میلہ یا موسمی اجتماع بھی ہے جہاں شہر یا گاؤں کے لوگ جمع ہوتے ہیں' گانا سنتے ہیں' گھڑ دوڑ ہوتی ہے کشتیاں لڑی جاتی ہیں اور مویشی اور گھوڑوں نیز مقامی بنی ہوئی چیزوں کی نمائش ہوتی ہے۔

پنجاب ایک وسیع میدان ہے جس میں ہزار ہا گاؤں آباد ہیں۔ اس کا مطالعہ کرنے والوں کو یہاں کے دیہات کا مطالعہ کرنا چاہیے' اس لیے کہ دیہات ہی صوبے کا دل ہیں۔ زیادہ تر شہری اصلاً دیہات ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے دیہات میں اپنے مکانات اب تک قائم رکھے ہیں' جو ان کی مجلسی حیثیت کی علامت ہیں۔ وہ غلہ' گھی' روئی اور بھینس گاؤں ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ بچوں کی شادیاں کرنی ہوں تو عموماً گاؤں ہی میں چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ رسم شہر میں ادا کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو تقریب کے سلسلے میں ضروری کام انجام دینے کے لیے گاؤں ہی سے وہ آدمی شہر بلائے جاتے ہیں جو پشت ہا پشت سے ان کے گھرانے کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں۔ بعض ایسے واقعات بھی معلوم ہوئے کہ جب کسی آدمی کی وفات شہر میں ہوئی تو اس کی میت کو دفن کرنے کے لیے گاؤں کے قبرستان لے گئے۔

گاؤں کی کیفیت:

موضع موہلا پنجاب کے ہزاروں گاؤں میں سے ایک گاؤں ہے' بعض امور کو نظر انداز کرتے ہوئے اس میں بہت سے دیہات کی خصوصیات موجود ہیں۔ یہ لاہور سے شمال مغرب میں کوئی ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ٹرین یا بس میں سوار ہو کر جائیں تو تین گھنٹے لگتے ہیں۔ قریب ترین ریلوے سٹیشن سے گاؤں تک چلنے میں بیس منٹ صرف ہوتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن پر اتر کر مغرب کی جانب گاؤں کا رخ کریں تو پہلے بنجر زمین ملتی ہے پھر گاؤں کا قبرستان آتا ہے اور آگے بڑھیں تو ایک تنگ راستہ ہے جس کے دونوں طرف مزروعہ کھیت ہیں پھر ایک جوہڑ کے پاس سے گزرنا پڑتا ہے جس میں سے دیہاتی

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگ اپنے مکان بنانے کے لیے مٹی نکالتے ہیں۔ گاؤں کے سرے پر درخت ہیں اور وہاں پہنچ کر موہلا پر پہلی نظر ڈالنا ممکن ہے۔

دائیں جانب مٹی کی ایک لمبی دندانے دار دیوار ہے جس کی بلندی یکساں نہیں' یہ گاؤں کی بڑی گلی کی ایک حد پر واقع ہے۔ سامنے ذرا فاصلے پر ببول کے لمبے خوشنما درختوں کے پیچھے ایک پختہ اینٹوں کا مکان ہے جس کا برآمدہ محراب دار ہے اور پختہ فرش والے صحن کے اردگرد نیچی دیوار بنی ہوئی ہے۔ یہ گاؤں کے نمبردار یا چوہدری کا مہمان خانہ ہے۔ اسے ایک مقامی مالکِ زمین کی دولت' اثر ورسوخ اور اعلیٰ حیثیت کا نشان سمجھنا چاہیے جو گاؤں کا نمبردار بھی ہے۔ بڑی گلی سے چند چھوٹی گلیاں نکلتی ہیں جن کے دونوں جانب گھر ہیں۔ مٹی کی دیواروں نے انہیں چھپا رکھا ہے۔

ہر گھر کا ایک صحن ہے اور اس میں ایک درخت لگا ہوا ہے جس کے سائے میں بیٹھ کر عورتیں اپنے زیادہ تر کام کرتی ہیں۔ بڑی گلی کے ایک جانب مٹی کی دیوار ہے۔ دوسری جانب کھیت ہیں' یہ گلی بنگلے یا بیٹھک کے پاس سے گزرتی ہے جو مہمان خانہ ہے۔ اسے ایک شاہراہ ہی سمجھنا چاہیے جو دوسرے دیہات کی طرف جاتی ہے اور ان دیہات میں بھی ایسے راستے اور شاہراہیں یا سڑکیں ہیں جو انہیں دوسرے دیہات یا قریب کے قصبات سے ملاتی ہیں۔

گاؤں کے تمام مکان باہم ملے ہوئے ہیں۔ ان کی دیواریں مشترک ہیں۔ اس طرح وہ طغیانیوں' سیلابوں اور چوریوں سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ عام مکان مٹی کے بنے ہوئے ہیں لیکن بعض پختہ اینٹوں کے بھی ہیں۔ یہ آخری مکان گاؤں کے چوہدری یا چند دولت مند مالکان زمین یا خوشحال دستکاروں کے ہیں۔

چونکہ یہ مسلمانوں کا گاؤں ہے اس لیے یہاں ایک مسجد بھی ہے اور وقتاً فوقتاً مسجد میں مختلف سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔ دن نکلنے سے پہلے اذان ہوتی ہے۔ گاؤں کا امام لوگوں کو نماز کی طرف بلاتا ہے اور چند دیہاتی مسجد میں پہنچ جاتے ہیں۔ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ وقت گزرتا ہے تو گاؤں کے لڑکے امام سے قرآن پڑھنے کے لیے مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں امام کی بیوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے پڑھنے کے لیے اس کے گھر چلی جاتی ہیں جو مسجد کے سامنے واقع ہے۔ مرد دن کے مختلف اوقات میں نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں آ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی ہے جہاں ہر شخص دن کے کسی حصے میں نہا سکتا ہے۔ ایک الگ جگہ وضو کے لیے بنی ہوئی ہے اور مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ نماز ادا کرنے سے پہلے وضو کر لیں۔

ایک کھلی جگہ کے اردگرد درخت لگے ہوئے ہیں جہاں گاؤں کے جلاہوں نے اپنے کرگھے لگا رکھے ہیں جن پر وہ موٹا دیسی کپڑا بنتے ہیں۔ یہاں ایک جانب مٹی کی دیوار بنی ہوئی ہے اور اس پر چھت پڑی ہوئی ہے۔ گاؤں کے اردگرد جوہڑ ہیں جن میں بھینسوں اور گائے بیلوں کے لیے پانی موجود ہے۔ پورے گاؤں میں کوئی بیس کنوئیں ہیں جن پر رہٹ لگے ہوئے ہیں۔ یہ بیلوں یا بھینسوں کے ذریعے سے چلتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ اس کنوئیں پر آتے ہیں جو مہمان خانہ کے پیچھے واقع ہے وہاں عورتیں کپڑے دھوتی ہیں اور ایک چھوٹی سی چار دیواری میں بیٹھ کر نہاتی ہیں۔ پینے کا پانی دستی پمپوں کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ گاؤں میں ایسے اکتیس پمپ ہیں دو کنوئیں ایسے ہیں جن پر کوئی رہٹ نہیں۔ ایک مسجد کے صحن میں ہے جس سے لوگ پینے کا پانی نکالتے ہیں اور دوسرا اس جگہ ہے جہاں جولاہے کام کرتے ہیں۔

گاؤں کھیتوں کے درمیان واقع ہے جو آس پاس کے دیہات کے کھیتوں سے جا ملے ہیں۔ جنوبی جانب کھیت دریائے چناب کے کنارے تک چلے گئے ہیں۔ جسے گاؤں والے صرف دریا کہتے ہیں۔ لوگوں کی زندگیوں کو دریا کے بہاؤ سے گہرا تعلق ہے۔ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے اس کی روانی محسوس کرتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں دریا چڑھاؤ پر ہوتا ہے تو جو لوگ دریا کی طرف جاتے آتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے ''کہو بھئی دریا کا کیا حال ہے؟''

یہ بالکل وہی انداز ہوتا ہے جیسے کسی سے پوچھا جائے۔ ''کہو بھئی مزاج کیسا ہے۔'' جن لوگوں کے کھیت دریا کے کنارے واقع ہیں ان کے لیے چڑھاؤ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ باپ نے ساری عمر غربت میں گزاری ہو لیکن بیٹا دولتمند بن جائے گا' اس لیے جو زمینیں باپ کی زندگی میں زیر آب ہو گئی تھیں۔ وہ بیٹے کی زندگی میں برآمد بھی ہو سکتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ دریا کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔ وہ لوگ بتاتے ہیں کہ دریا کے پاس رہنا ایسا ہی ہے جیسا بچے کو جادوگرنی کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ بچے کو کھلا سکتی ہے اس سے محبت بھی کر سکتی ہے لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یکا یک اسے نیچے گرا کر گلا گھونٹ دے۔ یہی کیفیت دریا کی ہے طغیانیاں آتی رہتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ جن کھیتوں میں کبھی اعلیٰ درجے کی فصلیں ہوتی تھیں وہ بنجر بن سکتے ہیں۔ کاشتکار کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دریا ایسی زرخیز مٹی چھوڑ جائے جو فصل کے نقصان کی کمی پوری کر دے، مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ساری زرخیز مٹی بہا کر لے جائے اور پیچھے صرف ریت چھوڑ جائے۔ بہ ایں ہمہ دریا سے نہ خوف ہے نہ نفرت، یہ ایک رومانی محبت کا سرچشمہ ہے اور اس محبت کے نغمے تمام پنجابی گیتوں پر نیز عشقیہ نظموں میں گائے جاتے ہیں۔

گاؤں کی آبادی ساڑھے تین سو کے لگ بھگ ہے۔ کل ساٹھ احاطے ہیں اور چوہتر گھر اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانا پکانے کی غرض سے وہاں چوہتر چولہے سلگائے جاتے ہیں۔ جب گاؤں میں خوراک تقسیم ہوتی ہے تو ہر گھر کو اس کا حصہ ملتا ہے اور جب کبھی کسی اجتماعی کام کے لیے کارکنوں کی ضرورت پیش آتی ہے تو ہر گھر سے ایک ہی آدمی بلایا جاتا ہے۔ خواہ ایک گھر میں ایک سے زیادہ بالغ مرد موجود ہوں۔

باشندے تمام مسلمان ہیں اور ان کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک زمیندار یعنی مالکان زمین، دوسرے کمی یا موضع کے دستکار اور کارندے۔ مالکان زمین کے مختلف درجے ہیں۔ بعض کے پاس ممکن ہے زمین بالکل نہ ہو لیکن چونکہ وہ زمینداروں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے باپ دادا کسی زمانے میں زمین کے مالک تھے۔ ہوسکتا ہے ان کی میراث وارثوں میں تقسیم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی ہو یا انہوں نے زمین بیچ دی ہو یا ان کی مالکی کے زمانے میں زمین دریا برد ہوگئی ہو، لیکن انہیں بدستور زمیندار مانا جاتا ہے۔ دیہاتی دستکاروں اور کارندوں کی ذاتیں مختلف ہیں۔ ہر ذات کا ایک خاص پیشہ ہے جس میں باپ دادا پشتوں سے مشغول چلے آتے ہیں اور ان کی اولاد بھی عموماً وہی پیشہ اختیار کرتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

بہت سے دوسرے دیہات کی طرح اس گاؤں میں مندرجہ ذیل کمی یا دیہاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کارکن موجود ہیں۔

1۔ میراثی (تمام دیہات میں نہیں ہوتے)

2۔ حجام جو مختلف تقریبات پر کھانا بھی پکاتا ہے۔[1]

3۔ بڑھئی جو معمار بھی ہوتا ہے۔[2]

4۔ لوہار

5۔ کمہار

6۔ موچی

7۔ نانبائی جو ماہی گیری بھی کرتا ہے۔[3]

8۔ درزی جو کپڑے سیتا ہے۔

9۔ جولاہا

10۔ مصلی جو محنت مزدوری کرتا ہے۔

جُلاہے کے سوا تمام پیشہ وروں کو گھر واکمی یعنی گھر کا کام کرنے والے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ گاؤں کے مختلف گھرانوں کے ساتھ سالانہ قرارداد کی بنا پر کام کرتے ہیں۔[4] بیرونی لوگوں میں سے صرف یہ کمی ان گھروں میں آ جا سکتے ہیں جہاں یہ کام کرتے ہیں اور

1۔ حجام گاؤں کے کمیوں میں سب سے زیادہ معزز ہوتا ہے۔ شادہ بیاہ کی زیادہ تر رسمیں اسی کے اہتمام میں ادا ہوتی ہیں جیسا کہ خود اس کتاب میں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے۔

2۔ بڑھئی مکان تعمیر نہیں کرتا صرف دروازے بناتا ہے اور چھت ڈالتا ہے۔ اس کے علاوہ چارپائیاں بناتا ہے اور لکڑی کا زیادہ تر کام اسی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے مثلاً کھیتی باڑی کے بعض آلات کی درستی وغیرہ۔

3۔ جس پیشہ ور کو نانبائی قرار دیا گیا ہے وہ اصل میں سقا ہوتا ہے جو مختلف گھروں میں پینے کا پانی پہنچاتا ہے اور شادی بیاہ کے موقع پر دلہن کی ڈولی اٹھاتا ہے بے شک وہ تنور میں نان بھی لگاتا ہے اور ماہی گیری بھی کرتا ہے۔ چونکہ موہلا میں دستی نل لگے ہوئے تھے اس لیے ممکن ہے یہاں سقے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔ سقے کو لوگ باگ بہشتی بھی کہتے ہیں۔ (مترجم)

4۔ عام دستور یہ ہے کہ ان لوگوں کو فصل کٹنے کے بعد غلہ دیا جاتا ہے لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ یہ قرارداد فصلوں کے لیے ہوتی ہے علاوہ بریں انہیں شادی بیاہ یا اس قسم کی دوسری تقریبات پر مختلف رسموں کے سلسلے میں روپے دیئے جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مردوں میں سے قریبی رشتہ داروں کے سوا کوئی شخص گھر کے اس حصے میں نہیں جا سکتا جہاں عورتیں رہتی ہیں۔ جولاہوں کے ساتھ کوئی مستقل قرارداد نہیں ہوتی۔ لوگ روئی انہیں دے دیتے ہیں تا کہ کاتیں[1] یا کپڑا بن دیں۔ وہ بنا ہوا کپڑا یا سوتی کھیس گاؤں میں یا پاس کے شہر میں فروخت کرتے ہیں۔

ہر زمیندار کنبہ مختلف کمیوں کے ساتھ سالانہ قرارداد کر لیتا ہے۔ اس قرارداد کو ''سیپ'' کہا جاتا ہے اور دونوں فریق ''سیپیاں'' کہلاتے ہیں ''سیپیوں'' کے درمیان تعلق پشتوں تک قائم رہ سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی کنبہ کسی حجام کے کام سے مطمئن نہ ہو لیکن وہ اسے ہٹا کر دوسرے حجام کو مقرر نہ کرے گا اس لیے کہ یہ دونوں فریقوں کے درمیان عزت اور وقار کا معاملہ بن جاتا ہے۔ تبدیلی اس وقت تک نہ ہو گی جب تک ایک ایک فریق پے در پے واجبات ادا کرنے میں ناکام رہنے کے بعد خود بخود علیحدگی اختیار نہ کر لے۔ خود کمیوں کے درمیان بھی اسی قسم کی قراردادیں ہو جاتی ہیں مثلاً کمہار' حجام' سقا یا بہشتی' بڑھئی موچی یا دوسرے پیشہ وروں سے قرارداد کر لیتا ہے اور کام کی مقدار کے لحاظ سے معاوضہ لیتا ہے۔

زمیندار فصل کے موقع پر غلہ دیتے ہیں جس کی مقدار غذائی جنسوں کی قیمت بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ اگر طغیانی فصل کو تباہ کر دے تو ''کمی'' کو آئندہ فصل پر غلہ دے دیا جاتا ہے۔ ''کمی'' صرف کام کے ذریعے سے اپنے واجبات ادا کرتے ہیں۔ معاوضہ ادا کرتے وقت باہمی رضامندی سے کام کی حیثیت پیش نظر رکھی جاتی ہے۔ کمہار دوسرے پیشہ ور ''کمیوں'' کو مٹی کے برتن وغیرہ دیتا ہے اور وہ اس کے بدلے میں کمہار اور اس کے بچوں کی حجامت کرتے ہیں۔ شادیوں کے موقع پر کھانا پکاتے ہیں' نان لگاتے ہیں' جوتے سیتے ہیں لکڑی کا کام کرتے ہیں اور خاص تقریبات پر اس کے گھر کی صفائی کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کمہار کے دیئے ہوئے برتنوں کی قیمت اتنی نہیں جتنے کا حجام کام کرتا ہے تو برتنوں کے علاوہ حجام کا نقد یا غلے کی صورت میں زیادہ معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ صرف جولاہے کو کام کے بدلے میں نقد روپیہ ملتا ہے اور وہ جن کمیوں سے کام لیتا ہے انہیں نقد یا غلے کی صورت میں معاوضہ ادا کرتا ہے۔

---

[1] عموماً جولاہوں سے سوت کتوایا نہیں جاتا۔ ممکن ہے کسی مقام پر کسی جولاہے کی بیوی اور لڑکیاں سوت کاتنے کا کام بھی کرتی ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام ''کمی'' اپنے مخصوص کام باقاعدہ انجام دینے کے علاوہ بچے کی پیدائش' ختنہ' شادی یا مرگ کے موقعے پر خاص کام انجام دیتے ہیں۔ان موقعوں پر انہیں ''لاگ'' کا روپیہ ملتا ہے۔جس کی مقدار رواج کے مطابق مقرر ہوتی ہے اور یہ روپیہ ان کا حق سمجھا جاتا ہے۔گھر کے کمیوں اور ان زمیندار کنبوں کے درمیان' جن کا وہ کام کرتے ہیں' گہرا تعلق رہتا ہے۔ان کمیوں کے لیے زمینداروں کے بچے کھیتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔کمی ان بچوں کے نشوو ارتقا کا خیال اسی طرح رکھتے ہیں۔کمی ان بچوں کی نشو وارتقا کا خیال رکھتا ہے کمیوں کے لیے ان بچوں کی شادیاں فصل کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے کہ شادیوں ہی پر انہیں ''لاگ'' ملتے ہیں۔

کمیوں میں سے حجام سب سے زیادہ مہذب کارکن ہوتا ہے۔اس کے فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے سیپیوں کو بنائے سنوارے رکھے اور پنجاب کے دیہاتی یقیناً بنے سنورے رہتے ہیں۔سیپیوں میں حجام پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔نہایت اہم اور فوری مسئلوں کے متعلق اسی سے مشورہ لیا جاتا ہے۔وہ اپنے سیپیوں کے بیٹے بیٹیوں کے لیے موزوں بر تلاش کرتا ہے۔یعنی لڑکی کے لیے شوہر اور لڑکے کے لیے بیوی منگنی یا شادی ختنہ اور مرگ کی رسموں میں بھی وہ شریک رہتا ہے۔نکاح کے وقت کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ایک امام دوسرا حجام اور تیسرا لڑکی کا ولی۔حجام پیغام رسانی کا کام بھی کرتا ہے اور اہم پیغامات اسی کے ہاتھ جا بہ جا بھیجے جاتے ہیں۔یہ پیغامات عموماً لکھ کر نہیں دیئے جاتے' اس لیے کہ حجام زبانی ساری تفصیلات بتا دیتا ہے۔سب سے آخر میں یہ کہ حجام مہمان کا استقبال کرتا ہے اور کھانا پکاتا ہے۔تمام رسمی تقریبات پیدائش' ختنہ' شادی اور مرگ پر سیپیوں کے مہمان آتے ہیں تو کھانا حجام ہی پکاتا ہے۔وہ تھوڑی بہت جراحی بھی جانتا ہے اور چوہدری اور اس کے مہمانوں یا ملنے کے لیے آنے والوں کی مالش بھی کرتا ہے۔

مختلف کمیوں میں حجام کا درجہ سب سے اونچا اور مصلی کا درجہ سب سے نیچا ہے۔ یہ امتیاز صرف متعلقہ کام کی اہمیت سے تعلق رکھتا ہے' اس لیے کہ کمیوں کے گروہوں میں تمام امتیازات تقسیم کار پر موقوف ہیں۔انہیں چھوڑ کر مجلسی تعلقات میں سب مل جل کر بیٹھتے ہیں' اکٹھے حقہ پیتے ہیں۔خاص تقریبات پر ایک دوسرے کے گھروں میں کھانا بھیجتے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کھانا وصول کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی جگہ نہاتے ہیں اور اکٹھے نماز ادا کرتے ہیں۔ ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تمام لوگ اس تصور پر عمل پیرا ہیں کہ ہر آدمی سب سے پہلے انسان ہے اور ذات پات نے جو حدیں مقرر کر رکھی ہیں۔ انسانیت اس سے بالا ہے۔ اسلام نے انسانی مساوات کے اصول کی اشاعت کی ہے۔ یہ مساوات لوگوں کی روزانہ زندگی میں ایک زندہ قوت ہے اور سب لوگ رواداری کی روح سے معمور ہیں۔

گاؤں کے رئیس کو چوہدری کہتے ہیں۔ وہ زمینداروں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور اکثر گاؤں کا سب سے زیادہ دولت مند زمیندار ہوتا ہے' ممکن ہے چوہدری کے باپ دادا میں سے کسی بزرگ نے گاؤں کی بنیاد رکھی ہو لیکن اس کے بعد حیثیت قائم رکھنا یا لوگوں سے اپنے آپ کو چوہدری منوانا صرف اس شخص کے طرز عمل پر موقوف ہوتا ہے۔ گاؤں کے چوہدری کا فرزند ہونے کی حیثیت سے وہ اس منصب پر فائز ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے لیکن جب تک وہ اس منصب کے پیچدار کاموں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا ثبوت بہم نہ پہنچا دے چوہدری کا لقب اعزازی حیثیت سے آگے نہ بڑھے گا۔ دوسرے زمیندار عام لوگوں کی مدد سے اثر ورسوخ کے مالک بن سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ گاؤں کے باہر کے لوگ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور عملاً وہی گاؤں کے چوہدری بنے رہیں۔

جس گاؤں میں ایک سے زیادہ دولت مند اور بارسوخ چوہدری ہوں اس کا مرکز ''دارا''[1] کہلاتا ہے۔ یعنی گاؤں کا مشترکہ مہمان خانہ ہوتا ہے لیکن موہلا میں صرف ایک چوہدری ہے اور اسی کا مہمان خانہ گاؤں کا نہایت ممتاز ادارہ ہے۔ یہ آدمیوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ براتیں وہیں ٹھہرائی جاتی ہیں۔ جن لوگوں کے ہاں کوئی موت ہو جائے وہ چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہیں لوگ تعزیت اور فاتحہ کے لیے آتے ہیں۔ ''پریہ'' یعنی گاؤں کی پنچایت وہیں بیٹھتی ہے۔ اسے گاؤں کا کلب سمجھنا چاہیے جہاں وہ اکٹھے ہوتے

---

[1] ممکن ہے کسی گاؤں میں مشترکہ مہمان خانے کو دارا کہتے ہوں۔ مختلف مقامات پر اس کے لیے دائرہ یا ڈیرہ کے الفاظ مستعمل ہیں جو فقیر اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر ہوتا ہے وہ بھی کمیوں میں گنا جاتا ہے اور ڈیرہ دار کہا جاتا ہے۔ ڈیرہ دار کو لاگ بھی ملتے ہیں اور اس کے لیے کچھ زمین بھی کھیتی باڑی کے لیے مقرر ہوتی ہے۔ اسے معافی سمجھا جاتا یعنی وہ گاؤں کی شاملات میں شامل ہوتی ہے اور فقیر کو اس کا مالیہ ادا نہیں کرنا پڑتا۔ (مترجم)

14011

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں، حقہ پیتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں، گپیں ہانکتے ہیں۔ کہانیاں سناتے ہیں اور دور و نزدیک کی خبریں ایک دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔ پھیری کرنے والے گویئے گانے وہیں سناتے ہیں اور فقیر فقرا جو ہمیشہ گشت پر نکلے رہتے ہیں وہیں قیام کرتے ہیں ایک ملازم مہمان خانہ کی دیکھ بھال کے لیے مقرر ہوتا ہے اور جو بھی آدمی وہاں آجاتا ہے یا ٹھہرتا ہے اس کے لیے حقہ تیار کر دیتا ہے۔ جو لوگ چوہدری سے ملنے کے لیے آتے ہیں انہیں کھانا کھلایا جاتا ہے اور مہمان خانہ کے ایک کمرے میں وہ رات کے وقت سوتے ہیں۔

زمیندار میں چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے اسے سخی اور فراخ دل ہونا چاہیے۔ وہ اپنی جائیداد کا بڑا حصہ تقسیم کر سکتا ہے اور اس وجہ سے اس کے بچے مالی اعتبار سے بے شک خوشحال نہ رہیں لیکن یہ اس کی برائی نہیں سمجھی جائے گی بلکہ سب لوگ اس کی سخاوت فراخ دلی کو یاد رکھیں گے اور اس کے بچوں کی قدر کریں گے۔ دوسرے چوہدری کے لیے ضروری ہے کہ جھگڑوں کا فیصلہ کرتے وقت انصاف اور دانشمندی سے کام لے، پھر اس کے لیے با اثر اور با رسوخ ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کا بندوبست یوں بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے رشتے دار اور دوست اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ سرکاری حلقوں سے اس کے تعلقات اچھے ہوں تا کہ وہ مصیبت کے وقت دوسرے دیہاتیوں کی امداد کر سکے۔

گاؤں کے دوسرے زمینداروں کو بھی چوہدری کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے لیکن ان کے لیے یہ لقب محض اعزازی ہوتا ہے اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ گاؤں کا رئیس ہونے کا درجہ انہیں مل گیا یا رئیس ہونے کی ذمہ داریاں ان کے حوالے ہو گئیں۔ گاؤں کے باشندوں کے متعلق ذمہ داریاں تنہا چوہدری پوری نہیں کرتا بلکہ اس کا تمام گھرانا انہیں پورا کرنے میں شریک ہوتا ہے۔ گھرانے میں اس کی والدہ، بہو، بہن، سالی، بچے اور ملازم شریک ہوتے ہیں۔ جن دیہاتیوں کے پاس بھینس نہیں ہوتی یا ہوتی ہے اور دودھ نہیں دیتی انہیں جب دودھ کی ضرورت پیش آتی ہے تو چوہدری ہی گھر سے لیتے ہیں۔ لوگ اسی گھر سے غلہ، گھی، شکر اور روپیہ قرض لیتے ہیں۔ سال بھر مختلف موقعوں پر خوراک بکثرت تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ جب کسی کو ضرورت پیش آتی ہے تو چوہدری کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ بچوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی پیدائش پر چوہدری کے گھر سے لوگوں کو تحفے دیئے جاتے ہیں۔ کسی غریب کے ہاں موت ہو جائے تو کفن کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ گاؤں کی تمام تقریبات میں چوہدرانی یعنی چوہدری کے گھرانے کی معمر عورت کی موجودگی سے لوگوں کا وقار بڑھ جاتا ہے۔

زمیندار کے گھرانے میں معمر عورت غلے یا زرعی پیداوار یا روپے کی نگراں ہوتی ہے۔ رشتہ داروں' دوستوں' سیپیوں اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ رسمی تقریبات کے سلسلے میں سب سے بڑا حصہ اسی عورت کا ہوتا ہے۔ آس پاس کے دیہات میں کہیں شادی کے موقعے پر کھانا بھیجنے بھجوانے میں سب سے زیادہ اسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور کسی کی موت ہو جائے یا کسی کا جانور مر جائے تو وہی تعزیت کے لیے جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ کھانا کب اور کس طرح تقسیم ہونا چاہیے اور گاؤں کے ہر گھر میں کتنی مقدار میں پہنچنا چاہیے۔

مختلف کمیوں کی بیویاں اپنے شوہروں کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں' مثلاً حجام کی بیوی چودھرانی یعنی گاؤں کے رئیس کی بیوی اور اپنے دوسرے سیپیوں کے بال سنوارتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز چودھرانی کے جسم کی مالش کرتی ہے اور گاؤں کی اور باہر کی خبریں سناتی ہے۔ جب چودھرانی پیدائش' شادی یا موت کے موقع پر اپنے رشتہ داروں کے ہاں جاتی ہے یا شہر جانا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے تو حجام کی بیوی چودھرانی کے ساتھ جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو امیر گھرانوں میں نیز مہمانوں کے لیے کھانے کیونکر پکائے جاتے ہیں۔ موچی کی بیوی جوتوں کو طلائی تاروں سے آراستہ کرتی ہے۔ سقے یا بہشتی کی بیوی تنور میں روٹیاں لگاتی ہے اور دانے بھونتی ہے۔ اس کا شوہر باہر سے ایندھن لاتا ہے۔ کمہار کی بیوی مٹی گوندھنے میں شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ برتنوں پر کالی مٹی سے نقش و نگار بناتی ہے' برتن پکانے میں مدد دیتی ہے پھر انہیں سیپیوں میں تقسیم کرتی ہے اور مقررہ معاوضہ لیتی ہے۔ کمہار اور اس کی بیوی دونوں مل کر سیپیوں کے ہاں سے گوبر لاتے ہیں اور اسی کو پڑاوے میں ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جولاہے کی بیوی روئی دھنکتی ہے۔[1] سوت کاتتی ہے اور اسے بننے کے لیے تیار کرتی ہے۔ مصلی کی بیوی

---

1. پیشے کے طور پر روئی دھنکنا دیہات میں تیلی کا کام سمجھا جاتا ہے۔ جولاہے عموماً روئی نہیں دھنکتے ہیں ممکن ہے کہ اکا دکا ایسی مثال کہیں مل جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھروں اور صحنوں میں جھاڑو دیتی ہے اور اپلے تھاپتی ہے۔ مصلی زمینداروں کے کھیتوں میں سیپ کے طور پر کام کرتا ہے تو بیوی اس کام میں بھی مدد دیتی ہے۔

مرد اور عورت کی مشترکہ محنت سے وہ واجبات پورے ہوتے ہیں جو مختلف پیشہ وروں کے ذمے ہیں۔ نان لگانے والا اس وقت تک نان پز نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی بیوی نان لگانا نہ جانتی ہو۔ یہ ایسا فن ہے جو بچپن ہی سے اسے سیکھ لینا چاہیے اور نان پزوں کے بچے' شروع ہی میں سیکھ لیتے ہیں۔ اس قسم کا ساجھا صرف روزانہ زندگی کے معاملات تک محدود نہیں ان کی زندگیوں میں ایسے اہم واقعے بھی آتے ہیں جب میاں بیوی دونوں کو رسمی طور پر اپنے اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ ان کے بغیر اصل کام پورا نہیں ہوتا۔ شادیوں کے موقعے پر بعض کام مردوں کے حلقے میں انجام پاتے ہیں اور اسی طرح بعض کام عورتوں کے حلقے میں بھی پورے کیے جاتے ہیں۔ دونوں کاموں کی حیثیت بالکل مختلف ہوتی ہے اور ان کا اپنی اپنی جگہ انجام پانا ضروری ہوتا ہے' مثلاً جب دلہن کی رخصت کا وقت آتا ہے تو زنانہ حلقے میں مختلف عورتیں دلہن اور دولہا کے ارد گرد جمع ہو جاتی ہیں اور انہیں سلامی دیتی ہیں' یعنی وہ روپیہ جو رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے مبارکباد اور خیر مقدم کے طور پر دیا جاتا ہے۔ بعض عورتیں دوستوں اور رشتہ داروں کے دیئے ہوئے روپے کا حساب رکھتی ہیں' کیونکہ ایسی ہی تقریب دوسرے کے ہاں ہوگی تو یہ روپیہ واپس کرنا ہوگا۔ بعض عورتیں مٹھائیاں تیار کرتی ہیں جو رخصت ہونے والے مہمانوں کے ساتھ جاتی ہیں' بعض دلہن کی رخصتی کے متعلق انتظامات کرتی ہیں۔ مردوں کے حلقے میں دلہن کے مرد رشتہ دار برات کو کھانا کھلاتے ہیں۔ بعض ڈولی تیار کراتے ہیں جس میں دلہن کو بٹھا کر رخصت کیا جائے گا بعض جہیز باندھتے ہیں۔ باندھنے سے پہلے اسے کھول کر سب کو دکھایا جاتا ہے کہ یہ جہیز دلہن کے ساتھ جائے گا۔ بعض لوگ گاؤں کے کمیوں میں لاگ تقسیم کرتے ہیں۔

بچے کی پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ لڑکا ہو تو اسے پیدائش ہی کے وقت سے جوان سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ کنبے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے لڑکی کی پیدائش پر ملے جلے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگر پہلے کوئی بچہ موجود نہ ہو تو کنبہ خوش ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر کوئی کنبہ غریب ہو اور پہلے اس میں لڑکے ہی لڑکے ہوں تو لڑکی کی پیدائش اس لیے ضروری سمجھی جاتی ہے کہ آگے چل کر اس کے بدلے میں کسی لڑکے کی شادی کا انتظام ہو سکے گا۔ دولت مند گھرانے میں لڑکی کی پیدائش کسی دوسرے گھرانے کے ساتھ شادی کے ذریعے سے نئے رشتے پیدا کرنے کا موجب سمجھی جاتی ہے۔ لڑکی کی شادی کے موقعے پر بلکہ اس کی پوری زندگی خاندان کو اپنی دولت اور فراخدلی کی نمائش کا موقع بہم پہنچتا ہے۔ اس طرح اس کے وقار اور درجے میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں لڑکی کی پیدائش خاندان کی تکمیل کا احساس پیدا کرتی ہے' اس لیے لڑکی اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کے لیے زندگی بھر قریب ترین رشتہ دار ہوتی ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ لڑکی خاندان کے لیے ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے' جب تک وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں رہے ایسا کوئی موقع پیدا نہ ہونا چاہیئے کہ اس کا نام کسی غیر مناسب سلسلے میں مذکور ہو' کیونکہ نیک نامی پر خفیف سا دھبا بھی خاندان کی عزت کے ایک پہلو کو مجروح کر دیتا ہے جسے عام طور پر ''غیرت'' کہتے ہیں۔ جب وہ شادی کے قابل ہو جاتی ہے تو اس کے ماں باپ اور بھائیوں کو کسی موزوں خاندان میں شادی کا انتظام کرنا چاہیے۔ اور کسی لڑکی کی شادی نہ ہو تو اس سے خاندان پر حرف آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ خاندان اپنا فرض ادا نہیں کر سکا۔ اگر شادی کے بعد سسرال میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ ہو تو ماں باپ کے لیے یہ امر غم و رنج کا باعث ہوتا ہے اور وہ اس میں ہتک محسوس کرتے ہیں۔

جب بچہ بولنے لگتا ہے تو جان لیتا ہے کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے اور وہ اپنے نام کے ساتھ خاندان کا نام بھی استعمال کرتا ہے' مثلاً ایک بچے کا نام پوچھا جائے تو وہ کہے گا ''میں بدرو بہشتی یا امینہ جولاہی ہوں۔'' چھ سال کی عمر میں لڑکے یا لڑکی کو پتا چل جاتا ہے کہ آیا اس کی شادی اپنے کنبے کے اندر ہوگی؟ جب بچہ چلنے پھرنے لگتا ہے تو اس کا باپ یا بڑا بھائی کام کے لیے باہر جاتے وقت اسے ساتھ لے جاتا ہے۔ آٹھ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنا خاندانی کاروبار تھوڑا بہت سیکھ لیتا ہے اور باپ کا معاون بن جاتا ہے۔ لڑکیاں ماؤں کی امداد کرتی ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے دونوں کھیتوں میں کام کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والے بڑوں کے لیے کھانا لے جاتے ہیں۔

بچے کو بہت چھوٹی عمر میں اپنے باپ کے رشتہ داروں یعنی ''داد کے'' اور ماں کے رشتے داروں یعنی ''نانکے'' کے بارے میں علم ہو جاتا ہے۔ بچہ اپنے باپ کے رشتہ داروں سے واقف ہو جاتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے اس لیے کہ وہ سب اس کے باپ کے گاؤں میں رہتے ہیں۔ اسی طرح ماں کے رشتے داروں سے واقف ہو جاتا ہے' اس لیے کہ ماں وقتاً فوقتاً اپنے والدین کے ہاں جاتی رہتی ہے اور بچوں کو بھی ساتھ لے جاتی ہے۔

ماں کے گاؤں والے (نانکے) بچے کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ شادی کے موقع پر لڑکی کو جہیز کا ایک حصہ ماں کے رشتہ داروں ہی سے ملتا ہے۔ جب لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو ماں کا بھائی یعنی بچے کا ماموں خاصا بڑا تحفہ لے کر آتا ہے۔ جب بچوں کے لیے شادی کے سلسلے میں بات چیت کی جائے تو لوگ لازماً پوچھتے ہیں کہ بچے کی ماں کا گاؤں کون سا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ماں کا باپ (نانا) فوت ہو جائے اور اس کے نرینہ اولاد نہ ہو تو اس کی بیٹی اور نواسے زمین اور باقی جائیداد کے وارث بنتے ہیں اسے ''نانکی ورثہ'' کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کو اپنے باپ کے اجداد اور خاندان کی شاخوں کے متعلق پورا علم ہو' اس لیے کہ یہ تمام لوگ ''برادری'' کہلاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تمام رسمی موقعوں پر بچے کے باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور دوسری برادری کے مقابلے میں یہ باپ کی قوت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اسے بچے کی چھوٹی سی دنیا سمجھنا چاہیے جس کے اندر وہ تعاون' مقابلہ اور رقابت سیکھتا ہے۔ یہی کسوٹی ہے جس کی بنا پر اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان کا وقار گھٹا یا بڑھا۔

خاندان میں ماں کا مقام بہت اہم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد ہے کہ بہشت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ لڑکیاں اس امر کا حد درجہ خیال رکھتی ہیں کہ ماں کے ساتھ تعلقات میں ذرا سی خرابی پیدا نہ ہو۔ ماں ہمیشہ لڑکیوں کا خاص خیال رکھتی ہے اس لیے کہ وہ گھر میں محض مہمان سمجھی جاتی ہیں۔ لڑکے ماں سے بڑی محبت کرتے ہیں اور اس کے نافرمان نہیں ہو سکتے۔ ماں سے کشیدگی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا درجہ اور وقار اپنے رشتے داروں اور گاؤں والوں سے گھٹ جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باپ کی بہن یعنی پھوپھی کو بھی بڑا اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے۔ خاندان میں کوئی اہم فیصلہ اس سے مشورہ لیے بغیر نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے بھائی اور اس کے بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ قریبی رشتہ دار اور حد درجہ ہمدرد ہوتی ہے۔ شادیوں کے متعلق معلومات پیش نظر رکھی جائیں تو واضح ہوگا کہ لڑکیوں کی شادیاں زیادہ تر اس خاندان یا اس گاؤں میں ہوتی ہیں جہاں پھوپھی بیاہی ہو۔

لڑکی کو بھی خاندان میں خاص حیثیت حاصل ہوتی ہے اسے کبھی جھڑکا نہیں جاتا اس لیے کہ وہ مہمان سمجھی جاتی ہے جو شادی کے بعد خاندان سے الگ ہو جائے گی۔ شادی ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنے والدین کے ہاں برابر آتی جاتی ہے اور ہر موقعے پر اسے کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے۔ باپ کے گھر پر لڑکی کے سال بھی ختم نہیں ہوتے۔ لوگوں میں مثل مشہور ہے کہ لڑکی باپ کے گھر کڑیاں گن لیتی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ لڑکی ہونے کی حیثیت میں اپنے حقوق کبھی نہیں چھوڑتی۔

بیوی اور بہو ہونے کی حیثیت میں عورت کا درجہ ٹھیک ٹھیک واضح کرنا آسان نہیں۔ خاندان میں اسے محبت اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ساس کی رہنمائی میں اسے بڑی سخت تربیت کا ایک دور پورا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں خاندان کے افراد مل جل کر رہتے ہیں وہاں بیوی اور بہو کی حیثیت زیادہ اہم نہیں ہوتی اس لیے کہ گھر کے انتظام کی ذمہ داری اور رشتے داروں کے سلسلے میں واجبات کی بجا آوری ساس پر موقوف ہوتی ہے لیکن بہن بیٹی اور پھوپھی ہونے کی حیثیت میں عورت کو اپنے گاؤں کے اندر بلند حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کے بچے جوان ہو جاتے ہیں تو اسے ماں اور ساس کے تمام حقوق مل جاتے ہیں۔

پنجاب کے ہر دیہاتی کی چند خاص خواہشات ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ زندگی بھر کام میں لگا رہتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وقار یا اعزاز بڑھے۔ اس کے لیے ''عزت'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ میراثی جب کبھی کسی سے ملتا ہے تو جو دعائیں دیتا ہے۔ انہیں اردو میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

- آپ کے پودے کی جڑ مضبوط اور سرسبز رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- آپ کا پودا ہمیشہ ہرا رہے۔
- آپ کی عزت کبھی خطرے میں نہ پڑے' نہ اس پر کوئی داغ دھبا لگے۔
- اس طریق سلام یا دعا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو ہر وقت یاد رہے کہ اس کی ذات سے کیا کیا امیدیں وابستہ ہیں۔

پنجابی مرد اور عورت کے لیے عزت کا مطلب یہ ہے کہ درجہ' وقار' اعزاز اور اثر ورسوخ کافی بلند ہو۔ عزت کا زیادہ اونچا درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ایک خاص حیثیت کے مطابق دولت حاصل کر لے۔

لیکن دولت کو ذاتی سربلندی کے لیے نہیں بلکہ تقسیم کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ لوگوں میں مثل مشہور ہے ''یا جائیداد پیدا کرو یا عزت'' زمیندار اور کمی دونوں اونچا درجہ حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے اپنے دائروں میں زیادہ تر وقار کے مالک بن سکتے ہیں۔ حیثیت بلند کرنے کا راستہ دونوں کے لیے کھلا ہوا ہے اور دونوں کے ذریعے بھی یکساں ہیں۔

ایک ''کمی'' بلند حیثیت اس طرح اختیار کر سکتا ہے کہ کام میں چست اور چالاک ہو' رسمی تقریبات پر دوستوں اور رشتہ داروں سے موزوں برتاؤ کرے' مہمانوں کو کھانا کھلائے اور تقریبات پر کھانا گاؤں بھر میں تقسیم کرے۔ وہ اپنے بچوں کی تربیت اچھی کرے گا تو اس سے عزت بڑھے گی۔ اس کے برعکس بیٹے یا بیٹی کی کوئی ناواجب حرکت عزت کو بٹا لگا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک زمیندار' خصوصاً ایک چودھری جو محض رسمی طور پر ہی اس لقب کا مالک نہیں بلکہ واقعی سرپنچ کی حیثیت رکھتا ہو وہ اپنی دولت' اپنا وقت اور اپنا اثر ورسوخ دوسروں کے لیے فراخ دلی سے صرف کرے گا تو اس کی عزت بڑھے گی۔ رسمی تقریبات کے موقع پر اس کی روش اچھی رہنی چاہیئے اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے متعلق اسے اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے۔

جب کسی مرد یا عورت کی تعریف کی جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں فلاں شخص نیک ہے۔ نیک کا مطلب ہے راست باز' اچھا منصف مزاج اور تکبر سے پاک۔ اگر کسی کے باپ دادا کی یاد لوگوں کے دل میں تازہ ہو اور اس کا ذکر نیکی سے کیا جائے تو اولاد بڑا فخر محسوس کرتی ہے اور ہر شخص کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ویسی ہی شہرت حاصل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے۔ جو شخص مذہبی فرائض با قاعدہ ادا کرتا ہوا احتیاط کی زندگی بسر کرے ہر دور میں یعنی بیٹے' شوہر' بھائی' باپ ہمسائے اور برادری اور قوم کے ایک فرد کی حیثیت میں سب کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے اور رزق یا دیانتداری سے کمائے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس نے زندگی کا مقصد پورا کر لیا اور جو لوگ اسے جانتے ہیں یا اس کا ذکر سنتے ہیں وہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عورتوں کے بارے میں بھی یہ سب کچھ ہے۔ لوگ انہیں بھی نیک ہونے کی وجہ سے یاد رکھتے ہیں۔

مزید برآں ہر مرد اور عورت کی ایک بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ حج کرے۔ زندگی کا ایک اور مقصد ہے جسے پنجابی میں ''سدھر'' کہتے ہیں' یعنی والدین کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اچھی جگہ پر بیاہے جائیں پھر ان کے بچے پیدا ہوں۔ ایک یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ بڑی عمر پائے اور موت کے بعد بیٹے اور داماد اس کی میت اٹھا کر قبر تک پہنچائیں۔ یوں اس کی موت ایک گونہ اطمینان کا باعث بن سکتی ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ اپنے پیچھے بیٹے اور پوتے چھوڑ کر جا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نسل باقی رہے گی۔ اولاد کے بغیر مرنا زمینداروں اور کمیوں دونوں کے لیے باعثِ قلق ہوتا ہے۔ کمی کے اولاد ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خاندان کا نام باقی رہے گا۔ زمیندار کے اولاد ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زمین اور جائیداد کسی دوسرے خاندان کے حوالے نہ ہوگی۔ مال کے کاغذات میں جہاں آدمیوں کے نسب نامے کئی پشتوں تک لکھے جاتے ہیں وہاں جس شخص کے اولاد نہ ہو اس کے نیچے سرخ لائن کھینچ کر لکھ دیا جاتا ہے۔ ناولید[1] کسی کو ''ناولید'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر لعنت بھیجی گئی۔ اگر کوئی آدمی بیٹوں کے بجائے بیٹی چھوڑ جائے تو اس کی جگہ مال کے کاغذات میں ایک نشان لگا دیا جاتا اور لڑکی کے نام کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے بخت بھری' یا ''بھاگ بھری''۔

اپنی دلی خواہش پوری کرنے کا مطلب ایک باپ کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا دور پورا ہو گیا اور دنیا میں اس نے اپنی ذمہ داریاں ادا کر دیں۔ اس کی زندگی کا دور پورا ہو جائے تو اس کے بچوں کے لیے ان کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ باپ اپنی ذمہ داریاں

---

[1] عام اصطلاح ناولید نہیں بلکہ لاولد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پوری کر جاتا ہے تو بچوں کی اعلیٰ حیثیت قائم ہو جاتی ہے' جو ان کی بہترین میراث ہوتی ہے۔

اسلامی تصور کے مطابق انسان اپنی خامیوں کے باوجود مخلوق میں یگانہ حیثیت کا مالک ہے اس لیے کہ وہ بہت بڑی امانت کا حامل ہے۔ قرآن مجید کی سورتِ احزاب میں ہے۔

''ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے' اٹھا لیا اس کو انسان نے۔ یہ ہے بڑا بے ترس اور نادان۔'' .... (آیت 72)

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جانتا ہے وہ ایک بڑے بلند مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے لیکن دنیاوی زندگی کی ضروریات دوسری مخلوقات سے الگ نہیں۔ یہ ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے مختلف مشقیں کرنی پڑتی ہیں جن میں وہ اس درجہ الجھ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اپنے اصل راستے سے ہٹ گیا۔ یہ امر اس کے لیے رنج و افسوس کا باعث ہوتا ہے۔

پنجاب کے دیہاتی کا سب سے اونچا روحانی نصب العین یہ ہے کہ خدا کی ذات تک اسے رسائی حاصل ہو جائے۔ اس مقصد کا حصول فکر و مراقبہ' دعا اور محبت ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ محبت کی تصویر پنجاب کی ہر دلعزیز نظم ہیر رانجھا میں پیش کی گی ہے۔ اس نظم میں ایک آدمی اور ایک عورت کی محبت کو خدا کے ساتھ محبت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ دیہاتی ہیر رانجھا پڑھتے اور سنتے ہیں تو جو لوگ روحانی ترقی کے طلبگار ہیں انہیں پتا چل جاتا ہے کہ اس نظم کے عاشق اور معشوق نے محبت میں ترقی کا کونسا روحانی درجہ حاصل کر لیا۔ جو لوگ ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ابھی بڑی منزل طے کرنا باقی ہے۔ جو لوگ کچھ منزل طے کر کے چلتے ہیں وہ اس اطمینان پر مسکراتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ بہت سی مشکلات سے گزر کر آگے نکل گئے۔

خدا کی ذات تک رسائی کا روحانی راستہ بڑا لمبا اور محنت طلب ہے' بہت تھوڑے آدمی منزل مقصود تک پہنچتے ہیں۔ اس راستے میں انہیں پیروں یا روحانی رہنماؤں کی ہدایت کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیر بھی عموماً اس راستے میں طلبگاروں ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صرف چند ''کل'' میں مل جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ جو اس درجے پر پہنچ جاتے ہیں ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے زمان و مکاں کی کوئی قید باقی نہ رہتی‘ لیکن ہر شخص اپنی کوششوں ہی سے منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ معرفت کا یہ ایسا مقام ہے جسے نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ سکھایا جا سکتا ہے۔

ابتدائی جدوجہد کی منزل بہت لمبی اور کٹھن ہے اور کسی کو علم نہیں کہ اسے طے کر کے کب اگلی منزل پر پہنچنا نصیب ہوگا اور کب روشنی نمودار ہوگی۔ جب یہ روشنی آتی ہے تو اچانک ایک جھلک کی شکل میں آتی ہے اور طالب کو پتا چل جاتا ہے۔ یہ حد درجہ پاکیزہ تجربہ ہوتا ہے اور بہت سے لوگ اس کے طلبگار رہتے ہیں۔ طلب کا راستہ سب کے لیے کھلا ہے۔ اس میں دولت یا درجے کی کوئی تمیز نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک غریب موچی اس راستے میں دولت مند مالکِ زمین سے آگے نکل جائے۔ ہمسفر اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اس لیے کہ انہیں راستے کی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی روحانی جدوجہد میں قطب تارے کی طرف منہ کر کے دعائیں مانگتے ہیں‘ اس لیے کہ ان کے نزدیک اسی تارے میں پیران پیر حضرات غوث الاعظم کی روح مقیم ہے[1]۔

قدرت کے مظاہر ہر لحظہ انسان کے قریب رہتے ہیں اور پنجابی گیتوں یا لمبی نظموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موسموں کی تبدیلی لوگوں کے مزاج وطبعیت میں منعکس ہوتی رہتی ہے۔ موسم بہار کی مسرت افزائیاں لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرتی ہیں‘ چنانچہ بہار کے موسم میں میلے بکثرت ہوتے ہیں اور ان میلوں میں پنجاب کے دیہاتی خوشیاں مناتے ہیں‘ گیت گاتے ہیں اور گانے سنتے ہیں۔ قوالی کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ جو محب اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہے اس کے لیے بہار جدائی کے درد کو بڑھا دیتی ہے‘ اس کے دل میں جو کانٹے چبھے ہوتے ہیں‘ باہر شگوفوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ نئی دلہن کو سسرال میں موسم سرما آ جائے تو اس کی مطلب ہوتا ہے اندھیرا‘ تنہائی اور افسردگی۔

لوگوں کو چاند سے بڑی محبت ہے۔ چاند کو ان کے مذہب سے گہرا تعلق[2] ہے

---

[1] اس قسم کے عقائد قطعاً عام نہیں۔ (مترجم)

[2] چاند کا تعلق مذہب سے کچھ بھی نہیں۔ بلاشبہ عرب میں دنوں کی گنتی کے لیے چاند کے مہینے رائج تھے۔ یہ عہد اسلام میں بھی رائج رہے اور انہیں کے مطابق سنہ ہجری کا حساب شروع ہوگا مگر صرف حساب ہے اسے مذہب سے کوئی خاص تعلق نہیں اور پاکستان میں کم وبیش چار قسم کے مہینے رائج ہیں فصلی مہینے‘ قمری مہینے‘ بکری مہینے اور انگریزی مہینے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور چاند کے مختلف مہینوں میں مختلف مذہبی تقریبات ہوتی ہیں۔ شب برات شعبان کے مہینے میں ہوتی ہے جو رمضان سے پہلے آتا ہے عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آئندہ سال زندہ رہنا ہے ان کے مقدمات کا فیصلہ اسی رات ہو جاتا ہے اور جنہیں سال کے اندر اندر مر جانا ہوتا ہے ان کے نام فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں۔ دیہاتی لوگ اس رات عبادت کرتے ہیں دوستوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں اور جھگڑے نبٹاتے ہیں' اس لیے کہ ممکن ہے وہ زندہ نہ رہیں۔

ہر مہینے لوگ نئے چاند کی تلاش میں آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے ہیں۔ آسمان پر ایک باریک روپہلی تار دیکھ کر ان کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں' دعا مانگتے ہیں اور چاند دیکھنے کی حالت میں اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ چاند کے بڑھنے گھٹنے کی بنا پر وہ دنوں کا حساب لگاتے ہیں اس لیے کہ یہی ان کی جنتری ہے۔ چاند کی گیارہویں تاریخ کو خیرات دی جاتی ہے۔ زیادہ خوشحال لوگ اس روز چاول اور دوسرے لوگ کھانا پکوا کر گاؤں کے غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔[1] چاند کے ساتھ خوبصورتی کی وجہ سے بھی لوگوں کو محبت ہے۔ چودھویں کو آسمان پر پورا چاند ہوتا ہے۔ یہ تاریخ بے احساس نہیں گزرتی' گرمی کے موسم میں لوگ چاندنی رات سے لطف اٹھاتے ہیں۔ سردیوں کے پورے چاند کے متعلق ایک کہاوت ہے یعنی سردیوں کے موسم میں پورے چاند کا حسن اس جوان کا سا ہوتا ہے جو غریب اور مفلس ہو۔ نہ چاند کے حسن کا اعتراف کیا جاتا ہے اور نہ غریب جوان کا' حالانکہ دونوں چیزیں حسن سے خالی نہیں ہوتیں۔ پنجابی میں چاند کو ''چن'' کہتے ہیں اور یہی لفظ پیارے اور محبوب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

دیہاتیوں کو زمین سے بڑی محبت ہے اور یہ ان کی نہایت قیمتی جائیداد ہوتی ہے' اسے وہ دولت اثر و رسوخ' وقار اور عزت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں' یہی ان کی روزی کا ظاہری وسیلہ ہے اور کھیتی باڑی کا جو علم انہیں باپ دادا سے حاصل ہوتا ہے' اس کے مطابق وہ

---

[1] گیارہویں تاریخ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب ہے' جنہیں پنجاب کے دیہات میں عام طور پر حضرت غوث الاعظم یا پیران پیر کہا جاتا ہے۔ کھانا یا چاول پکوا کر تقسیم کرنے کا طریقہ عام نہیں' البتہ بعض لوگ اس تاریخ کو زائد کھانا ضرور تقسیم کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھیتوں میں محنت مشقت کرتے رہتے ہیں۔ زمین اگرچہ زمینداروں کی ملکیت ہوتی ہے لیکن "کمی" بھی موقع پائے تو کھیتی باڑی میں لگ جاتا ہے اور تھوڑی بہت زمین حاصل کر لینا اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔

موہلا کے دیہاتیوں کے لیے مال مویشی بھی روزی پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ نیز انہیں دولت اور وقار کا نشان بھی سمجھا جاتا ہے۔ کسی کی بھینس یا گھوڑا مر جائے تو اس پر بڑے رنج وغم کا اظہار ہوتا ہے۔ اس موقع پر لوگ تعزیت کے لیے آتے ہیں' ہر آدمی اپنے مال مویشی یعنی بھینسوں گھوڑوں اور گائے بیل کے لیے نمایاں محبت محسوس کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے جانور بھی جان رکھتے ہیں۔ انہیں بھوک پیاس لگتی ہے وہ سردی محسوس کرتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کام کرتے کرتے تھک بھی جاتے ہیں۔ وہ بول نہیں سکتے' ضرورتوں کا اظہار نہیں کر سکتے' ہر چیز کے لیے ان کا انحصار مالکوں پر ہوتا ہے۔ اچھا مالک خود کچھ کھانے سے پہلے جانوروں کو چارہ ڈالتا ہے اور ان کے ساتھ کام میں لگا رہتا ہے۔ دیہاتیوں کا عقیدہ ہے کہ جو آدمی جانوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے' اسے پھر زمین پر کبھی کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے گی' لیکن اگر جانوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ ہوگا تو نہ اسے ایمان نصیب ہوگا اور نہ رزق۔

رزق کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لیے خدا نے کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا ہے اور زندگی میں اس کی عام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی۔ خدا نے اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور یہ حصہ پیدا ہوتے ہی اسے ملنے لگتا ہے۔ اسی کو رزق کہا جاتا ہے' رزق زیادہ بھی ہو سکتا ہے کم بھی۔ ہر شخص کا رزق مقرر ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا بھی رہے تو اسے مقررہ حصہ ملتا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو رزق حلال کرنے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کوئی آدمی تھوڑا کام کرے اور اسے زیادہ رزق مل جائے یعنی اس کے حصے کا رزق زیادہ ہو۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدمی سخت محنت مشقت کرے لیکن اسے بہت تھوڑا رزق ملے۔ گویا اس کے حصے کا رزق تھوڑا ہے۔ غرض جو کچھ بھی ملے انسان کو اس پر قناعت کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ خدا نے اس کے واسطے یہی مقرر کر دیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قسمت یا تصور تقدیر انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ موت' بیماری' غیر مناسب شادی یا جائیداد کا نقصان یہ تمام چیزیں قسمت سے وابستہ کی جاتی ہیں' لیکن قسمت یا تقدیر لوگوں کو بیکار نہیں بناتی۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے تو علاج کے لیے دیسی دوائیں یا انگریزی دوائیں استعمال کرے گا یا دم کرائے گا جب تمام تدبیریں بے اثر ہو جاتی ہیں تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کا توڑ انسانی کوششوں سے باہر ہے۔ یہ قسمت ہے جس سے کوئی بچ نہیں سکتا اور اسے قبول کر لینا چاہیے۔

خدا کے ساتھ تعلق کے سلسلے میں انسان قسمت اور رزق قبول کرتا ہے' لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی بنا پر اپنے نصب العین کے حصول کے لیے مطلوب کام کاج چھوڑ دیا جائے۔ انسان جدوجہد کر سکتا ہے اور جو طریق زندگی چاہے اس پر چل سکتا ہے۔ البتہ اس کی کوششوں کے نتیجے کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں۔

خدا اپنی ساری مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ موہلا کے تمام آدمیوں کا ایمان ہے کہ خدا سب کا حامی اور نگہبان ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنی زندگی زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ اگر کسی پر رنج و غم اور مصیبت آ پڑے' موت واقع ہو جائے یا کوئی طبعی حادثہ پیش آ جائے جس میں جائیداد کا نقصان اٹھانا پڑے تو اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا جاتا کہ خدا کی طرف سے سزا ملی یا خدا کی حمایت اور نگہبانی باقی نہیں رہی۔ خدا سے ایسی کوئی چیز منسوب نہیں کی جاتی۔ تمام تکلیفوں کے سلسلے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان میں کوئی چھپی ہوئی مصلحت ہو گی جس کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ایسے موقعوں پر لوگ کہتے ہیں۔ یہ خدا کی مرضی تھی اسے پورا ہونا چاہیے۔ اسی کو ہماری بہتری کا علم ہے۔

اگر کسی انسان سے کوئی غلطی یا گناہ ہو جائے تو وہ ناامید نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس محسوس کرتا ہے کہ خدا تک پہنچنا اب بھی ممکن ہے کسی وقت کسی مقام پر اس سے کوئی نیک فعل سرزد ہو گا جس سے اسے کائنات میں اپنے مقام کا اندازہ ہو جائے گا' جب یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جائے گی تو وہ سمجھ لے گا کہ خدا سے تعلق پیدا ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نیک آدمی زندگی بھر عبادت کرتا رہے اور اسے یہ احساس بھی ہو کہ نیکی کا اجر مل جائے گا پھر بھی وہ خدا تک نہ پہنچ سکے۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص خود

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے نیک اعمال کی بنا پر اپنے آپ کو اجر کا حقدار سمجھتا ہے تو اس سیدھے راستے سے ہٹ جاتا ہے جو جزو کو کل تک پہنچاتا ہے۔

رات دن کے چوبیس گھنٹے آٹھ پہروں میں منقسم ہیں۔ پھر ہر پہر کی کئی تقسیمیں ہیں جن میں سے بعض کے درمیان حد قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم انہیں جداگانہ سمجھا جاتا ہے۔ وقت کی تقسیم سورج اور تاروں کی حرکت پر مبنی ہے۔ مثلاً کھیتوں میں کام کرنے کا وقت' کھانے کا وقت اور عبادت کا وقت ایک پہر کے اندر وقت کی تقسیم اتنی پکی ہوتی ہے' جیسے باقاعدہ گھڑی استعمال کی جائے۔ اگر کوئی دیہاتی غروبِ آفتاب سے تھوڑی دیر پیشتر کا ذکر کرنا چاہے تو کہے گا۔ ''ماڑی ڈیگر'' جس کا مطلب یہ ہے کہ غروب آفتاب سے پندرہ بیس منٹ پہلے۔ اگر وہ کہے کہ نماز ویلا تو اس کا مطلب ہوتا ہے صبح کی نماز کا وقت یعنی سورج نکلنے سے پندرہ بیس منٹ پہلے۔ وقت بتانے کے لیے سائے کو بھی استعمال کیا جاتا ہے' مثلاً ظہر کی نماز اس وقت ہوتی ہے جب انسان کا سایہ اس کے قد سے ڈیوڑھا ہو جائے۔ عورتیں اپنے گھر کے سائے کے بڑھنے گھٹنے سے دن کا صحیح وقت بتا دیتی ہیں۔

مغربیوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ لوگ ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت کی پوری پابندی نہیں کرتے لیکن اس تھوڑی بہت ڈھیل کو وقت کے تصور کے متعلق انہیں کے نقطۂ نگاہ کی عینک سے دیکھنا چاہیے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مہمان آنے والا ہو اور اسے کھانا کھانا ہو تو کھانا اس وقت تک پکانا شروع نہ کریں گے جب تک مہمان نہ آ جائے۔ مہمان اور میزبان دونوں اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق میں رواداری کا برتاؤ کرتے ہیں' لیکن اور موقعوں پر وہ دیر نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک وہ موقع ہے جب دولہا کی برات دلہن کے گاؤں جاتی ہے۔ یہ ضرور مقررہ وقت پر پہنچتی ہے' خواہ موسم کیسا ہی ہو اور کتنی ہی مشکلات پیش آ جائیں۔ طغیانیوں کے زمانے میں یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں بھرپور دریا عبور کرنے پڑیں۔ وہ وقت پر گاؤں پہنچنے کے سلسلے میں موت کا شکار ہو سکتے ہیں' لیکن پہنچتے ضرور ہیں۔[1] دوسرا موقع

[1] یہ بیان ایک حد تک مبالغہ آمیز ہے حقیقت یہ ہے کہ تقریب کی اہمیت کا احساس سب کو ہوتا ہے۔ اگر بے بسی ہو جائے تو کسی نہ کسی ذریعے سے اطلاع بھی دے دی جاتی ہے' مثلاً سیلاب یا طغیانی کے باعث سواریاں ناپید ہو جائیں اور پیدل پہنچنا ممکن نہ رہے۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موت کا ہے اگر کہیں موت ہو جائے تو لوگ ضرور وقت پر پہنچتے ہیں۔ سوگوار خاندان کی طرف سے جب خبر پہنچے تو دوستوں اور رشتہ داروں کو فوراً روانہ ہو جانا چاہیے جس دن موت واقع ہو اسی دن سب کے لیے پہنچ جانا لازم ہے۔ دسویں اور چالیسویں دن بھی تعزیت کے لیے جاتے ہیں۔[1]

فاصلہ میلوں میں بھی بتایا جاتا ہے اور وقت میں بھی۔ اگر کوئی پوچھے کہ فلاں گاؤں کتنی دور رہے تو جواب ملے گا اتنے کوس (کوس ڈیڑھ میل کے برابر ہوتا ہے) ساتھ ہی دیہاتی بتا دے گا کہ آپ دوپہر تک یا شام تک (یہ سب کچھ فاصلے پر موقوف ہے) پہنچ جائیں گے۔ دیہاتی ہر شے پر نظر رکھتے ہیں اور مزاح سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مسافر آہستہ آہستہ جا رہا ہو تو فاصلہ بتانے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے گا جس رفتار سے آپ اب چل رہے ہیں۔ اس رفتار سے تو بہت دیر کے بعد پہنچیں گے۔ اگر قدم تیز اٹھایا جاتے تو دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ اگر مسافر گھوڑے پر سوار ہو تو گھوڑے کی حیثیت کا اندازہ کرتے ہوئے جواب دیا جائے گا۔

لوگوں کے دل میں شمالی اور مغربی سمتوں کے لیے بڑا احترام ہے۔ مغرب کی طرف کعبہ ہے جس کی طرف منہ کر کے وہ نماز پڑھتے ہیں جہاں لوگ حج کے لیے جاتے ہیں چنانچہ کوئی شخص مغرب کی طرف پاؤں کر کے نہیں سوتا اسی طرح شمال کی طرف بھی پاؤں نہیں کیے جاتے اس لیے کہ اس طرف قطب تارا ہے جس میں پیران پیر حضرت غوث الاعظم کی روح مقیم ہے۔

موہلا کے دیہاتیوں میں تین تاریخیں بے تکلف استعمال ہوتی ہیں ایک اسلامی یعنی چاند کی تاریخ، دوسری دیسی تاریخ، تیسری انگریزی تاریخ۔ چاند کی تاریخ مذہبی معمولات کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے۔ دیہاتیوں کو تمام قمری مہینوں کے اسلامی نام معلوم ہوں یا نہ ہوں لیکن اہم مذہبی تقریبات کے مہینوں کا علم ہے۔ دیسی تاریخ سے انہیں زیادہ واقفیت ہوتی ہے اور اسے دیسی ہی کہتے ہیں۔ یہ تاریخ روزانہ زندگی، فصلوں کی کاشت

---

[1] اس میں تعزیت کا ایک موقع جو دسویں یا چالیسویں سے بھی زیادہ ضروری ہے چھوڑ دیا گیا یعنی تیجا یا قل۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور موسموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ دیہاتی کو بارہ مہینوں کے نام معلوم ہیں لیکن اگر کھانے پینے کی چیزیں کم ہوگئیں تو قلت کے مہینے کو تیرہواں مہینہ بتاتے ہیں۔ تیرہواں مہینہ عموماً وہ ہوتا ہے جو فصل کی آمد سے پہلے آتا ہے یعنی جب گھر میں غلہ ختم ہو جاتا ہے اور نئی فصل کا غلہ نہیں پہنچتا۔ مغربی مہینوں کو انگریزی مہینے کہا جاتا ہے اور یہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً مالیہ ادا کرنا، عدالتوں میں تاریخیں بھگتنا، انتخابات، سکولوں کا کھلنا اور بند ہونا۔ جب وہ لوگ کسی تقریب یا شادی کے لیے تاریخ مقرر کرتے ہیں تو عموماً دیسی اور چاند کے مہینے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات انگریزی مہینوں کی تاریخ بھی بتادی جاتی ہے۔ اس طرح تینوں تقویمیں بیک وقت استعمال ہوتی ہیں۔

پنجابی گردوپیش کی چیزوں کی درجہ بندی کا بڑا اچھا تصور رکھتا ہے۔ اس میں آدمی بھی شامل ہیں اور ان کی روش بھی اس کے لیے ''کچا اور پکا'' کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ کچا کے معنی ہیں خام، ناپختہ، غیر مستقل، ٹوٹ جانے والا، بدل جانے والا، ناتجربہ کار اور ناقابل استعمال۔ ''پکا'' کے معنی ہیں پختہ کار، مستقل، پائیدار، آزمودہ، قابل اعتماد۔ کچے مکان، خام سڑکیں، ناپختہ غذا، فصل جو پکی نہ ہو، چینی اور مٹی کے برتن، برسات میں بدلتا ہوا موسم، سطحی یا ناآزمودہ اور ناقابل اعتماد آدمی، ایسا وعدہ جو توڑا جاسکے یا ایسی گفتگو جو دل نشین نہ ہو، ان سب کے لیے کچا کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ''پکا'' کی اصطلاح پختہ اور کنکریٹ کے مکان، تارکول بھری ہوئی سڑک، پختہ فصل، پکی ہوئی غذا، دھات کے برتن کبھی نہ بدلنے والے رنگ آزمودہ اور قابل اعتماد آدمی، ناقابل شکست وعدے، دل نشین گفتگو، پورا علم اور اس قسم کی تمام چیزوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

جب کوئی نیا خیال یا کوئی نئی چیز آتی ہے تو پنجابی فوراً اندازہ کر لیتا ہے کہ اس کا تعلق کس گروہ سے ہے۔ اس کے پاس ہر چیز کا کچا یا پکا کے گروہوں میں تقسیم کرنے کے پختہ قاعدے موجود ہیں۔ یہ درجہ بندی اور گروہ بندی اپنے سے باہر کی چیزوں کے لیے ہے، لیکن خود اپنے متعلق اور اپنے احساسات کے متعلق بھی وہ مختلف اوقات میں ''کچا اور پکا'' کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ جب تک وہ کسی چیز کا آخری فیصلہ نہ کر لے اور اس کے جذبات و خواہشات متصادم نہ ہوں، اس حالت کو کچا ہی سے تعبیر کرے گا۔ پنجابیوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور تقسیم بھی رائج ہے جو لوگوں' چیزوں اور زندگی کے طور طریقوں کے لیے استعمال ہوتی ہے یعنی دیسی اور ولایتی۔ اس کے وطنی باشندے یا وطنی پیداوار دیسی ہے' ان کے سوا جو کچھ ہے وہ ولایتی ہے' خواہ آدمی ہوں خواہ جنسیں۔

بعض ولایتی چیزوں کو وہ بہت پسند کرتا ہے مثلاً ولایتی روئی' ریشمی کپڑا' جوتے' صابن' دوا' مشینری اور سگریٹ' سگرٹوں کو خاص عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اسے اپنی وطنی چیزوں کی بھی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ نظم و نسق اور کاروبار میں مستعدی اور عدالتوں میں بے لاگ انصاف' جو انگریزی عہد حکومت میں افسروں کے میل جول سے سیکھا گیا ہے' ولایتی چیز ہے۔

پنجاب کے دیہاتی کے لیے پورا یورپ ولایت ہے۔ اگرچہ ولایت کا لفظ عام طور پر برطانیہ اور اس کے باشندوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دیہاتی کو دوسرے ملکوں کا علم ان کی پیداوار یا مصنوعات کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ ان مصنوعات کی حیثیت کے مطابق ملکوں کی درجہ بندی کر لی گئی ہے۔ جرمنی کو سب سے اونچا درجہ دیا گیا ہے اس لیے کہ اس کی مشینری بہت اچھی ہوتی ہے۔ برطانیہ کو کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزوں کے لیے مقدم رکھا جاتا ہے۔ جاپان نے بھی مصنوعات کے ذریعے سے خاصی شہرت حاصل کی لیکن اس کی چیزیں ارزاں اور ناپائیدار سمجھی جاتی ہیں۔ دیہاتی کو چین کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے علم ہوا ''علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین تک جانا پڑے۔'' چین اپنے ریشمی کپڑے سے بھی معروف ہوا' اس کپڑے کو عام طور پر شنگھائی کہا جاتا ہے۔ ہمسایہ ملکوں میں سے دیہاتی کو افغانستان' ایران' عراق سے واقفیت ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں ترکی کے ساتھ اس کا زیادہ تعلق ہے' اس لیے کہ ترکی زمانۂ دراز تک خلافت کا مرکز رہا۔ ترکی کے بعد دولت عربیہ سعودیہ آتی ہے اس لیے کہ مکہ معظّمہ جہاں حرم پاک ہے اور مدینہ شریف دولت سعودیہ ہی میں ہیں۔ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ مقدس مقامات ہیں۔ بہت سے دیہاتی حج کے لیے مکہ معظمہ جاتے ہیں جب لوٹتے ہیں تو مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے لیے محبت کا گہرا جذبہ اور ان کے معاملات سے وسیع تر دلچسپی لے کر آتے ہیں۔ دیہاتیوں کو مصر کے متعلق قرآن مجید کے مختلف قصوں کا علم ہوتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جن میں حضرت موسیٰ‘ فرعون اور حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے حالات بیان ہوتے ہیں۔[1] آخری قصہ پنجابی کی ایک لمبی نظم میں بیان کیا گیا ہے ایک اور نظم سیف الملوک کے نام سے پنجابی میں مشہور ہے۔ اس کا ہیرو ایک شہزادہ تھا جو مصر سے آیا تھا۔ وہ لوگ کوہ قاف کو پریوں کا مسکن قرار دیتے ہیں اور اس کا ذکر پریوں کی کہانیوں میں آتا ہے۔ دیہاتی کو یونان کے متعلق بھی علم ہے۔ دیسی طبابت پوری کی پوری یونان کی طباعت ہی پر مبنی ہے۔ یونان کے فلسفیوں کے نام بھی پنجاب کے دیہاتیوں کو آتے ہیں‘ مثلاً لقمان[2] اور ارسطو‘ افلاطون سے حکیمانہ قول منسوب کیے جاتے ہیں۔ اسے سکندر اعظم کے قصے اور حکمت آموز کہانیاں بھی آتی ہیں۔ فرانس کے متعلق علم اس نے پیرس کے ذریعے حاصل کیا جو لباس‘ خوشبو‘ بالوں کی آرائش اور سنگھار کے فیشنوں کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔

صرف دوسری عالمی جنگ میں پنجاب کے عام دیہاتیوں کو مغرب کے دوسرے بڑے ملک یعنی امریکہ کا علم پہلی مرتبہ ہوا۔ یہ علم ابھی تازہ ہے اور جب اس ملک کے لوگوں سے میل جول بڑھے گا‘ اس کی مصنوعات پھیلیں گی تو دیہاتی کو پختہ رائے قائم کرنے کا موقع ملے گا۔

---

1. قرآن مجید میں یا کسی مستند روایت میں زلیخا کا نام بالکل نہیں آیا صرف امراۃ العزیز یعنی عزیز مصر کی بیوی کا ذکر ہے۔ کچھ معلوم نہیں‘ اس کا نام کیا تھا۔ حضرت یوسف کے متعلق فارسی یا پنجابی میں جو قصے لکھے گئے ہیں ان میں فرضی اور بے سروپا روایتیں بہت ہیں۔ (مترجم)

2. سمجھا جاتا ہے کہ لقمان ایک یونانی فلسفی تھا‘ یہ اسلام سے پیشتر کی ایک افسانوی ہستی ہے جس کے ساتھ بہت سے عربی اقوال منسوب ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے (قرآن مجید میں یہ ذکر جس انداز میں ہوا اسے پیش نظر رکھتے ہوئے لقمان کو افسانوی شخصیت قرار دینا غلط ہے)(مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتیجہ

موہلا کے دیہاتی کا تصور عالم اس کے ثقافتی پس منظر سے وابستہ ہے۔ زندگی شروع ہوتے ہی اسے اپنے خاص کنبے' رشتہ داروں اور معاشرے میں اپنے مقام کا علم ہوتا ہے۔ فرائض اور ذمہ داریوں کا نقشہ اس کے سامنے رہتا ہے اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ انہیں کس طریق پر پورا کرنا ہے۔ خدا کے ساتھ اس کا تعلق پختہ ہے۔ اگرچہ وہ اس سطح پر زندگی بسر نہیں کرتا جو خدا کی طرف سے اس کے عقیدے میں مقرر ہو چکی ہے' لیکن وہ اس تک پہنچنے کے لیے جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ مادی چیزوں سے اس کا ربط وضبط قائم ہے۔ زمین' مال' مویشی اور جائیدادا سے عزیز ہیں' لیکن ایک تصور اسے کبھی فراموش نہیں ہوتا۔ عموماً پنجابی کی یہ کہاوت بیان ہوتی رہتی ہے' جو کچھ بنا ہے وہ ضرور ختم ہوگا اور جو مخلوق پیدا ہوئی ہے وہ ضرور مرے گی۔

دیہاتی کے گردوپیش جو کچھ موجود ہے اس کی قطعی درجہ بندی کر لی گئی ہے' مثلاً وہ چیزیں جو فنا ہونے والی اور ناپائیدار ہیں اور وہ چیزیں جو قائم اور پائیدار رہیں گی۔ اس میں کئی ثقافتیں جمع ہو گئیں جیسا کہ مختلف جنتریوں کے استعمال سے واضح ہے۔ لہٰذا وہ نئے تصورات کو بھی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس طرح تجربے کی ثقافتی دولت میں اضافہ کر سکتا ہے۔ وہ وطنی نیز اجنبی اور مغربی مصنوعات میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مغربی طریق زندگی' کام کاج کی منظم باقاعدگی اور تنظیم کی صلاحیت کو فوراً بھانپ لیتا ہے اور ان چیزوں کا قدردان ہے۔ مگر وہ اپنے طریق زندگی کی قدروقیمت بھی پہچانتا ہے جو اس کے ماحول کے لیے سازگار ہے اور کام کاج کی اپنی منظم باقاعدگی بھی اسے پسند ہے جو قدرت اور موسموں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بڑی تقریبات پر اس کی اپنی تنظیمات ہوتی ہیں جنہیں وہ خاص اہمیت دیتا ہے اور انتہائی مستعدی سے انہیں پورا کرتا ہے۔ نئے ملکوں' نئی قوموں اور نئے خیالات کے ساتھ ساتھ اس کا عالمی تصور پھیلتا جا رہا ہے اور ہر نئی چیز کے لیے اس نے ایک مقام مقرر کر رکھا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

4

پنجاب کا شہری معاشرہ
(میری جین کینیڈی)

اگرچہ پاکستان کی زیادہ تر آبادی زراعت پیشہ ہے' لیکن زمانۂ قدیم سے ایک شہری روایت بھی چلی آرہی ہے جس کی بنا پر شہری معاشرے نے نشو ونما پائی۔ شہریت کو زیادہ نشو ونما اور اہمیت مغربی پاکستان کے اس علاقے میں ہوئی جو پہلے مغربی پنجاب کہلاتا تھا اور جہاں تجارت اور مصنوعات کے مرکزوں نے شہروں کی صورت اختیار کر لی۔ تجارت کو مغربی پنجاب کے سازگار اقتصادی حالات کے باعث فروغ حاصل ہوا۔ یہاں جنوبی ایشیا کی حد درجہ زرخیز زمینیں واقع ہیں جن کی وجہ سے درجۂ معیشت نسبتاً خاصا اونچا ہو گیا۔

زیادہ تر شہر گزشتہ پچاس سال میں ظہور پذیر ہوئے۔ خصوصاً شہری آبادی بہت بڑھ گئی۔ یہ مغربی پنجاب کی روز افزوں خوشحالی کا ثبوت ہے جو بڑی حد تک آبیاری کی ان نہروں کا نتیجہ ہے جو برطانوی راج میں تعمیر ہوئیں۔ لائل پور اور منٹگمری جیسے نئے شہر وجود میں آگئے اور پنجاب کی آبادی گزشتہ پچاس سال میں دگنی ہو گئی۔[1] حفظانِ صحت کے انتظامات بہتر ہوئے۔ پیدائش کا عدد موت کے عدد سے بڑھ گیا اور اس زمانے میں پورے ملک کی آبادی میں اضافہ ہو گیا۔

---

1. پاکستان کی مردم شماری بابت 1951ء جلد پنجم پنجاب اور ریاست بہاولپور۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہ حالتِ موجودہ شہریت مغربی پاکستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں مغربی پنجاب کے اندر زیادہ ترقی پذیری ہے' لہٰذا شہری طور طریقوں کی نشوونما کے لیے جو معلومات مہیا کی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی جغرافیائی حصے سے لی گئی ہیں۔

1951ء کی مردم شماری کے مطابق مغربی پنجاب کی شہری آبادی چونتیس لاکھ یا سابق صوبے کی پوری آبادی کا اٹھارہ فیصد تھی۔ پورے پاکستان میں شہری آبادی کا تناسب دس فیصد ہے۔ گویا مغربی پنجاب کا تناسب پاکستان کے عام تناسب سے بڑھا ہوا ہے۔ 1931ء اور 1941ء کے اعداد سے بالترتیب تیرہ فیصد اور پندرہ فیصد نمایاں ہوتا تھا۔ لیکن 1951ء کا تناسب 1901ء کے تناسب یعنی نو فیصد سے دگنا ہو گیا۔[1] شہریت کی طرف رجحان سے واضح ہوتا ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت ترقی پر ہیں' انہی کی وجہ سے آبادی دیہات سے نکل کر شہروں میں پہنچ رہی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے مغربی پنجاب میں اول درجے کے شہر چھ ہیں (جن کی آبادی ایک لاکھ سے اوپر ہے) اور دوسرے درجے کے چودہ (جن کی آبادی پچیس ہزار سے اُوپر ہے) لاہور حتمی طور پر بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں لوگوں کے لیے سرکاری دفتروں' کاروباری اداروں' تعلیمی درسگاہوں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں روزگار حاصل کرنے کے مواقع ہیں۔ 1941ء سے 1951ء تک دس سال میں لاہور شہر کی آبادی کے اندر پچیس فیصدی اضافہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے یہ اضافہ اس وجہ سے ہوا کہ مشرقی پنجاب کے شہری مرکزوں مثلاً امرتسر' لدھیانہ اور جالندھر سے مہاجرین آ کر لاہور میں آباد ہو گئے۔[2] لاہور کی طرح مغربی پنجاب کے دوسرے شہری مرکزوں میں بھی آبادی بڑھ گئی۔ ان شہروں کے غیر مسلم باشندے نکل کر ہندوستان چلے گئے اور ہندوستان کے شہری آ کر مغربی پنجاب میں آباد ہو گئے۔

شہری معاشرے کی بعض خصوصیات تو اس ثقافت کا مظہر ہیں جن کی وجہ سے وہ اُبھرتے ہیں' البتہ دوسری خصوصیات کا سراغ بیرونی اثرات میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں صرف ان خصوصیات' عزائم اور رجحانات سے بحث ہو گی جو پنجابی شہری زندگی

---

1. پاکستان کی مردم شماری بابت 1951ء صفحہ 39' 53۔

2. پاکستان کی مردم شماری بابت 1951ء صفحہ 42۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا نمونہ ہیں۔ مغربی پنجاب میں شہری نشو و ارتقاء اس لیے ہوا کہ مغربی پاکستانی کے جو حصے نشو و ارتقاء کے اعتبار سے پسماندہ تھے۔ ان پر صنعت و حرفت کی ترقی کا اثر پڑا۔ بنیادی معاشرتی نظام اور مشترکہ قدریں وہی رہیں جو مذہب اور رواج نے قائم کر دی تھیں۔

مغربی پاکستان کے اس علاقے میں شہری نشو و ارتقاء کا مطالعہ کرتے وقت اس کارکردگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ہندوؤں نے آزادی سے پیشتر کے دور میں دکھائی۔ دیہات میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور شہروں میں مسلمان صنعت کاروں اور مزدوروں کی تعداد کا غلبہ تھا لیکن صنعت و حرفت' کاروبار اور بینک کاری غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی۔[1] ہندوؤں نے تجارت کو بہ طور پیشہ اختیار کر رکھا تھا اس وجہ سے انہوں نے واضح اقتصادی برتری حاصل کر لی' پھر انہوں نے تعلیمی سہولتوں سے زیادہ فائدہ اٹھایا اس طرح ان کی اقتصادی برتری کا دائرہ پھیل گیا۔ سرکاری ملازمتوں' تعلیم' مالیات اور خصوصاً تجارت میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ آزادی کے بعد جب آبادیوں کا تبادلہ ہوا تو لاکھوں ہندو اور سکھ چلے گئے اور ان کی دکانوں اور مکانوں پر مہاجر قابض ہوئے تو شہری معاشرے کے مذکورہ بالا ڈھانچے میں یک قلم تبدیلی آ گئی۔ پنجاب مہاجروں کے لیے شاہراہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے ان کی آمد کا سب سے زیادہ اثر اسی علاقے میں پڑا' چنانچہ یہاں چالیس لاکھ غیر مسلموں کی جگہ عام اندازے کے مطابق ساٹھ لاکھ مسلم مہاجرین آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آنے والے مہاجروں کا ایک تہائی حصہ پاکستان کے شہری رقبوں میں آباد ہوا۔ اس لیے کہ اقتصادی بحالی کے مواقع شہروں میں زیادہ تھے۔ 1951ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی شہروں کی موجودہ آبادی میں مہاجروں کا تناسب یہ ہے: لائل پور 69' سرگودھا 69' جھنگ مگھیانہ 64' ملتان 49' لاہور 43' سیالکوٹ 32' راولپنڈی 37۔[2] اگر چہ ممکن ہے 1951ء کے بعد بعض لوگ دوسرے مقامات پر منتقل ہو گئے ہوں لیکن مندرجہ صدر تناسبات سے شہری آبادیوں میں تبادلے کے اثرات صاف ظاہر ہیں۔

ہندو اور سکھ نکل گئے تو بڑی مشکلات پیش آئیں اس لیے کہ مغربی پنجاب کی

1۔ پاکستان کی مردم شماری بابت 1951ء صفحہ 34۔

2۔ پاکستان کی مردم شماری بابت 1951ء صفحہ 75۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقتصادی اور انتظامی زندگی تقریباً تعطل میں پڑ گئی۔ بہت سے بینک تجارتی ادارے اور کارخانے بند ہو گئے۔ تجارت کے عام ذریعوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ تعلیمی اداروں' سرکاری ملازمتوں اور ہسپتالوں میں بہت سی خالی آسامیاں فوراً پر کرنی پڑیں۔ سرکاری ملازمتوں' کاروبار' خصوصاً تجارت کی تنظیم جدید کے باعث پاکستان کے معاشرے میں ایک نیا درمیانی طبقہ اور پیشہ ور گروہ پیدا ہوا۔ اس درمیانی طبقے کی خصوصیات ایک حد تک پیشرو طبقے سے مختلف ہیں جو ہندوؤں یا انگریزوں پر مشتمل تھا۔ پاکستان مذہبی بنیاد پر قائم ہوا۔ اس وجہ سے تقویٰ اور مذہبی احکام کی پابندی عمومی حیثیت میں زیادہ اہم ہو گئی۔

آج کل پاکستان میں شہری معاشرے کے جس گروہ کو سب سے زیادہ اقتدار حاصل ہے' وہ ہے جس کے قبضے میں یا تو اعلیٰ سرکاری ملازمتیں ہیں یا زیادہ ریلوے کے افسر ہیں یا دولت مند زمیندار ہیں یا فوجی افسر ہیں یا وہ کاروباری آدمی ہیں جنہوں نے خاصی دولت اور خاصا اقتدار حاصل کرلیا۔ پاکستان کے بہت سے شہریوں میں یہ احساس موجود ہے کہ دولت اور سیاسی اقتدار ہی وہ ممتاز معیار ہیں جو انسانوں کو معاشرے کے نظام میں اعلیٰ مقام پر پہنچا سکتے ہیں۔ جو افسر برسر اقتدار ہو' خواہ اس کی حیثیت کچھ ہو' خاص حقوق حاصل کر لیتا ہے اور وہ اسے مل جاتے ہیں لیکن وہ عہدے سے الگ ہو جائے تو پھر اس کی کوئی پروا نہیں کرتا' صرف عہدہ اور منصب ہی اس کے لیے وقار و حقوق کا وسیلہ ہے۔ اونچے درجے کی سرکاری ملازمتوں مثلاً مرکزی وزارتوں کے دفاتر میں یا مغربی پاکستان کی سول سروس کے اونچے عہدہ داروں کی ایک ہزار روپے سے چار ہزار روپے ماہوار تک تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ بنگلے اور موٹر کا انتظام عموماً ان کے علاوہ ہوتا ہے۔ تمام نوجوان سرکاری ملازمت کو سب سے بہتر طریق زندگی سمجھتے ہیں اور اسی کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں' کیونکہ اس میں استقلال بھی ہے اور بالائی آمدنی بھی۔ تدریس کی زندگی سے احتراز کیا جاتا ہے' کیونکہ معلمین کی تنخواہوں کا درجہ بھی کم ہے اور انہیں زیادہ اقتدار بھی حاصل نہیں ہوتا۔ سرکاری ملازمتوں میں سب سے زیادہ تنخواہیں سول سروس والوں کو ملتی ہیں اور ان کی انتظامی ذمہ داریاں وہی ہوتی ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں انڈین سول سروس والوں کی ہوتی تھیں۔

دولت کے ذریعے معاشرے کے اونچے طبقے میں داخل ہونے کا ایک اور ذریعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجارت ہے۔ تقسیم کا فوری اثر یہ ہوا کہ ہندو اور سکھ مخصوص اقتصادی حیثیت سے محروم ہو گئے اور انہوں نے میدان مسلمانوں کے چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کو ایسے کارخانے یا صنعتی تجارتی مرکز دے دیئے گئے جن کے غیر مسلم مالک انہیں چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے یا مسلمان خالی کیے ہوئے دائروں میں خود داخل ہو گئے۔ اس طرح ابتدا میں ایک تجارتی موقف پیدا کیا گیا۔ جو درجہ مہاجروں کو ہندوستان میں تھا وہ خاص حد تک قائم رکھا گیا ہے۔ سرکاری پالیسی یہی تھی کہ مہاجر مرد یا عورت کو ویسی ہی کوئی چیز دی جائے جیسی اسے ہندوستان میں حاصل تھی۔ نئے کاروبار قومی ضروریات کی بنا پر معرض وجود میں آئے۔ ہندوستان نے اپنے روپے کی قیمت گھٹا دی تھی مگر پاکستان نے نہ گھٹائی اس طرح دونوں کے درمیان فرق پیدا ہو۔ ساتھ ساتھ سیاسی کشیدگی جاری تھی۔ بیرونی ملکوں سے تجارت کے رشتے از سر نو استوار کیے گئے جو لوگ غیر ملکی مصنوعات باہر سے منگاتے تھے یا یہاں سے خام مال باہر بھیجتے تھے انہیں درآمدی لائسنسوں کے ماتحت غیر معمولی منافعے حاصل ہوئے۔ اس نظام کے مطابق مقابلہ محدود تھا اور سامان بیچنے والے کے لیے فروخت کا اچھا بندوبست ہو گیا تھا۔ مختلف چیزوں اور مصنوعات کی کمی نے آزاد تجارت کو تقویت پہنچائی لیکن چیزوں کی قیمتیں باقی دنیا کی قیمتوں سے زیادہ ہو گئیں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ صنعت و حرفت میں قیادت کی باگ ڈور مقامی آدمیوں کے ہاتھ میں رہی یا مہاجروں کے ہاتھ میں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹ کے نظام کے ماتحت جتنے کارخانے یا کاروبار موجود تھے۔ وہ مہاجروں کو ملے اور بعض اوقات یہ ایسے لوگوں کے ہاتھ آئے جنہیں ان کے چلانے کا تجربہ نہ تھا یا وہ ان میں اصلاح نہ کر سکتے تھے یا اصلاح کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔[1] اس وجہ سے شہری زندگی میں صنعتی بنیاد از سر نو قائم کرنے کا سلسلہ پختگی اختیار نہ کر سکا۔ شہروں اور قصبوں میں درمیانے طبقے کے جو لوگ رہتے ہیں۔ وہ عام طور سے یہ ہیں۔ کاروبار کرنے والے دکاندار، مختلف صنعتیں چلانے والے پروفیسر، مدرس، ڈاکٹر، قانون دان اور دوسرے پیشہ ور آدمی۔ ان پیشہ وروں کے علاوہ درمیانے طبقے اور نیچے کے طبقے کے مختلف گروہ اپنی ماہانہ

1۔ عبدالعزیز نور کی کتاب۔ ''لاہور اور سیالکوٹ کے سرحدی اضلاع میں صنعت و حرفت پر تقسیم کے اثرات۔'' شائع کردہ مجلس تحقیقات اقتصادا شاعت نمبر 105 پنجاب 1953ء صفحہ 108۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آمدنی کی بنا پر منقسم ہیں۔ درمیانے درجے کا بالائی طبقہ وہ ہے جس کی آمدنی ماہانہ پانچ سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے' اور عام کارکن انہیں سمجھا جاتا ہے جن کی آمدنی ڈیڑھ سو سے نیچے مگر ستر روپے ماہانہ کے آس پاس ہو۔ یہ عموماً وہ مزدور ہیں جو کوئی خاص فن نہیں جانتے۔[1] جیسا کہ بتایا جا چکا ہے مدرسوں کو تنخواہیں کم ملتی ہیں۔ جو مدرس بی اے پاس کر چکنے کے بعد ایک سال کی ٹریننگ لے چکا ہوا سے ایک سو تیس اور ایک سو پچاس روپے کے درمیان تنخواہ ملتی ہے۔ پچیس روپے ماہوار خاص مہنگائی الاؤنس ہے۔ ان سے کم درجے کے مدرسین کی تنخواہیں ساٹھ اور ایک سو بیس کے درمیان ہیں۔ تنخواہوں کے درجے کے لحاظ سے صرف کالجوں کے وہ پروفیسر درمیانے درجے کے بالائی طبقے سے متعلق سمجھے جا سکتے ہیں جو چار سو اور آٹھ سو روپے کے درمیان ماہانہ وصول کرتے ہیں۔ مدرسوں کو شہری آبادی میں نہ آمدنی کے لحاظ سے اور نہ اثر و رسوخ کے اعتبار سے قیادت کا درجہ حاصل ہے۔[2] ڈاکٹری کے علاوہ صرف مدرسی اور معلمی ہی کا پیشہ ہے جو رسم و رواج کے مطابق عورتوں کے لیے کھلا ہے۔ بالائی طبقے کے زیادہ تر مرد مغربی لباس پہنتے ہیں لیکن عورتوں میں سے ایک بھی نہیں جسے ایسی تبدیلی کے امکان کا بھی خیال ہو۔ بالائی طبقے کی جو عورتیں مرد و زن کی ملی جلی تقریبات میں شریک ہوتی ہیں وہ عام پنجابی لباس کے بجائے ممکن ہے ساڑھی پہن لیں۔ یہ پنجابی لباس ہی سالہا سال سے پاکستانی لباس سمجھا جا رہا ہے۔ بالائی طبقے کے بچے زیادہ تر مسیحی مشن کے سکولوں میں جاتے ہیں اور وہی لباس پہنتے ہیں جو مغربی بچوں کا عام لباس ہے۔ درمیانے درجے کے زیریں طبقے کی شہری آبادی بھی عموماً مغربی لباس ہی پہنتی ہے۔ دوکاندار شلوار یا لنگی پہن لیتے ہیں۔ زیریں اور بالائی طبقے کے مرد عموماً قراقلی یا پلش کی وہ ٹوپی پہنتے ہیں جو خاص وضع قطع کے اعتبار سے جناح کیپ کہلاتی ہے یا اور کسی قسم کی ٹوپی پہن لیتے ہیں لیکن مغربی وضع کی لمبے کناروں والی ٹوپی شاذ ہی نظر آتی ہے۔ نیچے کے طبقے یا مزدور طبقے کی عورتیں پنجابی لباس پہنتی ہیں۔ ان کے بچوں میں سے بہت کم مغربی لباس میں نظر آئیں گے۔

---

1. اعداد مجلس تحقیقات اقتصاد سے حاصل کیے گئے۔ (مصنف)
2. اس میں تھوڑی سی ترمیم ضروری ہے۔ مدرسین بھی اپنے طلبہ کے ذریعے سے مختلف حلقوں میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ (مترجم)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم یافتہ اور مغربی اوصاف واطوار کے پاکستانیوں میں اپنے مجلسی دائرے سے باہر شادیوں کا رواج بہت بڑھ رہا ہے۔ اب والدین کا عام رجحان یہ ہے کہ بیٹے کے لیے بیوی یا بیٹی کے لیے شوہر ذاتی اوصاف و خاندان کی بنا پر چنتے ہیں۔ بالائی طبقے کے پنجابیوں میں یہ میلان پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے اندر شادیاں کرنے کے بجائے اس خاندان سے رشتہ جوڑتے ہیں جو اقتصادی، تعلیمی اور مجلسی لحاظ سے برابر کی حیثیت رکھتا ہو۔ طبقاتی درجے کے لیے کوئی اصول اور ضوابط مقرر نہیں۔ اس کا انحصار دولت، عام حیثیت اور خاندانی تعلقات پر ہے۔ یہ چیزیں خاندان کے ارکان کی حیثیتوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے سمجھنا چاہیے کہ مغربی پاکستان کی شہری آبادی میں طبقات کا معاملہ معین و مقرر نہیں۔ مسلمانوں میں ذات پات کی تو کوئی قید نہیں لیکن ایسی گروہ بندی ضرور موجود ہے جس کی حیثیت ذات پات ہی جیسی ہے۔ اس میں خاص پیشے، مقام یا نسل کے لحاظ سے فیصلہ ہوتا ہے۔ مثلاً سنار، کشمیری یا مغل پکے مسلمان ہیں، ذات پات کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ چیز ہندوؤں سے مسلمانوں میں آئی، لہٰذا غیر اسلامی ہے اور وہ لوگ اسلامی مساوات پر زور دیتے ہیں۔ ہندوؤں کے برعکس مسلمان اپنے چچیرے، ممیرے، پھپھیرے اور خلیرے بھائی بہنوں اور زیادہ دُور کے رشتہ داروں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن قرابت داروں میں شادی کو ترجیح دی جاتی ہے، ذات پات کی وضع کے جو گروہ بن گئے وہ دراصل معاشرے کو رشتوں میں جکڑنے کی ایک کوشش نظر آتی ہے۔ چند گروہ اوپر، زیادہ تر گروہ بیچ میں، اور چند گروہ نیچے۔ عوام تعصباً ان گروہوں کی درجہ بندی کرتے ہیں، ان میں سے بعض کی ان کی مفروضہ بددیانتی، بزدلی یا دوسرے خصائص کی بنا پر مذمت کرتے ہیں۔ ایک پٹھان نے مغلوں کے متعلق بتایا۔ ''دیکھیے! انہیں بہادر سمجھا جاتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں یہ بڑے بزدل ہیں۔ انہیں سُرخ خون بھی نظر آجائے تو یہ بیہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ مسلمان ان لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنے پیدائشی گروہ کو چھوڑ کر اونچے درجے کے کسی گروہ سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ پاکستان میں شیخ برادری بہت زیادہ ہے اور یہ ایسا لقب ہے جو ہندو سے مسلمان ہونے والا ہر شخص اختیار کر لیتا ہے۔ لفظ شیخ کے معنی رہنما کے ہیں اور یہ عزت کا لقب ہے اور شروع میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو ابتدائی عرب حملہ آوروں کی اولاد تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہاجروں نے یہاں آ کر مختلف گروہوں سے تعلق کے جو دعوے کیے ان کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے، پھر کسی لڑکی کو مہاجر سے شادی کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اندیشہ رہتا ہے لڑکی اپنے خاندانی مرتبے سے کمتر درجے میں شادی نہ کر لے۔

مغربی پنجاب کے زیادہ تر مسلمان خواہ وہ مہاجر ہوں یا مقامی اُن گروہوں کو نیچے درجے کے سمجھتے ہیں جو اپنے ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ مثلاً صفائی کرنے والے بھنگی موچی، دھوبی، درزی، چمڑا رنگنے والے چمار، سبزیاں بونے والے یا خانہ بدوش بھنگی اور چمار سب سے نیچے درجے کے ہیں۔ اونچے درجے کے لوگ ان دو گروہوں کے ہاتھ سے کھانے کی چیز نہیں لیتے اور انہیں اپنے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے، دوکانوں سے چیزیں نہیں لینے دیتے، ان کے پاس کھڑے نہیں ہوتے اور ان سے ذاتی خدمت نہیں لیتے۔[1] مسلمانوں میں یہ تعصب موجود ہے کہ وہ غیر اہل کتاب سے کھانے پینے کی چیزیں نہیں لیتے۔[2] اگرچہ یہ تعصب زیادہ نہیں، غیر اہل کتاب ہندو اور سکھ ہیں۔ وہ مسیحیوں سے بھی کھانے کی چیزیں نہیں لیتے۔ بعض لوگ زیریں طبقے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے۔ مثلاً موچی، کنجر یا آرائیں۔[3] بھنگیوں اور چماروں کا کام خاصا غلیظ ہے اور ان کا درجہ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ لہٰذا انہیں گھر کے کام کاج کے لیے ملازم نہیں رکھا جاتا۔ جو آدمی ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چلا جائے جہاں اسے کوئی نہ جانتا ہو اور اپنا غلیظ پیشہ چھوڑ دے تو اس کا درجہ بدل جاتا ہے۔

---

1. پاکستان میں جو لوگ بھنگیوں کا کام کرتے ہیں ان میں سے زیادہ تر عیسائی ہیں یا پرانے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جو پشت ہا پشت پہلے ان کے آباء و اجداد کا تھا اور ان میں ہندوؤں کے رسم و رواج پھیل گئے۔ بلاشبہ ان سب سے چھوت چھات ہندوؤں کے زیر اثر شروع ہوئی ورنہ اسلام کسی انسان کے لیے مستقل جسمانی نجاست کا قائل نہیں۔ البتہ شرک کو اس نے قلبی نجاست ضرور قرار دیا ہے۔
2. نسلی گروہوں میں سے ارائیں بھی ایک معزز گروہ ہے جس میں سے بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے۔
3. یہ بات بالکل غلط ہے۔ مسلمان اہل کتاب سے چھوت چھات نہیں کرتے اور ان سے کھانے پینے کی چیزیں خریدتے ہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ امر یقیناً نہایت دلچسپ ہے کہ بھنگی جن کا طبقہ سب سے نیچے ہے ان کے ہاں بھی درجہ بندی کا نظام موجود ہے' اونچے درجے کے بھنگی نیچے درجے کے بھنگیوں کو اپنے برابر بیٹھنے یا براتوں میں اپنے ساتھ میل جول کی اجازت نہیں دیتے۔ بھنگیوں میں سب سے نیچے درجے کا طبقہ وہ ہے جو غلاظت اٹھاتا ہے۔

مغربی پاکستان میں آبادی کے ردوبدل سے شہری آبادی کی حیثیت پر بہت گہرا اثر پڑا' لہٰذا پیشوں یا کاروبار کی بنا پر گروہ بندی مشکل ہے۔ البتہ ایک حد تک شہادت ملتی ہے کہ جو لوگ باہر سے آئے وہ اپنے نسلی گروہوں اور خاندانی پیشوں سے زیادہ وابستہ ہیں خصوصاً غیر تعلیم یافتہ نیچے کے طبقے۔ بہر حال اس سلسلے میں یہ بھی ظاہر ہے کہ روزی پیدا کرنے کی ضرورت انہیں مجبور کرتی ہے اور جس ذریعے سے بھی روزی پیدا ہو اسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے موروثی پیشے نئے اقتصادی حالات پر قربان کرنے پڑے۔ مہاجروں میں سے جو لوگ ہاتھ سے کپڑا بُنتے تھے وہ یہاں آ کر دھاگہ' سرمایہ اور فروخت کے اسباب مہیا نہ ہونے کے باعث سخت پریشان ہوئے اور ہزاروں لوگوں نے نئے پیشے اختیار کر لیے لیکن بہت سے ایسے لوگ بھی ملے جنہوں نے اپنے خاندان کے روایتی پیشے جاری رکھے۔ مثلاً کوئی کشیدہ کار رہا' کوئی دوکاندار بن گیا یا طبیب یا لوہار وغیرہ۔

مکانوں کی حیثیت خاندان کی آمدنی کی سطح پر یا مہاجر ہونے کی حیثیت میں الاٹمنٹ پر موقوف ہوتی ہے۔ لاہور کے پرانے شہر میں اور اسی طرح دوسرے پنجابی شہروں کے حصوں میں اکثر خاندانوں کے پاس متعدد کمرے ہیں اور یہ کمرے ایسے ہیں جن میں چار چار چھ چھ آدمی رہ سکیں' لیکن صحن یا چھت پر رہنے کا انتظام شاذ ہی ملے گا۔ ایسے مکانوں میں پردے کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں کمروں کے اندر بند رہیں۔ اس لیے کہ جب وہ ضروری کاموں کے لیے باہر نکلیں گی تو برقعے پہن کر جائیں گی۔ باہر جانے کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے۔ اس لیے کہ درمیانے درجے کے اور زیادہ تر بالائی خاندانوں کے دو یا زیادہ نوکر ضرور ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ دوکانوں سے چیزیں لائیں' کھانا پکائیں اور گھر کے کام کاج میں مدد دیں۔ ایسی عورتیں گھریلو ذمہ داریوں سے نسبتاً آزاد ہوتی ہیں' البتہ وہ بچوں کی دیکھ بھال یا کھانا پکانے میں حصہ لیتی ہیں۔ درمیانے درجے کے زیریں خاندان میں پردے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پابندی زیادہ ہے۔ جہاں کوئی نوکر موجود نہ ہو وہاں مرد خود روزانہ کھانے پینے کی چیزیں دوکانوں سے لاتے ہیں' بلکہ کپڑا یا گھر کا دوسرا سامان بھی وہی خریدتے ہیں۔

شہروں کا رہن سہن کا درجہ دیہات کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے' اس لیے کہ شہروں میں زیادہ سہولتیں فراہم ہوتی ہیں۔ یہاں خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ تمام جنسیں پیسے دے کر خریدنی پڑتی ہیں۔ جس خاندان کے تمام لوگ یکجا رہتے ہوں اور اس کا سرمایہ بھی اکٹھا ہو' وہاں اقتصادی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس لیے کہ بے روزگار افراد نیز بچوں اور بوڑھوں کی دیکھ بھال وہ لوگ کرتے ہیں جو برسر روزگار ہیں۔ لوگ پسند نہیں کرتے کہ گھر کی عورتیں باہر جا کر کسی کا کام کریں۔ اس لیے پنجاب کے شہروں میں ایسی عورتوں کی تعداد کم ہے جو خود روزی پیدا کرتی ہیں۔ بہت کم عورتیں گھریلو صنعتوں میں وقت صرف کرتی ہیں۔ مثلاً کاتنا یا سینا خواہ وہ سب کچھ خاندان کے افراد کی ضرورت ہی کے لیے ہو۔ محض صنعت کاروں اور مزدوروں ہی میں نہیں بلکہ تعلیمی اور مجلسی اعتبار سے اونچے درجے کے لوگوں میں بھی والدین شادی شدہ یا غیر شادی شدہ بیٹے اور غیر شادی شدہ بیٹیاں سب لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔ جو طبقے مجلسی اعتبار سے زیریں سمجھے جاتے ہیں ان میں یکجا رہنے کا دستور بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کہ گھر کے تمام مرد مشترکہ پیشے میں شریک ہوتے ہیں۔ کام کرنے والے تمام لوگوں کا سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے۔ باپ ہر فرد کی ضرورت کا اندازہ کرتے ہوئے روپیہ تقسیم کر دیتا ہے۔ جن بیٹوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے گھر الگ بنا لیتے ہیں یا وہ تعلیم یافتہ بیٹے جو نئے مقامات پر منتقل ہو جاتے ہیں' اپنا سرمایہ الگ رکھتے ہیں۔ درمیانے درجے کے زیریں طبقے یا مزدوروں کے پاس جو مکان ہیں ان کی حیثیت خاصی پست ہے۔ زیادہ تر حالت یہ ہے کہ ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ آدمی رہتے ہیں اور اکثر بجلی' پانی' غسل خانے' باورچی خانے یا بیت الخلا کا بھی انتظام نہیں ہوتا۔ مہاجروں کو جو مکان ملے وہ درجے سے بہت گرے ہوئے تھے' اس لیے کہ مکانوں کی کمی تھی۔ نئے مکان بنائے نہ جا سکے اور آبادی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ مہاجروں نے عموماً بے ترتیبی سے اپنے لیے پناہ گاہیں تیار کر لیں اور بعض نے یہ سب کچھ ایسی زمینوں پر کیا جہاں پر ان کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ پناہ گاہیں بہت ہی معمولی طریق پر بنائی گئی تھیں۔ اس کا ثبوت یوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملتا ہے کہ 1955ء میں لاہور طغیانی کا شکار ہوا تو ایسے چودہ فیصد مکان گر گئے۔[1]

پنجاب کے دیہاتی اور شہری دونوں حلقوں میں فرد کی زندگی پر خاندان کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ نسل کے علاوہ زیادہ تر جائیداد بھی آبائی سلسلے ہی کے ذریعے سے ملتی ہے۔ اس وجہ سے جس شخص کی عمر خاندان میں سب سے زیادہ ہو، اسے زیادہ اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ خاندان کی جائیداد اور آمدنی کا پورا کنٹرول باپ کے قبضے میں رہتا ہے اور وہ ارکان خاندان کے طرزِ عمل کا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ جس چیز سے وقار پر اثر پڑے اسے روک دیتا ہے۔ جو لوگ باپ کی ناپسند کا باعث بنیں انہیں سزا دی جاتی ہے، اگر وہ بچے ہوں تو زدوکوب کیا جاتا ہے۔ اگر وہ جوان ہوں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وراثت سے محروم کر دیئے جاؤ گے اور خاندان سے نکال دیئے جاؤ گے۔ جس ملک میں مجلسی درجہ اور روزگار خاندانی حیثیت سے اتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں وہاں اسے محض ایک دھمکی نہیں سمجھا جاسکتا۔ باپ کو یا خاندان کے سب سے بڑے مرد رکن کو مجلسی یا اقتصادی اعتبار سے جو اقتدار حاصل ہوتا ہے اس کی حیثیت بہت بلند ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ خاندان پر چھا جاتا ہے۔ خاندان کے اندر عورتوں کا کام محض یہ ہے کہ کھانا پکائیں اور بچوں کی دیکھ بھال کریں۔ عورتوں کی سب سے بڑی خوبیاں یہی سمجھی جاتی ہیں کہ وہ گھر کے کام کاج کی ماہر ہوں اور بچوں کی نگرانی کا حق ادا کر سکیں۔ مرد عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور انہیں ہر تکلیف سے بچاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ عورتیں زیادہ رقیق القلب اور محبت پرور ہو جائیں۔ چنانچہ ماں بیٹیوں میں گہرا پیار ہوتا ہے اور بیٹیاں شادی سے پہلے سب کچھ ماں ہی سے سیکھتی ہیں۔ بیٹوں کے لیے بھی طبعاً ماں کے دل میں بڑی محبت ہوتی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ بیٹے ماں کے لیے بڑھاپے میں سہارا بن جاتے ہیں۔ چونکہ بچپن میں ماں اور بچوں میں گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے بچوں کے دل میں ماں کے ساتھ جیسے مستحکم جذباتی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں، ویسے باپ کے ساتھ پیدا نہیں ہوتے۔ وجہ یہ کہ باپ ڈسپلن پر زور دیتا ہے اور احترام کا مطالبہ کرتا ہے، چنانچہ وہ زیادہ ہیبت ناک بن جاتا ہے۔

---

[1] پنجاب یونیورسٹی میں ایک شعبہ مجلسی کام کے لیے بنا ہوا ہے۔ اس نے مکانوں کا ایک اندازہ اکتوبر 1955ء میں مرتب کیا تھا یہ اسی بیان پر مبنی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایتی اسلامی معاشرے میں صرف مرد جماعتی یا عوامی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں عورتوں کی دلچسپیاں طبعاً خاندان اور گھرانے تک محدود رہتی ہیں۔ اسی چھوٹی سی دنیا میں عورتیں مختلف وظیفے ادا کرتی ہیں جو پیدائش اور شادی کے اردگرد گھومتے ہیں۔ بیٹیوں اور بہنوں کی حیثیت میں انہیں بہت عزیز رکھا جاتا ہے۔ خاندان کی شہرت زیادہ تر لڑکیوں کی روش اور ان کی شادیوں کے موقع پر جشن و شادمانی کے انتظامات کی وسعت پر موقوف ہوتی ہے۔ والدین اور بھائی بیٹیوں اور بہنوں کی روش پر شادی سے پیشتر اور شادی کے بعد گہری اور محافظانہ نظر رکھتے ہیں اور جب کوئی شخص عورت کو بُرا بھلا کہتا ہے یا طلاق دیتا ہے تو وہ امداد کے لیے والدین اور بھائیوں ہی کی طرف دیکھتی ہے۔ شادی کے بعد دلہن ایک نئے خاندان میں داخل ہوتی ہے۔ چونکہ قریبی رشتہ داروں میں باہم شادیوں کا دستور ہے اس لیے نئے خاندان کو اجنبی نہ سمجھنا چاہیے۔ وہاں اس کا عام برتاؤ بہت اچھا ہونا چاہیے۔ ساس اور شوہر دونوں کی ماتحتی اسے قبول کرنی پڑتی ہے جہاں خاندان کا نظام ایک آدمی کے ماتحت ہو وہاں مرکزی تعلق باپ اور بیٹے کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ بیوی اور شوہر کے درمیان' جیسا کہ مغرب کے شادی شدہ خاندانوں میں ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جائیداد کی وراثت پر خاص زور دیا جاتا ہے' جو اصلاً ذکور میں منتقل ہوتی ہے۔ بیٹے کی شادی کے انتشار انگیز اثرات کا امکان اس وجہ سے گھٹ جاتا ہے کہ عام دستور کے مطابق شوہر اور بیوی کے تعلقات جنسیت تک محدود رہتے ہیں' خصوصاً شادی کے ابتدائی دَور میں۔ اس قسم کی خاندانی زندگی زیادہ استحکام یوں پاتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کی سرگرمیوں کے حلقے الگ الگ ہیں۔ شوہر کام کاج نیز فرصت کے اوقات زیادہ تر مردوں میں گزارتا ہے۔ بیوی' خواہ گھر کا کام کاج کرے یا رشتہ داروں سے ملنے کے لیے جائے یا میلے میں شریک ہو یا کسی بزرگ کے مزار کی زیارت کے لیے نکلے' ہمیشہ اپنے خاندان کی عورتوں کے ساتھ رہے گی۔ جب تک بیوی کے بچہ پیدا نہ ہو' خصوصاً بیٹا' اس وقت تک اس کی شادی محفوظ شکل اختیار نہیں کرتی اور اس کا وقار کم رہتا ہے۔ عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اجنبی ہے۔ اگر خاندان کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اسی کو ملزم گردانا جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے متعلق جداگانہ برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً بیٹیوں اور بہنوں کی ہر چیز انگیز کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لی جاتی ہے لیکن بہو اور بیوی پر نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے خاندانوں میں جو کشیدگیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بخار بہو اور بیوی پر نکالا جاتا ہے۔[1]

عورتیں زنانہ وظائف کو خوشگوار بنانے کے لیے اچھے کپڑے اور زیور استعمال کرتی ہیں' خوشبوئیں لگاتی ہیں' ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی لگاتی ہیں' خوبصورتی کو بڑھانے کی یہ تمام تدبیریں شادی کے موقع پر درجۂ کمال کو پہنچتی ہیں' جو لڑکی کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہوتا ہے۔

مردوں کے متعلق عام توقع ہوتی ہے کہ وہ شہزور اور قوی ثابت ہوں۔ اپنے آپ کو منظم رکھیں اور عورتوں کے مقابلے میں کم راحت طلب ہوں۔ مسلمان مردوں کے لیے از روئے شریعت ریشمی لباس یا سونے کی کوئی چیز استعمال کرنا ممنوع ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر مجاہدانہ روح تازہ رکھیں۔ قرآن مجید میں متعدد ہدایات ملتی ہیں جن سے عورتوں اور مردوں کے وظیفے کا فرق واضح ہوتا ہے۔

جو مرد اپنا وظیفہ ترک کر دیتے ہیں اور عورتوں کا لباس اختیار کر لیتے ہیں وہ لباس کے متعلق قرآن کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔ یہ ہیجڑے ریشمی کپڑے اور سونے کی چیزیں پہنتے ہیں اور جب خاص موقعوں پر مانگنے کے لیے نکلتے ہیں تو عورتوں کی دوسری خصوصیات بھی اختیار کر لیتے ہیں ہیجڑوں کو عام طور پر عورتوں کی طرح کمزور اور بزدل سمجھا جاتا ہے۔ لباس کی تبدیلی سے شخصیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ مردوں میں ہیجڑے بننے کی مثالیں تو ملتی ہیں لیکن کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی عورت نے مردانہ لباس پہنا ہو یا مردانہ طور طریقے اختیار کر لیے ہوں۔

زیادہ دولت مند اور معنویت مآب خاندانوں کو چھوڑ کر عام شادیاں وہاں ہوتی ہیں جہاں کم یا زیادہ قرابت داری موجود ہو۔ چچیرے' ممیرے یا پھپھیرے اور خلیرے بھائی بہنوں میں شادیاں عام ہیں اور انہیں ترجیح دی جاتی ہے' اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا

[1] یہ تبصرہ بہت ہی قلیل تناسب کے متعلق درست سمجھا جا سکتا ہے اور اس میں بیشتر چیزیں جس عمومیت سے پیش کی گئی ہیں ان کے لیے عملی زندگی سے ثبوت پیش کرنے بہت مشکل ہوں گے۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ رواج یہی ہو گیا ہے اور ماں باپ ان خاندانوں میں شادیاں پسند کرتے ہیں جن کے عادات و رسوم ملتے ہوئے ہوں اور جن کے کردار سے پوری آگاہی ہو۔ ایک اور سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جو والدین اپنی بیٹی کی شادی بھائی یا بہن کے بیٹے سے کرتے ہیں وہ رشتہ داری کے باعث بیٹی کو بُرے برتاؤ سے بہتر طریق پر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ نیز اگر کوئی داماد دوسری شادی کرنا چاہے تو اسے روک سکتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرابت داروں میں شادی کرنے سے اقتصادی فوائد مدنظر رہتے ہیں' یعنی تقسیم میراث کے سلسلے میں۔ دیہات کی طرح شہروں میں بھی دلہن کے خاندان کو شادی کے سلسلے میں زیادہ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ عام رَواج کے مطابق زیورات' کپڑے اور گھر کے استعمال کی چیزیں خاصی مقدار میں دینی پڑتی ہیں۔

پنجابی مسلمانوں میں شادی کے موقع پر بیٹی کو میراث کا حصہ کسی نہ کسی شکل میں دے دیا جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قانون شرع کی پابندی ہے جس کے مطابق بیٹیوں کے لیے جائیداد میں بیٹوں سے نصف حصہ مقرر ہے۔ بہت سے خاندان جو پہلے اس اسلامی حکم کے پابند نہ تھے اب پاکستانی قوانین کے ماتحت بیٹیوں کو حصہ دے رہے ہیں۔ یہ حصہ یا تو شادی کے موقع پر دے دیا جاتا ہے یا والدین کی وفات کے بعد بیٹی کو مل جاتا ہے۔ بالائی طبقے اور زیریں طبقے کے پنجابیوں میں شادی کے موقعے پر دولہا بھی دلہن کے نام ایک رقم لکھتا ہے۔ یہ رقم حق مہر کہلاتی ہے۔ اس کی مقدار دولہا کے خاندان کی دولت پر موقوف ہے اور اگر بیوی کو طلاق دی جائے تو اس رقم کا ادا کرنا حد درجہ ضروری ہے۔ حق مہر دولہا کے لیے ایک قسم کی پابندی ہے جو بیوی کو طلاق دینے سے روکتی ہے۔ ورنہ عام حالات میں صرف تین مرتبہ لفظ ''طلاق'' دہرا دینے سے شادی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔[1] طلاق اس صورت میں بھی واقع ہو جاتی ہے جب حقِ مہر ادا نہ کیا ہو اور بہت سی مطلقہ عورتیں حق مہر وصول کرنے کے لیے عدالتوں میں دعویٰ کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

اگرچہ شہروں میں پنجاب کے دیہات کی طرح شادیوں کی تقریبات پر رنگ رلیوں کا سلسلہ تین دن تک جاری نہیں رہتا' پھر بھی جن گھروں میں شادی ہو انہیں خاصا خرچ

---

[1] طلاق کا یہ طریقہ غلط ہے۔ شرعی طلاق کی صورت بالکل جداگانہ ہے۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مہاجر بھی اپنی لڑکیوں کی شادیاں رواج کے مطابق کرتے ہوئے قرض دار ہو جاتے ہیں۔ رواج یہ ہے کہ لڑکی کو جہیز اور سامان دیا جائے اور سینکڑوں آدمیوں کو کھانا کھلایا جائے۔ یہ خرچ عزت رکھنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ خرچ نہ کیا جائے تو رشتہ دار اور واقف کار باتیں بنائیں گے۔ اگرچہ دیہات کے برابر نہیں، تاہم شہروں میں بھی نکتہ چینی سے بچنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عزت رکھنے کا یہ بھی ایک جزو ہے۔

چونکہ پردے کا رواج عام ہے، اس لیے والدین کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کے لیے بر تلاش کریں۔[1] انتخاب عموماً رشتے داروں میں سے ہوتا ہے اور اس کے وجوہ پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ اگر رشتے داروں میں عمر کی کمی بیشی کے باعث موزوں بر نہ مل سکے یا دشمنی کے باعث قرابت داروں میں شادی نہ ہو سکے تو پھر رشتے داروں سے باہر اپنی ہی ذات میں سے کوئی موزوں بر انتخاب کیا جاتا ہے۔ بیٹا اپنے مجلسی گروہ سے باہر بھی شادی کر سکتا ہے اور بسا اوقات کرتا ہے لیکن اونچے درجے کے مجلسی گروہوں، مثلاً راجپوتوں اور پٹھانوں، میں بیٹی کو ایسی اجازت نہیں دی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خون میں آمیزش کے اندیشے پر مبنی ہے۔ گویا سمجھا جاتا ہے کہ عورت کے بجائے مرد اجنبی اختلاط کو جذب کر لینے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔ عورت غیر برادری میں جائے تو اپنی حیثیت کھو بیٹھے گی اور خاندان کا وقار بھی اس طرح گھٹے گا۔ اگر کسی خاندان کی لڑکی کا رشتہ عزیزوں میں نہ ہو سکے تو اس کا سر نیچا ہو جاتا ہے، یعنی وقار گھٹ جاتا ہے۔ لیکن جن لڑکیوں نے اونچے گروہوں میں شادیاں کیں ان کی تعداد پیش نظر رکھتے ہوئے ظاہر ہوتا ہے کہ انتخاب کی بنیاد صرف خاندانی فخر نہ تھا بلکہ اونچے درجے میں شادی کی غرض سے بھی انتخاب عمل میں آیا۔ اگر اچھے گھرانے کا لڑکا ادنیٰ درجے کی لڑکی سے شادی کرے تو اس کے بچوں پر اثر پڑے گا۔ اس لیے کہ اس قسم کی مخلوط شادیوں کے بچے نسلی اعتبار سے خالص نہیں سمجھے جاتے۔ مخلوط شادیوں کی بیٹیوں کے لیے باپ کی

---

[1] صرف پردہ اس کی وجہ نہیں۔ البتہ پردے یا مرد و زن کے حلقوں کی علیحدگی کے باعث ان میں میل جول کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا والدین موزوں بر تلاش کرتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ والدین کو افراد اور خاندان کے حالات کا زیادہ علم ہوتا ہے اور ان کے فیصلے عموماً اولاد کی بہتری پر مبنی ہوتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذات میں شادی کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ ان کا درجہ گھٹ جاتا ہے۔ مخلوط شادیاں عموماً وہی ہوتی ہیں جب کوئی مرد دوسری یا تیسری بیوی کے لیے کسی خوبصورت عورت کو منتخب کر لیتا ہے۔ بیویوں کے مجلسی درجات میں اختلاف سے خاندان کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔

شیخوں کے ایک گروہ نے دستور بنالیا تھا کہ شیخ مرد صرف ایک شیخ عورت سے شادی کرسکتا ہے۔ ایک تاجر نے جو تعدد ازواج کی طرف مائل تھا' اس حد کو یوں توڑا کہ زائد بیویاں دوسرے گروہوں سے منتخب کرلیں۔ ایک سے زیادہ شادیاں پنجاب میں ہوتی ہیں' لیکن ان کے متعلق اعداد نہیں مل سکے۔ بہت سے آدمیوں کو احساس ہے کہ جب دو یا زیادہ بیویاں کسی گھرانے میں آجاتی ہیں تو گھریلو زندگی میں ہم آہنگی مشکل ہوجاتی ہے۔ دوسرے لوگ صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ہم ایک سے زیادہ بیوی رکھ ہی نہیں سکتے۔ البتہ اولاد کے لیے دوسری شادی کرلینا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ تعدد ازواج کے حق میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ اسے اس فحش کاری پر اخلاقی برتری حاصل ہے جس کا رواج مغرب میں عام ہے۔

اسلام میں طلاق کی اجازت ہے' مگر چونکہ پاکستان میں طلاق کا کوئی قانونی ریکارڈ موجود نہیں' اس لیے تعداد معلوم نہ ہوسکی۔ جن لوگوں پر اسلام کا گہرا اثر ہے اور وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ان میں طلاق قریباً خارج از بحث ہے' لیکن پیشہ ور طبقوں اور دولت مندوں میں طلاق کو غیر مناسب شادی کا حل سمجھا جاتا ہے اور دوسری شادی پر اسے ترجیح دی جاتی ہے' اگرچہ دوسری شادی بھی کی جاسکتی ہے۔ تعددِ ازواج[1] کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کو زیادہ جوان اور خوبصورت بیوی کے لیے پہلی کو طلاق دینے کی ضرورت نہیں۔ حق مہر ادا کرنے کے بجائے نئی بیوی لے آنا عموماً ارزاں ہوتا ہے۔ اگر پہلی بیوی کو طلاق دی جائے تو بہرحال حق مہر ادا کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی عورت باہم رضامندی کے بجائے کسی اور وجہ سے طلاق حاصل کرنا چاہے تو اسے عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔ پنجابی عورتیں طلاق نہیں لیتیں' جب تک کہ حد درجہ مجبور نہ ہوجائیں' اس لیے کہ مطلقہ عورت کے خلاف

---

1 اب یہاں عائلی قانون نافذ ہے اور تعددِ ازواج پر کڑی پابندی ہے۔ دوسرے نکاح کے لیے مرد کو پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرلینا اب ایک ضروری شرط ہے...... ناشر ستمبر 1964ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک خاص جذبہ ہے اور اس کے لیے دوبارہ شادی کر لینا مشکل ہوتا ہے۔ قانون شریعت کے مطابق سات سال کی عمر سے اوپر کا لڑکا اور چودہ سال سے اوپر کی لڑکی باپ کے خاندان کو مل جاتی ہے' بشرطیکہ مطلقہ عورت دوسری مرتبہ شادی کرے۔ اس سے کم عمر کے بچے عورت کا گھرانا لے جاتا ہے۔ جس عورت کو اپنے بچے سے محبت ہو' اس کے لیے یہ پابندیاں طلاق میں تامل کا باعث ہو جاتی ہیں۔ پھر معاشرے میں اپنی حیثیت قائم رکھنے کا بھی مسئلہ ہے اور ظاہر ہے کہ عورتیں نہ خود روزی کمانا پسند کرتی ہیں اور نہ اسے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ تمام عوامل رشتۂ شادی کے استحکام میں مدد دیتے ہیں۔ اِلا یہ کہ بیوی یا شوہر کی طرف سے ایک دوسرے کو غیر معمولی اشتعال دلایا جائے۔

چونکہ معقول وجوہ کے سوا تمام مسلمانوں کے لیے شادی ضروری ہے' اس لیے اس کا رواج عام ہے۔ قرآن کے حکم اور خاندانی عزت کا تقاضا یہی ہے کہ بیٹے اور بیٹیوں کی شادی مناسب عمر میں ہو جائے۔ جو والدین اس سلسلے میں ضروری انتظامات نہیں کر سکتے وہ رشتے داروں اور ہمسایوں کی طرف سے سخت نکتہ چینی کا ہدف بن جاتے ہیں۔ پاکستانی ثقافت کا مرکزی حصہ یہ ہے کہ نسل بڑھے اور بچوں کی صحیح پرورش ہو۔

عورتوں کی عفت اور مردوں کی اخلاقی روش کے پیش نظر مردوں اور عورتوں پر خاص پابندیاں لگا دی گئی ہیں' خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ یہ پابندیاں اس بنا پر لگائی گئی ہیں کہ اسلامی قانون کا تقاضا یہی ہے۔ خاندان اور معاشرے کا استحکام بھی اسی طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔ اسلام میں عورتوں کی حیثیت کے متعلق جو تحقیق حال میں ہوئی اس میں بیان کیا گیا ہے:

> جنسی پاکیزگی اور عفت وہ بنیادی مجلسی قدریں ہیں جن کی حفاظت کا اسلام حکم دیتا ہے۔ لہٰذا اسلام ان قدروں کو پورے نظام میں اولین اہمیت کی مالک سمجھتا ہے۔[1]

جنسی پاکیزگی کی غرض سے عورتوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ساتر اور حیادارانہ لباس پہنیں۔ چہرے اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو۔ جب انہیں

---

[1] محمد مظہر الدین صدیقی۔ ''عورتیں اسلام میں''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے قریبی رشتے داروں سے باہر جانا پڑے‘ جہاں دوسرے آدمی بھی دیکھتے ہوں‘ وہاں زیور اور جاذب لباس سے پرہیز کریں۔ گھر سے باہر آدمیوں اور عورتوں کا میل جول محدود ہے۔ گھر کے اندر بھی اس بارے میں پابندیاں ہیں۔ پورا برتاؤ جنسوں کی علیحدگی کے تصور کے مطابق منظم کر دیا گیا ہے اور زندگی کے تمام پہلو اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جن لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہو وہ بلوغ کے بعد ایک دوسرے سے نہ ملتے ہیں نہ بات چیت کرتے ہیں نہ اکٹھے کسی عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ مبادا میل جول ایک دوسرے کے لیے ترغیب کا باعث بن جائے۔ اسی سلسلہ میں پردے کی پابندی ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں محدود رہیں اور جب باہر نکلیں جہاں مردوں کی نظر پڑتی ہو تو پردہ کر کے یا برقعہ پہن کر ہی نکلیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کو نہیں دیکھتا تو اس کے متعلق برا خیال دل میں نہیں آ سکتا۔ اس پابندی کی وجہ سے مرد اور عورت کی علیحدگی پر بڑا زور دیا گیا۔ اب عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ جو عورتیں پردہ نہیں کرتیں وہ ضرور اخلاق کے راستے سے ہٹ سکتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا بے تکلف میل جول جس پر مغرب میں عمل ہے‘ ان برائیوں کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جو اخلاقی اعتبار سے تباہ شدہ اور بے لگام معاشرہ پیدا کرتی ہیں۔

جنسیت اور مذہب‘ یہ ثقافت کے دو پہلو ہیں جنہیں پنجاب کے زیادہ تر شہری ذاتی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس سلسلے میں عقل کو دخل نہیں دیتے۔ یہ عناصر پردے کے نظام میں جمع ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے عورتوں کے طرز عمل نیز عورتوں اور مردوں کے متعلقہ وظائف کا مسئلہ اتنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس کا کوئی عقلی حل نہیں نکالا جا سکتا۔ پاکستان ایک نئی قوم کی صورت میں ابھرا ہے اور عام لوگوں کو پردے کے نظام کی بندشوں سے آگاہی ہوتی جا رہی ہے‘ چنانچہ گزشتہ دس سال میں یہ بندشیں ایک حد تک کم ہو گئی ہیں۔ لاہور‘ کراچی اور دوسرے شہروں کے بازاروں میں عورتیں برقعے اوڑھ کر اور ان کے بغیر زیادہ تعداد میں نکلنے لگی ہیں۔ اب پہلے سے زیادہ تر لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں جا رہی ہیں اور پہلے سے زیادہ خواتین سرکاری مجلسی تقریبات میں شریک ہو رہی ہیں جس حد تک عورتوں اور مردوں کے حلقوں کی علیحدگی اور معاشرے میں عورتوں کی شرکت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حق کا تعلق ہے پرانے نظریات بدستور قائم ہیں۔ جو نوجوان اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ اب مردوں اور عورتوں کے حلقوں کی علیحدگی ضروری نہیں رہی' بزرگ انہیں بتا دیتے ہیں کہ اگر دونوں گروہوں میں آزادانہ میل جول کا موقع پیدا کر دیا گیا تو اخلاق بگڑ جائیں گے اور شادیوں کے رشتے ٹوٹنے لگیں گے۔ یورپ اور امریکہ میں آزادانہ میل جول کا نتیجہ یہی نکلا۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مرد تر غیبات کا مقابلہ نہیں کر سکتے' لہٰذا پردہ ضروری ہے' لیکن ظاہر ہے کہ یہ دلیل داخلی اخلاقی گرفت کی کمزوری کا نشان ہے اور یہ گرفت ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ شہری حلقوں میں خارجی میکانیکی کنٹرول کی جگہ لے سکے۔[1]

تعددِ ازدواج مردوں کے حیاتیاتی خصائص کی بنا پر ان کا طبعی حق سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مغرب میں فحش کاری کا جو سلسلہ جاری ہے۔ یہ اس کا توڑ ہے لیکن اس پہلو پر غور نہیں کیا جاتا کہ خود پنجاب کے شہری علاقوں میں بھی فحش کاری موجود ہے۔[2] جہاں تک عملی حالات کا تعلق ہے تعددِ ازدواج ہرگز عام نہیں اور اس موضوع پر حال میں جو مضامین شائع ہوئے' ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے مخالفین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بیویوں کے ساتھ عدل' یعنی مساوی برتاؤ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان شادی کے دائرے میں یا اس سے باہر رفاقت کا کوئی تصور نہیں۔ مرد اپنے دنیاوی یا ذہنی مشاغل میں بیویوں کو شریک نہیں کرتے' اس لیے کہ یہ مشاغل صنفِ نازک کے دائرے سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔ مشترکہ خاندان میں مردوں اور عورتوں کی مجلسی زندگی اور

---

[1] پردے کے متعلق ساری بحث حد درجہ سطحی انداز میں کی گئی ہے تعجب ہے کہ یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص معاشرے کی بنیادی چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ (مترجم)

[2] تعدد ازدواج کے متعلق مقالہ نگار نے بہت ہی عامیانہ نقطہ نگاہ یہاں پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معلومات علمی نقطہ نگاہ سے سود مند نہیں سمجھی جا سکتیں۔ بلاشبہ اسلام میں تعددِ ازدواج کی اجازت ہے' لیکن عدل بہر حال اصل اساس ہے۔ قرآن مجید کا واضح حکم ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو لازماً ایک شادی پر اکتفا کرو۔ اس اجازت پر بھی معاشرے کی عمومی حالت اور مرد و زن کی تعداد میں ایک حد تک توازن کا انداز کیے بغیر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مقصود اول معاشرے کی صحت ہے نہ کہ افراد کی ایسی بے لگامی جسے ہوس رانی کے مترادف سمجھنا چاہیے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرگرمی شرعی قانون کی بنا پر الگ الگ ہوتی ہے۔ ممکن ہے محبت کی بنا پر بھی شادیاں ہوں' لیکن عام طور پر اس عامل کے بغیر بھی شادیوں کا رشتہ مستحکم ہوتا ہے۔ عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ اگر ذاتی جذب وکشش کی بنا پر اپنے انتخاب سے شادی کی جائے تو وہ کامیاب نہیں ہوتی اور جن شادیوں کا انتظام والدین یا عزیز کر دیتے ہیں وہ زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ افراد خاندان کا تعاون یا عدم تعاون شادیوں کو کامیاب بنانے میں ایک فیصلہ کن عامل بن جاتا ہے۔ اگر مرد یا عورت بطور خود انتخاب کا فیصلہ کر لیں تو سمجھا جاتا ہے کہ حقیقی بااختیار آدمیوں کے اختیار سے پہلو تہی کی گئی اور ایک ایسے عمل کا ارتکاب ہوا جو ناقابل قبول ہے۔

اسلامی احکام اور رواج کے مطابق عورتوں کی سرگرمیاں خاندان کے اندر کی سرگرمیوں تک محدود رہنی چاہئیں۔ دیہات میں اقتصادی ضرورت کی بنا پر عورتیں مجبور ہوتی ہیں کہ خاص اوقات میں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کریں۔ شہروں میں جن لوگوں کی آمدنی بہت کم ہے ان کی عورتیں اپنے روزگار کے لیے باہر نکلنے پر مجبور ہیں۔ پردے کی پابندی محض ایک وقار کا مسئلہ رہ گئی ہے اور یہ صرف انہی لوگوں کے لیے مذہبی فرض رہ گیا ہے جو اسے بجا لانے کی استطاعت رکھتے ہوں۔[1] درمیانے طبقے کا درجۂ زیریں اس کا سختی سے پابند ہے اور اس درجے کے آدمی اپنی عورتوں کو بازار سے بے نیاز رکھنے کے لیے انتہائی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ ماں اور بیوی کی حیثیت میں عورت کے وظائف پر زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ باقی تمام دوسرے اس کے لیے ناسازگار بن گئے اور اگر گھر سے باہر سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہنا لازم ہو تو ان عورتوں کو یہ ذمہ داری اٹھانا چاہیے جو حد یاس کو پہنچ چکی ہوں اور جن کا مردانہ دائروں میں آنا جانا جنسی اخلاقی یا خاندانی استحکام کے نقطۂ نگاہ سے نقصان رساں نہ ہو۔ جو سرگرمی بیوی اور ماں کی حیثیت میں عورت کے حقیقی وظیفے کے خلاف سمجھی جائے خاندان کے بزرگ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ روش تعلیم کے سلسلے میں اقتصادی بار کے علاوہ لڑکیوں کی تعلیم میں مزاحمت کا باعث ہے۔ مردوں سے امید رکھی جاتی ہے کہ وہ خاندان کی تمام خواتین کی کفالت کے ذمہ دار رہیں گے' خواہ وہ ان کی بیویاں ہوں یا غیر شادی شدہ بہنیں۔ اگر عورتوں کو اپنی روزی پیدا کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنی پڑے تو یہ امر خاندان کے لیے بدنامی کا باعث سمجھا

---

[1] یہ بھی پردے کا بالکل غلط تصور ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا ہے۔ اوسط طبقے کی کھاتی پیتی لڑکیاں اچھی تعلیم پاتی ہیں لیکن وہ بھی اپنی ہنرمندی اس وقت تک استعمال نہیں کرتیں جب تک طلاق یا شدید اقتصادی ضرورت انہیں مجبور نہ کر دے۔

چونکہ عورتوں کے لیے گھر سے باہر کام کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے وہ عموماً ملازمت نہیں کرتیں۔ اگرچہ لاہور نیز دوسرے شہروں میں صنعت وحرفت خاصی ترقی کر چکی ہے۔ 1955ء میں لاہور ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں تقریباً تین سو عورتوں نے اپنے نام تعلیم یا گھریلو ملازمت کے لیے رجسٹر کرائے تھے۔ ان کے مقابلے میں چھتیس ہزار مردوں کے نام رجسٹر ہوئے تھے جن میں سے پانچ ہزار کو ملازمتیں مل گئیں۔ چونکہ مردانہ آبادی کے بالغوں میں قابل ملازمت افراد کی تعداد اتنی زیادہ ہے اس لیے عورتوں کی ملازمت کا امکان اور بھی گھٹ گیا ہے۔

گزشتہ چند سال میں پنجاب کے شہری حلقے کے اندر عام طور سے بچوں کی تعلیم خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ بہت پھیل گیا ہے۔ مختلف علاقوں میں اتنی لڑکیاں تعلیم کے شوق میں آتی ہیں کہ ان کے لیے سکولوں میں جگہ نہیں ملتی۔ اب والدین کا خیال یہ ہو گیا ہے کہ اگر لڑکیاں تعلیم پالیں تو ان کے لیے شادی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ یہ امر زنانہ تعلیم کے لیے خاصا محرک ثابت ہوا ہے۔ بی اے یا ایم اے پاس نوجوان جنہیں پاکستان کی معاصر مجلسی زندگی میں اعلیٰ درجہ حاصل کر لینے کی امید ہوتی ہے اپنے والدین سے درخواستیں کرتے ہیں کہ ہمارے لیے تعلیم یافتہ بیویاں منتخب کیجیے۔ والدین کے نزدیک لڑکی کو موزوں بیوی بنانے کے سلسلے میں جو اوصاف وخصائص چاہئیں' انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے وہ لڑکی کی تعلیم کا دائرہ اور مقدار محدود رکھتے ہیں۔ بہت سے راسخ العقیدہ والدین صرف قرآن حفظ کرا دینے پر اکتفا کریں گے یا پانچویں جماعت تک تعلیم دلا دیں گے تاکہ وہ اردو زبان میں مذہبی کتابیں پڑھ سکے۔ ایک خاص سطح سے اوپر تعلیم لڑکی کے لیے نقصان رساں سمجھی جاتی ہے' لیکن سطح کے متعلق تصورات مختلف ہیں۔ بعض والدین میٹرک کو نصب العین سمجھتے ہیں' بعض بی اے بی ٹی تک تعلیم دلاتے ہیں' البتہ بیٹے کی تعلیم کا سب کو خاص خیال رہتا ہے۔

پاکستان کے لیے تعلیم کا مسئلہ نیز اس کی حیثیت' دائرے اور نمونے کا معاملہ حد درجہ پیچیدہ ہے اور اس کے حل میں بہت سی مشکلات ہیں مثلاً نصاب میں ایک خاص وضع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش نظر رکھی جاتی ہے۔ معلمین کی تنخوا[illegible] میں [illegible] نہیں پوری تربیت نہیں دی جاتی۔ عمارتیں اور سامان کی [illegible] ضرورت کے مطابق مہیا نہیں' بچے گھریلو ضروریات یا بیماریوں کے باعث غیر حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ عوام میں تعلیم کے لیے کوئی خاص جذبہ نہیں۔ عورتوں کو الگ رکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ معیشت کا درجہ خاصا پست ہے۔[1] پنجاب نے 1923ء میں آٹھ شہری اور چھیاسی دیہاتی حلقوں میں لازمی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا تھا اور بعد ازاں مزید حلقے ان میں شامل کر دیئے گئے۔[2] لازمی تعلیم مفت ہوتی ہے یعنی فیس نہیں لی جاتی' لیکن والدین کے لیے لازم ہے کہ بچوں کے لباس اور دوسری ضروریات کا خرچ برداشت کریں۔ ابتدائی جماعتوں میں بچے فرش پر بیٹھتے ہیں' جیسا کہ گھروں میں بیٹھنے کا دستور ہے اور وہ لکڑی کی ایک تختی یا کاغذ پر لکھنا سیکھتے ہیں۔ ہر جماعت میں ساٹھ ستر بچے ہوتے ہیں' ظاہر ہے کہ ایک مدرس اپنے شاگردوں کی پوری نگرانی نہیں کر سکتا۔ مدرسوں کے حالات اور اقتصادی دباؤ کے ماتحت بچوں کا کام پر مجبور ہونا ایسے عوامل ہیں' جن کی وجہ سے شہری حلقوں میں بھی تمام قابل تعلیم بچے مدرسوں میں نہیں پہنچتے۔ زیادہ تر تعداد ابتدائی دو جماعتوں میں ہوتی ہے۔ پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے بہت سے بچے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کوشش رائیگاں جاتی ہے' اس لیے ایسے بچے حقیقی معنی میں خواندہ نہیں سمجھے جا سکتے۔

ظاہر ہے کہ معلموں کی تنخواہوں میں حد درجہ کمی' نیز ان کی کم حیثیتی تعلیم کا ایک بنیادی معاملہ ہے۔ پاکستان میں تعلیم کے متعلق یونیسکو کی رپورٹ مظہر ہے۔

پرائمری کے عام معلموں کی تھوڑی تنخواہ اور معمولی تعلیمی اوصاف کے باعث ان کے مجلسی درجے پر بہت ناسازگار اثر پڑا ہے۔[3]

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے تربیت یافتہ اور ناتربیت یافتہ معلموں کی تنخواہوں کے پیش نظر انہیں عام کارکنوں یا درمیانی طبقے کے زیریں درجے کی سب سے نیچی سطح پر رکھا

---

[1] محمد شمس الحق کی کتاب ''پاکستان میں لازمی تعلیم۔'' 1954ء

[2] کتاب مذکور کا صفحہ 72۔

[3] ''پاکستان میں لازمی تعلیم''...... 1954ء صفحہ 49۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جا سکتا ہے۔ جس معلم کو حقیر سمجھا جاتا ہے اس کے ذریعے سے قوم میں مجلسی تبدیلی کے نفاذ کی امید نہیں ہو سکتی۔ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بھی طرح کی تعلیم افکار و خیالات میں وسعت پیدا کر دے گی' لیکن ان ثقافتی عوامل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس مفروضے کے خلاف کارفرما ہیں۔

مذہبی فرائض کی پابندی کو پاکستان کی زندگی میں پہلا درجہ حاصل ہے۔ درجہ زیریں کے زیادہ تر آدمی اور بالائی طبقے کے راسخ العقیدہ لوگ دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرتے ہیں۔ اچھے مسلمان کے اوصاف یہی ہیں کہ اس کی دو نمازیں عموماً مسجد میں ادا ہوتی ہیں۔ تمام مسلمان عربی میں قرآن پڑھنا سیکھ لیتے ہیں اور مختلف سورتیں زبانی بھی سنا دیتے ہیں' اگرچہ ضروری نہیں کہ ان کا مطلب بھی سمجھتے ہوں۔ عورتیں گھر پر نماز ادا کرتی ہیں اس لیے کہ مسجدوں میں جانے کا رواج نہیں۔ بہت سی عورتیں ایک یا ایک سے زیادہ پیروں کی معتقد ہوتی ہیں اور ان کے مزاروں پر جا کر فاتحہ پڑھتی ہیں۔ زیریں اقتصادی طبقے کے مرد و زن پیروں پر بہت اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ تصوف کا نتیجہ ہے جو پنجاب میں زیادہ رائج ہے۔ اس میں ایک روحانی رہنما کی ہدایت کے مطابق روحانیت کا درجہ حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ پیر زندہ ہوں یا فوت ہو چکے ہوں انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی مقدس زندگیوں میں اونچا روحانی درجہ حاصل کر لیا ہے۔ پیروں کی اولاد بھی معزز سمجھی جاتی ہے اور عام لوگ ان کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں۔ زندہ پیروں سے روحانی رہنمائی حاصل کی جاتی ہے اور لوگ ان کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں۔ جو پیر فوت ہو چکے ہیں ان کے مقبرے بن جاتے ہیں۔ روحانی رہنمائی یا مادی امداد کے طلبگار ان مقبروں پر حاضر ہوتے رہتے ہیں اور ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ روشنی کی جاتی ہے' نذریں پیش کی جاتی ہیں' دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اگر کسی کی دعا قبول ہو جائے تو وہ پیر کے نام پر مزید خیرات کا انتظام کرتا ہے۔ تقسیم سے پیشتر ہندو اور مسلمان دونوں پیروں کے مقبروں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے' ہر مہینے کی گیارہویں تاریخ کو اور پیر کی برسی کے دن عرس کیا جاتا ہے۔ یہ تقریبیں دعاؤں کے لیے خاص طور پر سازگار مانی جاتی ہیں۔ عام لوگوں کے عقیدے کے مطابق کسی بزرگ ہستی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سفارش وہی حیثیت رکھتی ہے جو دنیاوی معاملات میں ایک بااختیار سیاسی فرد کی سفارش کو حاصل ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمان پیر پرستی کی مذمت کرتے ہیں اور اسے اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں' لیکن عوام کی بہت بڑی تعداد اسی پر عمل پیرا ہے اور عرس کو ایک میلے کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ پیروں کے مقبروں پر عورتیں بھی خاصی تعداد میں جاتی ہیں۔ دعا کی غرض سے مقبروں پر جانے کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی بجائے عورتیں درگاہوں پر زیادہ جاتی ہیں' البتہ عام رواج کے مطابق وہ نماز کے لیے مسجدوں میں نہیں جاتیں۔ عام زندگی میں اسلام کے مقاصد کی پیروی یوں ہوتی ہے کہ خاندان کے سلسلے میں واجبات پورے خلوص سے ادا کیے جاتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزوں میں حلال حرام کی پابندی کا حد درجہ خیال رکھا جاتا ہے' مثلاً مذہبی احکام کی پابندی کا تقاضا یہ ہے کہ نشے والی کوئی چیز نہ استعمال کی جائے' سور کا گوشت نہ کھایا جائے' جوا نہ کھیلا جائے اور سود نہ لیا جائے۔ اسی طرح مردوں کا عورتوں سے اور عورتوں کا مردوں سے میل جول ممنوع ہے۔ لباس اور روش میں حیا کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں۔ موسیقی یا دوسری عام تفریحات سے بھی احتراز کیا جائے۔ جو سنجیدہ آدمی تفریح کا خواہاں ہو وہ سیر کر سکتا ہے' دوستوں سے ملاقات کے لیے جا سکتا ہے اور نمازیں ادا کر سکتا ہے۔ زکوٰۃ یعنی آمدنی کا چالیسواں حصہ واجب ہے۔ یہ رقم ضرورتمندوں میں تقسیم ہونی چاہیے یعنی ان لوگوں میں جو مجلسی واقتصادی گروہ میں پست درجہ رکھتے ہیں۔ قرابت داروں میں اسی رقم سے کپڑے بنا کر تقسیم کیے جاتے ہیں یا کھانے کی چیزیں دی جاتی ہیں یا شادی کے موقعے پر غریب رشتے داروں کے لیے مالی امداد کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ صدقے اور خیرات کی دوسری شکلیں بھی ہیں۔ بھکاری لوگ جمعرات اور جمعہ کے دن صبح کے وقت یا نماز سے پہلے مسجدوں کے دروازوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ زکوٰۃ وصدقات ہی کے روپے سے یتیم خانوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ خاندان کی عورتوں کے گزارے کا بندوبست بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں یا جہیز کے لیے رقوم کا انتظام مذہبی فرائض کی حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے قائم ہوا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سیاسی تحریک بن گیا۔ یہاں کئی مذہبی رہنما ہیں جو اسلام کے دور اولین کی مثالی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سادگی اور پاکیزگی اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں اور جن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہاں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت ہونی چاہیے۔ ان میں سب سے زیادہ باا ثر تحریک جماعت اسلامی[1] کی ہے جس کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ وہ اسلامی سلطنت کے محاسن پر زور دیتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سخت پردہ ان کے نزدیک ضروری ہے۔ فرماتے ہیں کہ تمام اسلامی قوانین کی پیروی ہونی چاہیے۔ وہ دورِ جدید کے طور طریقوں اور فرقہ بندیوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ جماعت اسلامی کا پروگرام ان لوگوں میں بہت مقبول ہے جو پرانی وضع کے ہیں اور جن کا عقیدہ ہے کہ اگر بنیادی اسلامی اصولوں کی پابندی شروع ہو گئی تو مجلسی عمل کے لیے خاصی بنیاد مہیا ہو جائے گی۔

جن لوگوں نے پنجاب میں 1953ء کے فسادات کا مشاہدہ کیا وہ ان کے آغاز کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ساری مصیبت غنڈوں نے پیدا کی۔ بعض اور لوگ جنہوں نے تحریک میں حصہ لیا' یہ دعوے کرتے ہیں کہ مقصود ایک پرامن مظاہرہ تھا تاکہ حکومت پر واضح ہو جائے کہ احمدی فرقے کے کسی آدمی کو نیا عہدہ دینا عوام کے نزدیک کس درجہ ناپسندیدہ ہے۔ اگرچہ مسیحیوں کو بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔[2] تاہم ان کے خلاف اتنی تیزی نہیں برتی جاتی' جتنی احمدیوں کے خلاف برتی جاتی ہے۔

اسلام نے ایک ایسا مجموعۂ ضوابط مہیا کر دیا ہے جس میں زندگی کی تمام سرگرمیوں کے لیے قاعدے موجود ہیں۔ عام تصور کے مطابق اخلاق کی تعریف زیادہ تر جنسی اخلاق تک محدود رکھی گئی ہے اور انسان کی شہرت کا اندازہ اسی معیار کے مطابق کیا جاتا ہے۔ جب سوال کیا گیا کہ بدترین جرائم کون سے ہیں تو کم تعلیم یافتہ شہری طبقے کے آدمیوں نے بلا استثنیٰ جواب دیا' جنسی بداخلاقی۔ اگر بیوی جنسی بداخلاقی کی مرتکب ہو تو بہت سے لوگوں نے کہا اس کا قتل جائز ہے۔ متعدد لوگوں نے کہا کہ اگر بہن کی زندگی پاک

1۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق ملاحظہ ہو ولفریڈ کینٹول سمتھ کی کتاب ''ہندوستان میں دور حاضر کا اسلام'' مطبوعہ لندن 1946ء صفحہ 52' 49۔

2۔ یہ بیان صحیح نہیں پاکستان میں کسی بھی فرقے سے غیر مناسب برتاؤ نہیں ہوتا۔ احمدیوں سے جو اختلاف تھا وہ صحیح یا غلط اس حد تک تھا کہ انہیں مسلمانوں سے ایک جداگانہ جماعت قرار دیا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ رہے تو اسے بھی مار دینا چاہیے اور اس مرد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے جو بداخلاقی کا مرتکب ہوا۔ جو لوگ طبعاً امن پسند تھے انہوں نے جواب دیا کہ غلط کار بیوی کو طلاق دے دی جائے جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ عورتوں نے بتایا کہ عورت کا بدترین جرم یہ ہے کہ گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ انہوں نے مردوں سے اتفاق کیا کہ اگر بیوی بے وفائی کرے تو شوہر اسے قتل کر دینے میں حق بجانب ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی عورتیں مردوں کے اس نقطہ نگاہ کی حامی ہیں' لیکن معلوم ہوتا ہے ان کی تعداد خاصی وسیع ہوگی۔ ان کے علاوہ قتل' دروغ گوئی اور چغل خوری کو بڑے جرائم قرار دیا گیا۔ آخری جرم زیادہ تر عورتوں سے سرزد ہوتا جس کی وجہ سے خاندان کے مختلف افراد کے تعلقات بگڑ جاتے ہیں اور بعض اوقات ارتکابِ قتل تک نوبت پہنچتی ہے۔

تحائف وصول کرنا' رشتہ داروں کیلئے اپنا اثر استعمال میں لانا یا سرکاری رقموں کو ہڑپ کر جانا جرائم میں شمار نہ کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان امور کو ذاتی اخلاق جاجز و نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ماتحتوں سے یا ضرورت مندوں سے تحفے لے لینا آمدنی کا ایک اضافی ذریعہ ہے۔[1] مجلس تحقیقاتِ اقتصاد کی رپورٹ باب 1952ء مظہر ہے۔

> ''رشوت ستانی اور اقربا پروری عام ہے۔ رشوت ستانی کی برائیاں محض اصلاحی بنیاد پر زیر بحث نہیں آ سکتیں...... لیڈروں کو اپنی توجہ ان پر مرتکز کرنی چاہیے اور ایسی فضا پیدا کر دینا ضروری ہے۔ جس میں رشوت ستانی کو اتنا برا اور خلافِ آدابِ مجلس سمجھا جائے کہ لوگ خود بہ خود اس سے دور بھاگیں...... عوامی اور نجی معاملات میں چال چلن کا معیار بلند کرنے کی ضرورت ہے۔''

رشوت ستانی کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں دولت اور اقتدار بڑھانے کا جذبہ موجود ہے۔[2] اور اس سلسلے میں وہ وسائل و ذرائع کی اچھائی کا خیال نہیں رکھتا۔ بہت

1. میرے نزدیک یہ بھی حالات کا صحیح مرقع نہیں۔ رشوت ستانی اور بدنظمی کو تو ہر شخص حد درجہ مذموم سمجھتا ہے' خواہ کسی سے پوچھ لیا جائے۔ معلوم نہیں مقالہ نگار کے سوال کی نوعیت کیا تھی جس کے جواب میں عام اخلاقی جرائم کا ذکر آ گیا۔

2. یہ بیان بے بنیاد نہیں ہے۔ انگریز افسروں کے زمانے میں ڈالیوں کا رواج ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے قبیلے یا رشتہ داروں کے ساتھ وفاداری کی بنا پر اقربا پروری یا اس قسم کے دوسرے تصور کو جائز ثابت کیا جاتا ہے۔ جن ملکوں میں صنعت وحرفت اعلیٰ پیمانے پر پہنچ چکی ہے وہاں ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو اقربا پروری کے خلاف صدا بلند کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ شہری پنجاب میں ایسے گروہ ابھی بروئے کار نہیں آئے' مثلاً مزدوروں یا کاریگروں کی یونینوں یا شہریوں کی اصلاح کے لیے انجمنیں۔ اجتماعی کاروبار کا معاملہ حکومت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسے اجنبی حکومت کے ابتدائی دور کا ردعمل سمجھا جاتا ہے' نیز یہ مختلف محلوں یعنی شہری حلقوں کے اختلافی احساسات کا نتیجہ ہے۔ پنجاب کے شہری حلقوں میں مزدوروں کی یونینیں جزوی طور پر ہی منظم ہوئی ہیں۔ انہوں نے ابھی یہ حیثیت حاصل نہیں کی کہ سیاسی اقدامات کر سکیں۔ معاشرے میں ہزاروں بیروزگار موجود ہیں اور دستی مزدوری مشینوں کے مقابلے میں ارزاں ہے۔ اس لیے مغربی ملکوں جیسی مزدوروں کی تحریکیں منظم کرنا مشکل ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ معاصر پاکستان کے معاشرے پر یورپ اور امریکہ کے جدید خیالات کا کیا اثر پڑا؟ جو تاریخی عمل صدیوں سے جاری ہے اور حالات میں مسلسل تبدیلی ہو رہی ہے اس کی صحیح قدر و قیمت واضح کرنا مشکل ہے۔ موجودہ زمانے کے فنون نے جو کچھ مہیا کیا' اس کا مادی منافع پاکستان قبول کرنے کے لیے قطعی طور پر تیار ہے اور اس کا ثبوت وہ ہزاروں امریکی موٹریں ہیں جو سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں۔ بائیسکل' ریڈیو' موجودہ زمانے کا فرنیچر مثلاً میز اور دوسری ضروری چیزیں اور چینی کے برتن وغیرہ نچلے درمیانے طبقے کے گھروں میں بھی موجود ہیں۔ عورتیں خاندان کے ارکان کے لیے سوئیٹر بنتی ہیں۔ یہ ملکی اون سے بھی بنے جاتے ہیں اور درآمد کی ہوئی اون سے بھی۔ ہر قسم کے غیر ملکی سامان مثلاً خوشبو اور لباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر قیمتوں میں زیادہ فرق نہ ہو تو ترجیح باہر ہی کے سامان کو دی جاتی ہے' اس لیے کہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بناوٹ میں بہتر ہوگا۔ ان کے علاوہ بہت سی مشینیں اور اوزار ہیں جو ہزاروں معمولی کارخانوں یا دکانوں میں استعمال ہوتے ہیں' لیکن موٹروں کے متعلق معلومات یا انہیں بہتر حالت میں رکھنے کے طریقے شہری آبادی میں بھی زیادہ لوگوں کو معلوم نہیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مغربی وضع کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لباس ان آدمیوں کی اکثریت نے اختیار کرلیا ہے جو شہری علاقوں میں تجارت کرتے ہیں لیکن عورتوں نے لباس میں مغربی وضع قطع اختیار نہیں کی' اس لیے کہ مغربی لباس ان کے روایتی آداب اور تصور انسانیت کے منافی ہے۔ مغربی طور طریقوں میں سے بعض کو اختیار کرنے اور بعض کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے سے ظاہر ہے کہ اجنبی عناصر میں سے جو چیزیں فنی اور عملی نقطہ نگاہ سے مفید معلوم ہوتی ہے وہ بے تکلف قبول کر لی جاتی ہیں۔

فلمیں خواہ باہر سے آئیں یا ملک کے اندر بنی ہوں' خاص توجہ کی مستحق ہیں کیونکہ ان کے ذریعے سے بھی مختلف چیزیں عوام میں پھیلتی ہیں۔ سینما دیکھنے والوں کے اعداد و شمار سے یہ پوری طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ شہری زندگی میں فلموں کی اہمیت کیا ہے۔ البتہ سرسری اندازے سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ نچلے متوسط طبقے کی کم آمدنی والے مرد بھی بطور اوسط ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور سینما دیکھتے ہیں۔ اردو اور پنجابی کی جو فلمیں پاکستان میں بنتی ہیں یا جو ہندوستان سے درآمد کی جاتی ہیں ان میں گانے اور پر پیچ پلاٹ ہوتے ہیں۔ انگریزی فلمیں بھی خاصی تعداد دیکھتی ہے' البتہ یہ ضروری ہے کہ ان میں یا تو لڑائی بھڑائی یا جنسی معاملات کو اہمیت دی جائے مگر معیشت کے مقامی معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیرونی فلموں میں جو شاندار پس منظر پیش کیا جاتا ہے اس سے دیکھنے والوں میں نفرت بھی پیدا ہوتی ہے اور حسد بھی۔ اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے غیر ملکی فلمیں صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی ثقافت کی بھی وہ ایک کڑی ہوتی ہیں۔ مزید برآں جس ثقافت میں کھانا سب سے بڑی مجلسی تفریح ہے سینما جانا ایک خوشگوار متبادل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب نے خیالات کی دنیا میں جو نئی چیزیں بہم پہنچائیں انہیں فنی چیزوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور غور سے دیکھا جاتا ہے۔ بالائی طبقے کے تعلیم یافتہ آدمیوں کا ایک حصہ یورپ اور امریکہ کی ثقافت سے وابستہ ہو چکا ہے۔ ان لوگوں نے ابتدا ہی سے ان سکولوں میں تعلیم پائی جن میں ذریعۂ تعلیم انگریزی تھی۔ وہ انگریزی کتابیں پڑھتے رہے' خصوصاً وہ کتابیں جن کی انہیں پیشے کے لحاظ سے ضرورت تھی۔ سکولوں اور کالجوں میں بھی برطانوی نظام تعلیم سے تعلق قائم رہا۔ انگریزی ہی کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ تعلیم کے دوران میں مغربی افکار و خیالات عام روش اور سائنسی طور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طریقے اختیار کر لیے گئے اور برطانیہ کا طریق نظم ونسق اور طریق عدل قائم رکھا گیا۔ انگریزی اب تک دفتروں اور عدالتوں کی سرکاری زبان ہے۔ اس وقت انگریزی کو مادی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے' کیونکہ اس سے یورپ اور امریکہ کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے میں سہولت ہے۔

بہت سے نوجوان خصوصاً وہ جنہیں باہر تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ جان گئے ہیں کہ مغرب کا بھی ایک فلسفۂ زندگی ہے جس میں فنون اور جمہوری طرز حکومت کے علاوہ چیزیں بھی شامل ہیں۔

جو لوگ شہروں میں رہتے ہیں انہیں غیر ملکی اثرات کے دائرے میں آنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض افکار وفنون وہی سب سے پہلے اختیار کرتے اور انہیں پھیلانے کا موجب بنتے ہیں لیکن قدروں کے نظام میں تبدیلی آہستہ ہی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک خاندان اور مجلسی نظام کی وہ شکل قائم رہے گی جس میں بڑے بزرگ کو اختیار واقتدار کا درجہ حاصل ہوتا ہے اخلاقی قدروں اور روشوں کی دنیا میں ترقی اور تبدیلی رکی رہے گی' اس لیے کہ خاندان ہی میں انسان روش وسلوک کے طریقے سیکھتا ہے۔ اگر خاندان کا ڈھانچہ نئے اقتصادی نشوو ارتقا اور وسیع تر تعلیم کے زیر اثر بدلے گا تو ثقافت کا جو نمونہ پیدا ہوگا' وہ موجودہ زمانے کے یورپ اور امریکہ کے انفرادی مجلسی ڈھانچے اور اس کی لازی قدروں سے زیادہ مشابہ ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

5

وادیٔ پشاور کے پٹھان

(ہربرٹ ایچ' وریلنیڈ سوم)

وادی پشاور درہ خیبر اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ یہ علاقہ کچھ مدت پیشتر تک پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ کہلاتا تھا۔ مشرقی حصے کو چھوڑ کر اس کے کنارے کنارے ہر طرف بنجر اور سنگلاخ پہاڑیاں واقع ہیں۔ وادی کی وضع قطع ایک بہت بڑے کاسے کی سی ہوگئی ہے جس کی وہ طرف کھلی ہوئی ہے جو دریائے سندھ پر واقع ہے اس کے مغربی گوشے میں پشاور کا قدیم شہر واقع ہے جس پر نہایت بلند چوٹیوں کا سایہ پڑ رہا ہے اور جو افغانستان کی سرحد سے صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی شہر کے نام سے وادی نے نام پایا پہلے یہ ہندوستان کی شہرۂ آفاق جرنیلی سڑک کے مغربی حصے کا آخری مقام تھا' اب یہ افغانستان اور پاکستان کی اس تجارتی شاہراہ کا مشرقی سمت میں آخری مقام ہے جو درۂ خیبر میں سے گزرتی ہے۔ وادی کا سارا پانی دریائے کابل میں جمع ہوتا ہے جس کا سرچشمہ افغانستان میں ہے اور یہ ان پہاڑیوں کو کاٹتا ہوا آیا ہے جو درۂ خیبر سے شمالی جانب تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں' پھر یہ وادی کے وسط میں سے مشرقی جانب بہتا ہوا اور مستقل یا برساتی ندیوں کا پانی سمیٹتا ہوا اٹک کے نزدیک دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔ راستے میں جو ندیاں اس کے اندر گرتی ہیں انہوں نے پنکھے کی سی شکل اختیار کرلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ پہاڑوں سے دریائے سندھ تک پچاس میل کا فاصلہ ہے۔

وادی کا وسطی حصہ ایک وسیع میدان ہے جو عام طور پر ہموار ہے لیکن کہیں کہیں اس میں کچھ اٹھانیں ہیں اور چٹانیں سی اوپر ابھری ہوئی ہیں۔ دریائے کابل کے ساتھ ساتھ بعض خطے اب تک دلدلی ہیں، لیکن جھیل کوئی نہیں اور نہ چشمے ہیں۔ جو بھی چشمے ہیں وہ پہاڑیوں کے دامن میں پائے جاتے ہیں۔ بارشیں کم ہوتی ہیں لیکن جتنی بھی ہوتی ہیں زیادہ تر موسم خزاں میں ہوتی ہیں۔ موسم سرما میں کبھی کبھی یکا یک ریلا سا آ جاتا ہے۔ موسم سرما اور موسم بہار نسبتاً ہلکے اور مرطوب ہوتے ہیں۔ موسم گرما بہت گرم اور خشک ہوتا ہے۔ اس میں بارش شاذ ہی ہوتی ہے۔ زمین جلنے لگتی ہے ہوا میں بڑی حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ مستقل طور پر بہنے والی ندیوں کا پانی بہت کم ہو جاتا ہے۔ مئی اور جون کے مہینوں میں بعد دوپہر میدانی علاقے کے اندر باقاعدہ آندھیاں آتی ہیں۔ گرمی کے موسم کی سب سے بڑی مصیبت لو ہے، یعنی وہ گرم ہوا جو رات دن وادی میں چلتی رہتی ہے اور بعض اوقات ہفتہ ہفتہ بھر بالکل نہیں رکتی۔ اس وجہ سے وادی میں سردی اور گرمی کے موسم ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہیں۔

یہاں ہر قسم کے درخت اور جانور ہوتے ہیں وہ بھی جن کا تعلق معتدل خطے سے ہے اور وہ بھی جن کا تعلق خطۂ حار سے ہے لیکن یہ چیزیں زیادہ مقدار میں نہیں ہوتیں۔ جہاں پانی ہے وہاں باغات بھی ہیں کھجوروں کے جھنڈ بھی اور سرسبز کھیت بھی، بشرطیکہ پانی سے فائدہ اٹھانے والے لوگ موجود ہوں۔ ویسے علاقے میں بہت سبزی پائی جاتی ہے۔ جو لوگ اب وادی میں رہتے ہیں وہ مختلف نسلوں کے ہیں اور ان میں سے دو نسلیں بڑی ہیں جن میں سے ایک کو افغان کہا جا سکتا ہے اور دوسری کو غیر افغان۔

پہلی نسل کے لوگ پٹھان کہلاتے ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پٹھان کی اصطلاح نے سرحد کے متعلق مباحث کے سلسلے میں خاصی پریشان خیالی پیدا کر رکھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پٹھان کی توجیہات مختلف ہیں۔ وادی کی عام زبان پشتو ہے جسے ایرانی زبانوں کے مجموعے کی مشرقی شاخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو شخص یہ زبان بولتا ہے وہ اپنے آپ کو پشتون یا پختون کہتا ہے، لیکن جن لوگوں کی مادری زبان پشتو نہیں بلکہ اردو یا علاقے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی کوئی دوسری زبان ہے وہ پشتو بولنے والے کو پٹھان کہتے ہیں۔

جو پختون یا پٹھان وادی پشاور میں رہتے ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اصلی پٹھان سمجھتے ہیں۔ اصلی پٹھان دراصل وہ ہوتا ہے جو پختونی قبیلوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنا سلسلۂ نسب ملا سکے۔ پختون قبیلے سب کے سب نسلاً افغان ہیں۔ پہاڑی قبیلے سب کے سب اصلی پختون ہیں' ان میں نسب کا معاملہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ سب کے نسب عام طور پر معلوم ہیں' لیکن میدانی علاقے میں نسب نامے لکھ کر رکھنا عموماً ضروری سمجھا جاتا ہے' اس لیے کہ یہاں نسلیں خلط ملط ہو گئیں اور قبائلی نظام اصل حالت میں باقی نہیں رہا۔ جب انگریز سرحد پہنچے تو زمینوں کے متعلق لوگوں کے حقوق کا فیصلہ کرنے کے لیے نسب ناموں کے انبار جمع ہو گئے اور یہ سب کے سب سرکار کے دفتر خانے میں موجود ہیں۔ ان کا سلسلہ ان پرانے افغانی قبائل سے ملایا جا سکتا ہے جو وادی میں پہلے پہل آباد ہوئے تھے۔

مزید برآں جو شخص اصلی پختون ہے' اس سے ''ذات'' کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو افغان بتائے گا (ذات ایک سرکاری اصطلاح ہے جس سے لوگوں کی نسلوں کا پتا چلایا جاتا ہے) دوسرے پشتو بولنے والے لوگ اپنے آپ کو کچھ اور بتائیں گے۔ پولیس کے رجسٹروں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ جو بحث اب شروع کی جا رہی ہے اس میں پٹھان کی اصطلاح صرف اصلی پختونوں کے لیے استعمال ہو گی یعنی وہ لوگ جو اپنا سلسلۂ نسب افغانی قبائل سے ملاتے ہیں اور وادی میں رہتے ہیں۔

پشتو بولنے والے لوگوں کا ایک دوسرا بڑا گروہ بھی ہے' جس میں مختلف نسلوں اور ذاتوں کے لوگ شامل ہیں۔ انہیں بھی پنجابی ہمسائے بحیثیتِ مجموعی پٹھان ہی کہتے ہیں' لیکن یہ اصل کے اعتبار سے افغان نہیں اور انہیں اصلی پٹھان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں ایسے گروہ بھی ہیں جن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ہندی الاصل ہیں مثلاً اعوان اور گجر یا دوسرے لوگ جن کی اصل کا صحیح علم نہیں اور اس کے متعلق مبہم سے افسانے چلے آتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ ابتدائی فاتحوں یا مقدس لوگوں کی اولاد ہیں۔ کم از کم ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جس کے پاس اپنی اصل کے ثبوت کے لیے لکھا ہوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نسب نامہ موجود ہے۔ یہ سید ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی اولاد سے ہونے کے دعویدار ہیں۔ اس گروہ کے تمام کنبے عربی الاصل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف عرب تارکین وطن کے ساتھ پہلے پہل سندھ آئے تھے اور ان کے پاس ایسے نسب نامے موجود ہیں جن کے مطابق وہ اپنا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے حضرت آدم اور حضرت حوا تک لے جاتے ہیں۔ وادی میں خدوخال کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ ایرانی نمونہ بھی ہے' تیکھے خدوخال' سرخ وسفید رنگ' نیز نیلی یا بھوری آنکھوں' موٹے خدوخال اور نسبتاً سیاہی مائل رنگ کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اوصاف وخصائص ہندی الاصل لوگوں کے ہیں۔ پٹھانوں میں عام طور پر پہلا نمونہ زیادہ ہے۔ دوسرا نمونہ دوسری نسل کے گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ یہ نمونے قریباً ہر گروہ میں مل سکتے ہیں۔

وادی کے جن اضلاع کا انتظام حکومت کے ماتحت رہا وہاں کے لوگوں میں لباس کا فرق موجود نہیں اور نہ چال ڈھال کا فرق ہے' البتہ دولت وثروت اور مجلسی حیثیت کا فرق ضرور موجود ہے۔ پہاڑوں میں جو لوگ رہتے ہیں' اُن میں سر کے لباس ایک حد تک مختلف ہیں اور سر ہی کے لباس سے پتا چل جاتا ہے کہ آدمی کا تعلق کس قبائلی حلقے سے ہے۔

پشتو بولنے والے باشندوں کے علاوہ دوسرے علاقوں کے نمائندے بھی شہروں میں رہتے ہیں مثلاً پنجابی' سندھی یا اتر پردیش کے مہاجر مقامی باشندے انہیں اجنبی سمجھتے ہیں اور جب تک وہ پشتو کو اپنی دوسری زبان نہ بنالیں گے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

پشتو دیہاتی اور شہری دونوں حلقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور عام طور پر صرف شہروں تک محدود ہے۔ دو قسم کی اردو سنی جاتی ہے۔ اول سرکاری جو سرکاری حلقوں اور بالائی طبقوں میں رائج ہے' دوسری ''بازاری'' اردو جو دوکاندار' نوکر چاکر اور وہ دیہاتی بولتے ہیں جو بازار میں کام کرتے ہیں۔ بعض تعلیم یافتہ آدمی خواہ وہ شہروں میں رہتے ہوں یا دیہات میں فارسی پڑھتے اور بولتے ہیں۔ ''ہندکو' ہندی کی ایک مقامی شکل ہے۔ یہ ان دیہات میں بولی جاتی ہے جو شہروں کے نزدیک ہیں۔

باشندوں کی بہت بڑی اکثریت سنی ہے۔ تاہم شہروں میں شیعہ مسلمانوں' پارسیوں اور مسیحیوں کے گروہ بھی پائے جاتے ہیں۔ پارسی عام طور پر مشہور کاروباری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ مسیحیوں کا تعلق مختلف پیشہ ور گروہوں سے ہے۔ احمدی یا قادیانی فرقے کے کچھ لوگ موجود ہیں۔ ہندو قریباً سب کے سب چلے گئے لیکن بعض مقامات یا سٹیشنوں پر متفرق لوگ مل جاتے ہیں۔

وادیِ پشاور کے باشندوں کا عام کاروبار بھی وہی ہے جس کے نمونے شمالی ہند میں پائے جاتے ہیں۔ کھیتی باڑی کو معاش میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ گندم' جو' مکئی' جوار' روئی' سرخ مرچ اور گنا بڑی فصلیں ہیں۔ سال کو فصل بونے اور کاٹنے کے دو بڑے حصوں میں بانٹ لیا گیا ہے۔ گندم اور جو موسم سرما میں بوئے جاتے ہیں مکئی اور جوار موسم گرما میں گنے کی فصل قریباً سال بھر رہتی ہے۔ ان کے علاوہ سبزیاں بھی بوئی جاتی ہیں' نیز تیپا گھاس' جسے مکئی کے ساتھ چارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے' بہت سے دیہات میں ناشپاتی' آڑو' خوبانی اور انگور کے باغ ہیں۔ قصبہ نوشہرہ کے اردگرد تمباکو بویا جاتا ہے۔ گندم' روئی' سرخ مرچ' تمباکو اور گنا دساور کے لیے بھی بویا جاتا ہے اور مقامی صرف کے لیے بھی۔ زیادہ تر کھیتی باڑی پرانے زمانے کے ہلوں کے ذریعے ہوتی ہے' جنہیں بیل کھینچتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لکڑی اور لوہے کے دوسرے دستی اوزار بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں نے اپنی جاگیروں میں موجودہ زمانے کے ٹریکٹروں کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے۔ جانوروں کا گوبر عام طور پر کھاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حال میں بعض لوگوں نے کیمیاوی کھاد کے استعمال سے بھی دلچسپی ظاہر کی ہے۔

گھریلو جانور کھیتی باڑی کا نہایت اہم حصہ ہیں۔ ان میں سے بیلوں اور بھینسوں کو پہلا درجہ حاصل ہے۔ ہل اور چھکڑے انہی کے ذریعے سے چلتے ہیں' گنے کو بھی بیلوں ہی کے ذریعے سے بیلنوں میں کچلا جاتا ہے۔ نیز ان جانوروں کا گوبر کھاد میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ایندھن کے طور پر بھی۔ بھینسے اور گدھے بوجھ لادنے کے کام آتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں' دنبے اور مرغ کھانے کے لیے پالے جاتے ہیں۔ گھوڑے صرف گاڑیوں یا یکوں میں استعمال ہوتے ہیں' لہٰذا ان کا تعلق حمل ونقل سے ہے نہ کہ زراعت سے۔ جانور عام طور پر دیہات میں پالے جاتے ہیں' البتہ سواری کے گھوڑے افغانستان سے آتے ہیں۔ جانوروں کو یا تو خالی کھیتوں میں چرایا جاتا ہے یا چارہ کاٹ کر ڈالا جاتا ہے۔ بکریاں

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بھیڑیں ان کھیتوں میں چرتی ہیں جن کی فصل کٹ چکی ہو یا ان خطوں میں جو زرعی حلقوں سے باہر ہیں۔ بعض لوگ شوقیہ شکار کھیلتے اور مچھلیاں پکڑتے یا شہد جمع کرتے ہیں لیکن ان چیزوں کو معاش کا ذریعہ کوئی نہیں بناتا۔

اس خطے میں گرمی اور سردی کے موسم کھیتی باڑی کی زندگی پر نمایاں اثر رکھتے ہیں۔ ہلکی مرطوب سردی کا موسم بڑی سرگرمی کا موسم ہوتا ہے۔ کھیتوں کو پانی دیا جاتا ہے' فصلیں بوئی جاتی ہیں' نہروں کی مرمت کی جاتی ہے۔ گرمی کا موسم نسبتاً تن آسانی کا دور ہوتا ہے۔ لوگ نہ تو کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور نہ پانی دیتے ہیں۔ دولت مند لوگ اردگرد کی پہاڑیوں میں ٹھنڈے مقامات پر چلے جاتے ہیں۔

سرگرمی اور تن آسانی کے اسی تبادل میں افغان قبیلوں کے مختلف گروہ اپنے افغان وطنوں اور وادی پشاور کے درمیان نقل مکان کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ وہ درہ خیبر کے راستے آتے ہیں۔ سردی کے موسم میں وادی کی آب و ہوا زیادہ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ کھیتی باڑی خوب فروغ پر ہوتی ہے۔ افغانیوں کی سطح مرتفع پر سردی بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور وہاں کوئی ایسی چیز نہیں رہتی جو جانور کھا سکیں۔ لہٰذا دیہاتی افغان جو موسم خزاں میں فصل بو چکتے ہیں وادی پشاور میں اتر آنا فائدہ مند سمجھتے ہیں۔ یہاں وہ سردی کا موسم بھی گزار لیتے ہیں اور کوئی ایسا پیشہ بھی اختیار کر لیتے ہیں جس سے پیسے مل جائیں۔ موسم بہار میں گرمی کی آمد آمد شروع ہو جاتی ہے تو کام گھٹ جاتا ہے۔ یہ گروہ بھی اپنے دیہات کو واپس چلے جاتے ہیں تاکہ موسم سرما کی بوئی ہوئی فصلیں کاٹ لیں۔

چونکہ یہ لوگ اپنا سارا سرو سامان گدھوں یا اونٹوں پر لاد لاتے ہیں' اس لیے انہیں وادی کے لوگ خانہ بدوش کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے مغربی اخبار نویس ان میں اور وسطی ایشیا کے خانہ بدوش قبائل میں کوئی امتیاز قائم نہیں رکھ سکے اور سب کے متعلق لکھتے رہے کہ درۂ خیبر سے آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ لوگ گلہ بانی کرتے ہیں اور نہ اس طرح خانہ بدوش ہیں جس طرح وسطی ایشیا کے خانہ بدوش قبائلیوں کو کہا جاتا ہے۔ ہر حقیقی گلہ بان خانہ بدوش کے لیے وادی میں قطعاً کوئی کشش نہیں' اس لیے کہ اپنی موجودہ صورت میں اس علاقے کے اندر کھیتی باڑی بہت زیادہ ہوتی ہے اور چراگاہیں حد درجہ کم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور جو ہیں وہ مقامی دیہاتی استعمال کر رہے ہیں۔

اکتوبر کے مہینے میں ان لوگوں کی لمبی قطاریں درہ خیبر کی سڑک کے راستے وادی میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ عموماً غفرئی قبیلے کے ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کنبوں میں بٹ کر دیہات میں پھیل جاتے ہیں۔ سال بہ سال یہ لوگ اپنے مقررہ دیہات ہی میں آتے ہیں۔ خالی گھروں میں انہیں ٹھہرایا جاتا ہے' سردی کے مہینوں میں یہ دن کے وقت محنت مشقت کرتے رہتے ہیں۔ انہیں بنانے میں بڑی دسترس حاصل ہے۔ بعض لوگ اپنے ہاں سے مختلف چیزیں فروخت کے لیے لاتے ہیں۔ بعض اپنے جانوروں پر سامان لاد کر دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں اور کرایہ وصول کرتے ہیں۔ بعض کو شہروں میں کام کاج مل جاتا ہے' لیکن اکثریت دیہاتی علاقوں ہی میں رہتی ہے۔ یہ لوگ یا تو کوچ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا اس وقت دیکھے جاسکتے ہیں جب سڑک کے آس پاس خیمے لگا کر ٹھہرے ہوئے ہوں۔ ان کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ جلد سے جلد دیہاتی زندگی میں شامل ہو جائیں اور کام کا معاوضہ اچھا ملے۔ ان کے لباس مقامی باشندوں سے مختلف ہوتے ہیں' لیکن وہ سب پشتو ہی کی مختلف شکلیں بولتے ہیں اور چونکہ کھیتی باڑی کی زندگی کے عادی ہوتے ہیں اس لیے بہ آسانی پشاور کے دیہاتیوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ بہت سے پٹھان یا پختون قبائلی بھی اسی طرح اپنی پہاڑی وادیوں سے جانور اور اہل وعیال ساتھ لے کر اتر آتے ہیں اور میدانی علاقوں کے مختلف دیہات میں سردی کا موسم گزار لیتے ہیں۔ دولت مند پٹھانوں کے عموماً دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک موسم گرما کے لیے پہاڑوں میں اور دوسرا موسم سرما کے لیے میدانوں میں۔

وادی کا حد درجہ اہم مسئلہ پانی کی بہم رسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ بارش ناکافی ہوتی ہے اس لیے فصلوں کی آبیاری کے لیے پانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پہلے مستقل ندیوں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی تھیں۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں کنکریٹ سے بند تعمیر ہوئے اور ان میں سے نہریں نکالی گئیں۔ یہ تمام نہریں وادی کے نصف شمالی حصے میں ہیں اور گنے کی کاشت زیادہ تر اسی حصے میں ہوتی ہے۔ زمانہ حال تک وادی کے نصف جنوبی حصے پر بہت کم توجہ کی گی اور یہ حصہ پرانے نہری انتظامات یا وقتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارش ہی پر گزارہ کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے وسیع علاقے بنجر پڑے ہیں۔ آزادی کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے کے گورنر نے نصف جنوبی حصے میں پانی کا نظام بہتر بنانے کی کوشش کی اور ورسک کے مقام پر ایک بند بنایا گیا۔

پانی کے مسئلے کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی کیفیت آبیاری کے نہایت اعلیٰ انتظام ہی میں نظر نہیں آتی بلکہ ان تدبیروں میں بھی یہ نمایاں ہے جو پانی سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں۔ وادیِ پشاور پانی سے استفادی تدبیروں کا ایک زندہ عجائب خانہ ہے۔ مثلاً وادی کے اس چوتھائی حصے میں جو شمال مشرق میں واقع ہے رہٹ وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں زمین کی سطح نہر سے اونچی ہو وہاں پانی کو اوپر اٹھانے کے لیے جھلار سے کام لیا جاتا ہے۔ جنوب مغربی حصے میں ہمیں ایرانی قنات یعنی زمین دوز آبیاری کے مقامی نمونے نظر آئیں گے۔ جن لوگوں کے پاس وسائل موجود ہیں وہ پانی اٹھانے کے ان طریقوں کے بھی تجربے کر رہے ہیں جو موجودہ زمانے میں دریافت ہوئے ہیں۔

انسانی آبادیاں زیادہ تر کھیتی باڑی کی موزونیت اور پانی کی بہم رسانی کے مطابق شروع ہوئیں۔ وادی میں ہزاروں دیہات بکھرے پڑے ہیں۔ نصف شمالی حصے میں آبیاری کے انتظامات اچھے ہیں۔ زیادہ تر دیہات نہروں یا ان کی شاخوں کے اوپر واقع ہیں۔ جنوبی حصے میں آبیاری کا نظام اچھا نہیں۔ یہاں زیادہ دیہات ان ندیوں کے کنارے آباد ہوئے جن میں سال بھر پانی رہتا ہے۔

دیہات عموماً عمارتوں اور دیواروں کے بے قاعدہ جھنڈ ہوتے ہیں' ان میں چکر کھاتی ہوئی تنگ گلیاں نظر آتی ہیں اور کوئی مرکزی چوک نہیں ملتا۔ زیادہ تر عمارتیں ایک منزل کی ہیں۔ دیواریں دھوپ میں خشک کی ہوئی اینٹوں سے بناتے ہیں۔ چھت کے لیے لکڑی استعمال کرتے ہیں۔ دیہات پٹیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مادی طور پر تقسیم واضح ہو یا نہ ہو مجلسی طور پر بالکل واضح ہوتی ہے۔ زیادہ تر دیہات میں پٹیاں ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں ان کے درمیان تھوڑا فاصلہ یا کھلی زمین چھوڑ دی جاتی ہے۔ بطور اوسط گاؤں کی آبادی آٹھ سو سمجھنی چاہیے۔ چند دیہات کی آبادی چار ہزار اور چھ ہزار کے درمیان ہے۔ گاؤں کے اردگرد کھیت واقع ہیں چھوٹے چھوٹے بے قاعدہ ٹکڑے جنہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مینڈیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں یا پانی کے کھال۔ پگڈنڈیاں یا چھکڑوں کے راستے جا بجا واقع ہیں۔ ایک گاؤں کی زمینیں آس پاس کے متعدد دوسرے دیہات کی زمینوں تک چلی جاتی ہیں۔ اکثر حالتوں میں یہ بھی دیکھا گیا کہ مختلف دیہات کے درمیان پانی کی نہریں واقع ہیں جن سے وہ سب یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اردگرد کے پہاڑی علاقوں میں جغرافیائی اور مجلسی عوامل کی وجہ سے صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ یہاں آبادی زیادہ تر ان تنگ پہاڑی وادیوں تک محدود ہے جن میں چھوٹے چھوٹے قابل کاشت ٹکڑے مل جاتے ہیں اور پہاڑی ندی سے کھیتوں کی آبیاری ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ قبائلی دیہات صرف چھوٹے چھوٹے محصور احاطے ہیں جو ندی کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے ہیں۔

وادی کی زرعی زندگی کے ساتھ ساتھ کچھ قدیم زمانے کی صنعتیں اور تجارتیں بھی جاری ہیں۔ ان کی وجہ سے دیہات نسبتاً کفیل بالذات ہو گئے ہیں۔ بہ ایں ہمہ شہروں کے ساتھ سب کا تعلق قائم ہے اور شہروں کا انحصار دیہات پر ہے۔ نیز افغانستان، وسط ایشیا اور دوسرے ملکوں کے ساتھ وسیع تجارتی تعلقات ہیں۔ دیہات میں بڑھئی لوہار، جولاہے، کمہار، حجام، مدرس، دائیاں اور دوسرے فنکار موجود ہیں جو دیہات کی اقتصادی زندگی میں زیادہ تر ضروری سامان کی بہم رسانی اور خدمت کا ذریعہ ہیں۔ البتہ مناسب طبی امداد کی حد درجہ مانگ ہے۔ بعض دیہات میں فنکار لوگ موجود ہیں لیکن تمام دیہات میں ہر ضروری فن کی چیزیں نہیں ملتیں، اس لیے فنکار مختلف دیہات میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر دیہات میں پیداوار مقامی صرف ہی کے لیے وقف رہتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ زیادہ تر دیہات ہنرمندی کی نہایت پست سطح پر کام کر رہے ہیں اور انہیں حد درجہ اقل سہولتیں حاصل ہیں۔ دیہاتی زندگی شہری زندگی میں بدلتی ہے تو یہ تبدیلی اچانک اور حد درجہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

وادیِ پشاور میں چار بڑے شہر ہیں، پشاور، مردان، نوشہرہ اور چارسدہ۔ آخرالذکر کے سوا تمام شہروں کے دو حصے ہیں۔ ایک ''شہر'' یعنی پرانا مقامی بازار، دوسرا چھاؤنی جہاں یورپی وضع کی نواحی چوکی اور سرکاری دفتر واقع ہیں۔ ان دونوں حصوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وظیفے الگ الگ ہیں۔

پشاور غالباً سب سے بڑھ کر بوقلموں اور رومانی سرحدی شہر ہے۔ اصل شہر میں عمارتوں کے جھنڈ اور جابجا پر پیچ گلیاں اور محلے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ اردگرد کے دیہات کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے' لیکن اس کی عمارتیں کئی کئی منزل کی ہیں۔ زیادہ بہتر صورت میں تعمیر کی گئی ہیں اور ان کے بیچ میں مرکزی چوک بھی ہے۔ بازاروں کے دونوں طرف دکانیں واقع ہیں۔ ان میں ہر وقت پیدل چلنے والوں' سائیکل سواروں' موٹر پر جانے والوں اور اونٹوں کی قطاروں کا شوروغوغا بپا رہتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے ماہر فنکار مل جل کر کام کرتے ہیں۔ پرچون فروشی کی ایسی دکانیں ہیں جن میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہے۔ ڈاکٹر اور قانون دان بھی موجود ہیں۔ صوبائی نظم ونسق کے چھوٹے چھوٹے دفتر بھی موجود ہیں۔ سرکاری اور مشن ہسپتال بھی ہیں۔ عورتوں کا کالج بھی ہے۔ مسجدیں اور درسگاہیں بھی ہیں' ہوٹل اور سرائیں اور گیراج بھی ہیں اور موجودہ طرز پر بنی ہوئی عمارتیں بھی ہیں۔ دیہات کی یہ کیفیت ہے کہ وہاں نسبتاً سادہ زندگی بسر کی جاتی ہے پھر مختلف ثقافتی روایات کا بھی اس میں امتزاج ہوگیا ہے لیکن شہروں میں قدیم و جدید' پرانی اور نئی چیزوں کو اندھا دھند یکجا کر دیا گیا ہے جسے دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے اور شہری زندگی خاصی پر پیچ معلوم ہوتی ہے۔ اس بھنور میں دیہات کے لوگ اپنی فالتو جنسیں فروخت کرنے' ٹیکس دینے' بچوں کو ٹیکے کرانے' مسجدوں میں جمعہ نماز پڑھنے' سینما دیکھنے' چائے' کارخانوں کا کپڑا اور مٹی کا تیل خریدنے کے لیے آتے ہیں۔

پہلے شہر زراعت' خرید وفروخت اور صنعت وتجارت کے پرانے نمونوں کا مرکز تھے۔ اب ان میں ایسی صنعتیں رائج ہو رہی ہیں جو موجودہ دور کے پن بجلی سے چلنے والے کارخانوں پر مبنی ہیں۔ پشاور کے اردگرد کپڑے نیز میووں کے ڈبوں کو بند کرنے کے کارخانے قائم ہوگئے۔ مردان کے نزدیک چینی کے دو بڑے کارخانے ہیں۔ وادی میں جتنا گنا پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ یہی کارخانے خرید لیتے ہیں۔ دواسازی کے کارخانے بھی بننے لگے ہیں۔ پہاڑوں کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ پن بجلی کی دو بڑی کارگاہیں بن گئی ہیں جو قصبوں' شہروں اور متعلقہ آبادیوں کو روشنی اور قوت بہم پہنچاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ بحیثیتِ عمومی صنعت و حرفت بھی ابتدائی دور میں ہے۔ کارخانوں کی ملکیت یا تو حکومت کے ہاتھ میں ہے یا مختلف صنعتوں کو حکومت بھاری امداد دے رہی ہے اور ان کی حفاظت کا بندوبست کر رہی ہے۔ فی الحال شہروں کے صرف تھوڑے ہی آدمیوں کو ان میں ملازمت کا موقع ملا ہے جو پہلے بطور خود صنعت و حرفت سیکھ گئے ہیں یا سرکاری ملازم رہ چکے ہیں۔ دیہاتی کے لیے کارخانوں کی حیثیت ابھی تک عجائبات کی سی ہے۔

شہروں اور قصبوں نیز شہروں اور بیرونی علاقوں کے درمیان آمدورفت اور حمل و نقل کے اچھے ذرائع موجود ہیں' اس وجہ سے ایک دوسرے پر باہمی اثرات پڑ رہے ہیں۔ چار بڑے شہروں' نیز وادی سے باہر کے قصبوں کے درمیان نہایت اچھی پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ زیادہ تر بڑے بڑے گاؤں بھی ان سڑکوں کے قریب واقع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہات تک معمولی کچی سڑکیں یا پگڈنڈیاں موجود ہیں۔ وادی کی بڑی سڑکوں پر بسوں کی آمدورفت کا عمدہ انتظام حکومت نے کر رکھا ہے۔ لاہور سے ریل کی ایک لائن وادی کے اندر سے ہوتی ہوئی پشاور شہر اور چھاؤنی سے گزر کر درۂ خیبر میں افغانی سرحد تک جاتی ہے۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کی طرف سے ہفتے میں دو مرتبہ جہازوں کی آمدورفت جاری ہے جن میں مسافر بھی سوار ہوتے ہیں اور ڈاک بھی بھیجی جاتی ہے۔ بڑے بڑے قصبوں اور پاکستان کے باقی مقامات کے درمیان تار اور ٹیلی فون کے سلسلے بھی قائم ہیں۔

مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ایک یونٹ بنانے سے پیشتر شمال مغربی سرحدی صوبے کا نظام حکومت ایک گورنر پانچ یا چھ وزیروں کی ایک کابینہ' ایک قانون ساز مجلس اور ایک سول سیکرٹریٹ پر مشتمل تھا جس کے کئی انتظامی محکمے مختلف سیکرٹریوں کے ماتحت تھے۔

انتظامی مقاصد کے لحاظ سے صوبے کے منظّم علاقوں کو چھ ضلعوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا جن میں سے دو یعنی پشاور اور مردان' وادیِ پشاور میں واقع تھے۔ ہر ضلع کا ایک حاکم (ڈپٹی کمشنر) ہوتا تھا اور ایک ڈسٹرکٹ بورڈ ضلع مختلف تحصیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر تحصیل کا حاکم تحصیل دار کہلاتا تھا۔ تحصیلوں کے دیہاتی علاقے مزید دو حصوں میں بانٹ لیے گئے تھے جن میں سے ایک کو ذیل یعنی مالی حلقہ' دوسرے کو تھانہ یعنی پولیس کا حلقہ کہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ تھانے میں ریزرو پولیس بھی رہتی تھی اور گشتی پولیس بھی۔ تحصیل کے اندر شہری مرکز موجود تھے مثلاً پشاور شہر' جن کی جداگانہ میونسپل کمیٹیاں تھیں۔

انتظامی سطح کی بالکل ابتدائی چیز گاؤں تھا۔ زیادہ تر دیہات میں سرکار کی طرف سے پرائمری مدرسے قائم تھے اور محکمۂ تعلیم کے افسر وقتاً فوقتاً ان کے دورے کرتے رہتے تھے۔ پٹواری جس کے پاس زمینوں کی ملکیت کے رجسٹر ہوتے تھے سرکاری مالیے کی تشخیص کے پرچے تقسیم کرتا تھا اور گشتی پولیس کے آدمی مختلف علاقوں کے دورے کرتے رہتے تھے۔ دیہاتی جب تک مالیہ ادا کرتے رہیں اور آپس میں کوئی جھگڑا نہ کریں حکومت دیہات کی اندرونی سیاسی تنظیم میں بہت کم دخل دیتی ہے۔ جس مجلس کے تمام ممبر انتخاب کے ذریعے سے چنے جاتے ہیں' وہ صوبے کی قانون ساز مجلس ہے۔ ان کے لیے دیہاتی اور شہری حلقے بنے ہوئے ہیں۔

اگرچہ صوبائی نظم ونسق کے چھوٹے فوجی دفتر پشاور شہر میں بھی ہیں اور صوبے کے دوسرے قصبوں میں بھی' لیکن مرکزی دفتر پشاور چھاؤنی میں واقع ہے جسے صوبے کے صدر مقام کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ چھاؤنی یورپی نمونے کے مطابق ایسے انداز میں بنی ہے کہ سب چیزیں اس کے اندر مہیا ہو سکیں۔ اس کی حیثیت ایک مستطیل کی ہے۔ لمبے لمبے بازار' وسیع سبزہ زار۔ اسی سلسلے میں گورنر کا قصر' اسمبلی کی عمارت' بڑی بڑی عدالتیں' سیکرٹریٹ' فوج اور ہوائی فوج کی عمارتیں ہیں۔ اعلیٰ درجے کے فوجی اور سول افسروں کے بنگلے بھی یہیں ہیں۔ وہاں مختلف بازار ہیں' بہت سے ہوٹل ہیں' ایک مشن کالج ہے۔ عیسائیوں کے گرجے ہیں' ایک نہایت اچھا عجائب خانہ بھی ہے جس میں گندھارا کی مشہور سنگتراشی کے نمونے جمع کر لیے گئے ہیں۔ ایک کلب ہے کرکٹ کھیلنے کے لیے میدان ہیں' ایک ورزش گاہ ہے اور یورپی ثقافت کے اور بھی نمونے ملتے ہیں۔ ان کے اردگرد خاردار تار لگا ہوا ہے اور مختلف دروازوں پر سنتریوں کی چوکیاں ہیں جہاں وہ پہرا دیتے ہیں۔

خاردار تار اور سنتریوں کی حفاظت گاہوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت کو کس قسم کے معاملات سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً وادی کے نظم ونسق اور پہاڑوں میں رہنے والے آزاد قبائل کے درمیان تعلقات یا بنیادی اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن تعلقات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی سرگزشت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ قبائل اور فوج کے درمیان باقاعدہ مسلح جنگ بھی ہوتی رہی۔ جب جنگ جاری نہ ہوتی اس وقت بھی دونوں کے درمیان ایک پریشان کن تذبذب کی حالت قائم رہتی تھی۔ برطانوی راج کے زمانے میں ایجنسیوں کا نظام تجویز کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملحقہ قبائلی حلقے پر بالواسطہ کم سے کم کنٹرول رکھا جائے۔ قبائلی حلقے کے مختلف حصے خاص افسروں کے حوالے کر دیئے گئے تھے جنہیں پولیٹکل ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ وہ چیف سیکرٹری کے واسطے سے گورنر کے روبرو جواب دہ تھے۔ چیف سیکرٹری کے دفتر میں ایک خاص افسر مقرر تھا جس کا وظیفہ یہ تھا کہ سردی کے موسم میں افغانستان سے وادی میں آنے والے گروہوں کا انتظام کرتا رہے۔ یوں گورنر کے فرائض دوگانہ تھے۔ اول وہ منظّم اضلاع کا گورنر تھا اور دوم قبائلی معاملات کے تعلق میں مرکزی حکومت کا ایجنٹ متصور ہوتا تھا۔ اب تمام قبائلی معاملات کا انتظام یکجا کر دیا گیا ہے۔ ریاستوں اور قبائلی علاقوں کے لیے کراچی میں ایک مستقل وزارت موجود ہے۔ مغربی پاکستان کی حکومت نے قبائلی حلقے کے نظم ونسق کی ذمہ داری سنبھال لی۔

حکومت کے دو نمونے ہیں اول منظّم علاقوں کا بلاواسطہ نظم ونسق، دوم قبائلی علاقوں میں بالواسطہ ایجنسی کے ذریعے سے انتظام۔ یہ دونوں نمونے الگ الگ رہے اور قبائل اپنے ہی قاعدے قانون کے مطابق کام چلاتے رہے۔ پولیٹکل ایجنٹ انہیں ضرورت کے وقت مدد بھی دیتے تھے اور مشورہ بھی، کبھی کبھی دھمکیاں بھی دے دیتے تھے۔ اگر قبائل میں کوئی ہنگامہ بپا ہو جاتا تو حکومت اپنے سرحدی قلعوں فوج اور ہوائی فوج کی بنا پر ہر ہنگامی صورتحال سے نبرد آزما ہوتی۔ فوج اور ہوائی فوج پشاور اور دوسرے سرحدی قصبوں میں مقیم رہتی تھی۔

ایک عسکری حکومت اور خود مختار قبائل کے درمیان تقابل شمال مغربی سرحدی صوبے کی زندگی کا زیادہ نمایاں اور روایتی پہلو رہا ہے، لیکن سطح کے نیچے دوسری لہریں بھی موجود رہیں۔ اگرچہ قبائلی علاقے اور منظّم علاقے ایک دوسرے سے الگ اور سیاسی سطح پر ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے تھے، لیکن وہ اقتصادی اور مجلسی سطح پر ایک دوسرے سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ یہ تعلق اس نوعیت کا تھا کہ دونوں علاقوں میں امن پرورانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توازن قائم رکھنا حکومت کے لیے خاصا مشکل ہو جاتا تھا۔

اقتصادی نقطۂ نگاہ سے دونوں علاقوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ پہاڑی علاقے میں کھیتی باڑی کا انتظام بہت معمولی ہے۔ ضرورت کے مطابق جنسیں وہاں پیدا نہیں ہوتیں، لہٰذا قبائلیوں کو آمدنی کے دوسرے ذریعے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ یا تو وہ غارتگری پر اتر آتے ہیں یا اس غرض سے بہتر اخلاقی ذرائع اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً فوج یا سول کے دفاتر میں ملازمت یا فنی تعلیم اور اس کے بعد اسی کو ذریعۂ معاش بنا لینا، یہ مشاغل قبائلی علاقوں کے خاصے بڑے حصے کو کھینچ کر وادی میں لاتے رہے ہیں۔ قیام پاکستان تک قبائلی لوگ ملازمت کی تلاش میں بمبئی اور کلکتہ بھی چلے جاتے تھے، بعض جہازوں پر بھٹی جھونکنے کے ملازم ہو جاتے تھے۔ بہت سے قبائلی لوگ پہاڑوں کی پیداوار وادی میں بیچ کر اپنا گزارا کرتے تھے، مثلاً لکڑی یا نشہ پیدا کرنے والی چیزیں یعنی بھنگ وغیرہ۔ بہت سے دولت مند قبائلی لوگ سرحدی شہروں میں کاروباری بن گئے مثلاً ٹرک چلانے کا کاروبار۔ ایک خاندان ایسا بھی دیکھا جس کے کچھ لوگ قبائلی علاقے میں رہتے ہیں اور کچھ منظم اضلاع میں یہ خاندان وادیِ پشاور کے لیے چکیوں کے پاٹ بہم پہنچاتا ہے جو افغانستان کے ایک خاص علاقے سے پتھر نکال کر بنائے جاتے ہیں پھر انہیں دریائے کابل کے راستے ایک چھوٹے سے گاؤں میں لایا جاتا ہے جو پشاور کے شمال میں واقع ہے۔ وادی بھی اپنی ضرورتوں کے لیے پہاڑی علاقے کی محتاج ہے۔ وہ صرف لکڑی ہی کی محتاج نہیں پانی کی بھی محتاج ہے جس کے تمام بڑے بڑے سرچشمے یا تو قبائلی علاقے میں ہیں یا قبائلی علاقے سے گزرتے ہیں۔ پشاور شہر اور چھاؤنی کو جو پانی آتا ہے۔ یہ نلوں کے ذریعے سے ماڑاندی سے لایا جاتا ہے یہ ندی قبائلی علاقے کے اندر واقع ہے۔

مجلسی لحاظ سے معاملہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ پٹھان خواہ قبائلی علاقے کے ہوں خواہ منظم علاقوں کے دیہات کے، سب اپنے آپ کو ایک ہی مجلسی حلقے کے اجزا سمجھتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اختلافی حد نہیں ہے۔ اگرچہ حکومت نے اپنے نقشوں پر ایک قطعی سرحدی خط کھینچ رکھا ہے اور سرحدی علاقے میں آنے جانے والے بڑے راستوں پر جا بجا چوکیاں بھی بنی ہوئی ہیں جہاں دیکھ بھال ہوتی ہے، لیکن ان رسمیات کا پٹھانوں پر کوئی اثر نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑتا۔ وہ اپنے بھائیوں سے محبت یا عداوت کا تعلق جس طرح چاہتے ہیں قائم رکھتے ہیں۔ دونوں علاقوں کے دیہاتی ایک دوسرے کی شادی و مرگ میں شامل ہوتے ہیں۔ قبائلی سرداروں کے بیٹے وادی کے کالج میں پڑھتے ہیں۔ اس سلسلے میں خاص سہولت کا انتظام یوں ہوگیا کہ پشاور یونیورسٹی شہر سے پانچ میل مغربی جانب واقع ہے اور یہ قبائلی سرحد سے قریب ہے۔ تعطیلات میں یہ قبائلی طالب علم اپنے ہم جماعتوں کو قبائلی علاقوں میں لے آتے ہیں۔ خونی انتقام کے سلسلے بھی دونوں طرف جاری ہیں اور سرحد ان میں رکاوٹ نہیں بن سکتی' اگرچہ منظم اضلاع میں یہ مشغلہ زیادہ خطرناک ہے۔

اس صورتحال میں پیچیدگی کا ایک خاص باعث یہ امر ہے کہ اگرچہ مجلسی اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے پٹھان قبائلی اور منظم علاقوں میں امتیاز کا چنداں خیال نہیں رکھتے' لیکن ضرورت کے وقت اس کی سیاسی اہمیت سے مختلف طریقوں پر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جو قبائلی خاندان باہمی جھگڑوں میں شکست کھا جاتے ہیں وہ منظم اضلاع میں آ بستے ہیں جہاں جھگڑے اور خونی بدلے خلاف قانون قرار دیے جا چکے ہیں۔ منظم اضلاع کے جو باشندے کوئی غیر آئینی پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں' یعنی بندوقیں اور ریوالور بنانا یا نشہ آور چیزیں بنانا' وہ چپ چاپ قبائلی علاقے میں جا بستے ہیں۔ ہر قسم کے مجرم پولیس کی دارو گیر سے بچنے کے لیے سرحد کے پار چلے جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حکومت ان دیہات کی حفاظت کا کوئی زیادہ خیال نہیں کرتی جو سرحد کے قریب واقع ہیں' اسے زیادہ خیال یہ رہتا ہے کہ غیر آئینی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں تعاون کے امکانات کو دبائے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت محض منظم علاقوں کو قبائلی حملوں سے بچانے کے بجائے زیادہ پیچ دار مسائل سے دوچار ہے۔ حکومت قبائلی علاقوں میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس میں حسن تدبیر سے بھی کام لیتی ہے اور قوت کی نمائش کے درپے بھی رہتی ہے' یعنی بیک وقت درشتی و نرمی پر عمل ہوتا ہے۔ نظم ونسق کو چاہیے کہ اپنے حلقۂ عمل میں بیک وقت اقتدار کی حفاظت کا بندوبست کرے۔

یہاں اصل معمہ منظم علاقے کا پٹھان ہے جسے نہ تو وادی کے منظم معاشرے کا جزو قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کوہستانی علاقے کے قبائلی معاشرے کا فرد کہا جا سکتا ہے۔ رسمی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی لحاظ سے وہ حکومت کا شہری ہے لیکن وسیع مجلسی لحاظ سے وہ قبائلی معاشرے ہی کا ایک جزو ہے' جس سے حکومت نے اپنے آپ کو الگ رکھنا پسند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو برطانوی راج رخصت ہو چکا اس کے متعلق منظم اضلاع کے پٹھانوں کا نقطہ نگاہ غیر معین سا ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں برطانیہ کے بے لاگ انصاف کی تعریف کریں گے اور دوسرے سانس میں برطانیہ کو اس جرم کا ذمہ دار قرار دیں گے کہ اس نے پہاڑی قبائل کو الگ کیا' تا کہ اس کے فوجی افسروں کے لیے جنگی تربیت کا موقع ملتا رہے۔

لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ حکومت کو دو مختلف معاشروں سے سابقہ پڑا ہوا ہے جن میں عدم اختلاط بھی ہے اور یہ دونوں حکومت کے حلقے میں موجود بھی ہیں۔ ایک پر پیچ طریق پر منظم معاشرہ جس میں حکومت بھی شامل ہے اور دوسرا نسلی معاشرہ جس کی نمائندگی سابقہ معاشرے میں بھی ہے' لیکن جو سرحد کے پار تک بھی موجود ہے اور جس نے اپنے روایتی ادارے اور روایتی قدریں بنا رکھی ہیں۔

پٹھان معاشرہ

پٹھان معاشرے کی اصل قبائلی ڈھانچہ ہے جو آج بھی سرحد کے پار بڑی حد تک محفوظ ہے اور یہاں پٹھانوں کی مجلسی زندگی کی پرانی شکلیں اپنے رسم و رواج کے دائرے کے اندر جاری ہیں۔ منظم علاقوں میں قبائلی نظام ٹوٹ چکا ہے اور اس کے وظیفے حکومت نے سنبھال لیے ہیں۔ رسم و رواج کی جڑ اجنبی قانون نے کھوکھلی کر دی ہے اور بہت سی پرانی شکلیں بدل چکی ہیں۔ ایک حد درجہ تفریقی اور درجہ دار معاشرے سے تعلق کا اثر بھی پڑا' لہٰذا منظم اضلاع کے لوگوں اور قبائلی علاقے کے لوگوں کے مجلسی اوضاع میں خاصا فرق پیدا ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ قبائلی اور منظم اضلاع کے پٹھان اب بھی فکری اوضاع اور دوسری قدروں میں مشترک ہیں جو دونوں گروہوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ منظم علاقوں کا پٹھان جانتا ہے کہ اس کے اپنے حقیقی اوضاع ان مثالی اوضاع سے بہت مختلف ہیں جو قبائلی زندگی سے متعلق ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر یہاں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پٹھان کا قبائلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرہ اس دنیا کی کوئی انوکھی چیز نہیں۔ ایرانی سطح مرتفع میں اس کے کئی نمونے ملتے ہیں، نیز شمالی پاکستان اور بھارت میں بھی اس کے خدوخال دیکھے جا سکتے ہیں (اگرچہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہوں) اور اس کے بعض حد درجہ ڈرامائی نمونے بھی وسیع تقابل میں بالکل عام چیز رہ جائیں گے۔

پٹھان معاشرے کا ڈھانچہ قرابت داری کے نظام پر مبنی ہے اور اس کا مرکزی اصول یہ ہے کہ ایک جد امجد کی اولاد اکٹھی رہے۔ جس حد تک نظریات کا تعلق ہے تمام پٹھان ایک جد امجد کی اولاد ہیں جس کا نام قیس تھا جو نسلوں پہلے افغانستان میں رہتا تھا۔ اس وجہ سے تمام پٹھان اپنے آپ کو ایک دوسرے کا بھائی سمجھتے ہیں اور ہر شخص خود کو قرابت داری کے وسیع حلقے کی ایک کڑی مانتا ہے پہلے چچیرے بھائی آتے ہیں پھر دوسرے رشتے، اسی طرح معاشرہ درجہ بہ درجہ پھیلتے ہوئے آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔ پٹھانوں میں سے کوئی دو شخص اپنا سلسلۂ نسب بتاتے بتاتے اوپر جا کر ایک جد امجد تک پہنچ جائیں گے۔ قرابت داری کا یہ وسیع معاشرہ تین قسم کے گروہوں میں منقسم ہے۔ اول قبیلہ، دوم نسب، سوم مشترک خاندان۔

قبیلہ یا قوم ان تینوں میں سب سے بڑا ہے اور اسے سب سے بڑی سیاسی اکائی سمجھنا چاہیے۔ بعض اوقات قبیلے آپس میں وفاقی رشتے جوڑ لیتے ہیں لیکن یہ قبیلوں کی طرح مستقل اکائی نہیں ہوتے۔ ہر قبیلے کا ایک نام ہے اور اس کا اپنا واضح طور پر معین علاقہ بھی ہے۔ اس کے افراد لباس، گفتگو اور اوضاع و اطوار کے اعتبار سے بعض خصوصیتوں کے مالک ہیں جو انہیں دوسرے قبیلوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک مستقل سیاسی اکائی کے لحاظ سے قبیلہ اپنے اندر نظم و قانون اپنے خاص قواعد کی بنا پر قائم رکھتا ہے اور علاقے کی حفاظت کے لیے متحد ہو جاتا ہے۔

قبیلہ بہت سے نسب ناموں یا قبیلوں میں بٹا ہوتا ہے۔ خیل میں وہ تمام لوگ شامل ہو جاتے ہیں جو ایک خاص جد امجد کی اولاد ہوں، لیکن یہ جد امجد قبیلے کے جد امجد سے کئی پشت بعد آتے ہیں۔ بیشتر مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں سر خیل افراد آپس میں بھائی بھائی تھے پھر ان کی بھی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوتی ہیں جنہیں ''کھول' یا کور'' کہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگرچہ ایسا کوئی قاعدہ نہیں کہ ہر شخص کو خیل کے اندر شادی کرنی چاہیے' تاہم شادیاں عموماً اس کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ خصوصاً ان خیلوں میں جن کے تعلقات ہمسایہ خیلوں سے اچھے نہیں ہوتے۔ خیلوں کی علیحدگی کا سبب خونی انتقام ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ زمین پر جھگڑے سے شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن خیلوں کے درمیان رشتہ زیادہ گہرا ہے وہی ایک دوسرے کے زیادہ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اپنے خیل سے باہر شادی مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو دو صورتیں پیش آئیں گی۔ یا تو کسی ایسے قبیلے کی لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی جس کے ساتھ دشمنی ہو یا دشمنی پیدا ہونے کا امکان ہو یا بیوی کے لیے دشمنوں کے علاقوں سے گزرنا گزیر ہو جائے گا۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ پٹھان زیادہ قریبی رشتہ داروں میں شادیاں کرنے لگے۔ چونکہ شادیوں کے سلسلے میں جہیز اور بیوی کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے' اس لیے ایسی شادیاں قرابت داروں کے ایک محدود حلقے میں کر لینا اقتصادی اور مجلسی اعتبار سے فائدہ مند رہتا ہے۔

قبائلی نظام کی بنیاد خاندان ہے جو قبیلے کے زیادہ تر داخلی جھگڑوں کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا خیل بھی بہت سے خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی اپنی زمینیں ہیں اور وہ جداگانہ مستحکم عمارتوں میں رہتے ہیں' جنہیں قلعہ کہتے ہیں۔ ''درۂ خیبر'' یا ''درۂ کوہاٹ'' میں سے گزریں تو اس قسم کے چھوٹے چھوٹے قلعے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر یا وادیوں میں نظر آئیں گے۔ قلعے کا اندرونی حصہ کم از کم دو حلقوں میں منقسم ہوتا ہے جن کے درمیان اونچی دیوار بنا دی جاتی ہے۔ بڑا دروازہ اس حلقے میں داخلے کا ذریعہ ہے جسے گولائی کہتے ہیں۔ یہ اصلاً مردانہ حصہ ہے اور مردوں ہی کی سرگرمیوں کے لیے وقف ہے۔ البتہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی یہاں کھیلتی ہیں اور بڑے لوگ جو کہانیاں بیان کرتے ہیں انہیں سنتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک بڑا سائبان جانوروں یا کھیتی باڑی کے آلات وغیرہ کے لیے بنا ہوتا ہے۔ ایک دیوار کے ساتھ برآمدہ سا بنا دیا جاتا ہے۔ جس کی چھت کے لیے منقش شہتیر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اوپر سرکنڈا ڈال دیا جاتا ہے' اس برآمدے میں بہت سی چارپائیاں پڑی رہتی ہیں۔ دولت مند خاندانوں کے لوگ برآمدے کے پیچھے یا اس کے ایک جانب کمرہ بنا لیتے ہیں۔ یہ کھانے کے لیے یا سردیوں میں سونے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس حصے کو جس میں برآمدہ' مہمانوں کا خاص کمرہ اور سامنے کا احاطہ شامل ہیں' حجرہ کہتے ہیں یہیں مالک اپنے مرد مہمانوں اور دوستوں کو کھانا کھلاتا ہے۔

دوسرا حصہ زنانے کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس میں ایک طرف یا زیادہ اطراف میں بہت سے کمرے بنائے جاتے ہیں۔ ہر کمرے میں شادی شدہ جوڑے اور ان کے بچے رہتے ہیں۔ گھر کے لوگ عموماً یہیں سوتے ہیں۔ البتہ رات کے لیے کوئی مہمان آ جائے تو عام رواج کے مطابق میزبان مہمان کے پاس حجرے میں سوتا ہے۔ اور باہر سے زنانہ مہمان آ جائیں تو اس صورت میں بھی مرد زنان خانے سے اٹھ کر حجرے میں آ جاتے ہیں' تاکہ مہمانوں کو تکلیف نہ ہو۔

قلعے کی دیواروں کے اندر وہ لوگ اپنی بیویوں سمیت رہتے ہیں جن کے درمیان خونی رشتہ ہوتا ہے مگر بیویوں کے لیے ضروری نہیں کہ ان میں رشتہ بہت قریبی ہو۔ غیر شادی شدہ بہنیں بیٹیاں اور بچے بھی ساتھ رہتے ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ باپ بیٹے اور بھائی ایک ہی قلعے میں رہیں گے' کم از کم اس وقت تک جب تک قلعہ ان کی سکونت کے لیے کافی ہو اور خاندان کے مختلف افراد کے درمیان موافقت قائم رہے۔ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ قلعے میں چلی جاتی ہیں' بیٹیاں اور بہنیں شادی کے بعد قلعہ چھوڑ دیتی ہیں۔ خاندان کے لوگ قلعے کے آس پاس اپنی زمینوں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں اور ایک اکائی کی حیثیت میں تمام ضرورتیں قریب کے بازار سے پوری کرتے ہیں۔ بعض لوگ گھر سے باہر کسی دوسرے کام سے مزید روپیہ پیدا کر لیتے ہیں۔

میراث کا رواجی نظام یہ ہے کہ جائیداد بیٹوں میں بہ حصہ برابر تقسیم کر دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو میراث سے خارج سمجھا جاتا ہے' اگرچہ قرآن کا حکم اس کے خلاف ہے۔ تقسیم کے وقت وارثوں کو زمین کے ٹکڑے نہیں ملتے' بلکہ صرف حصہ ملتا ہے جسے بخرہ کہتے ہیں۔ اس وجہ سے وارثوں میں کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوتا۔ آگے چل کر زمین کے ٹکڑے بھی تقسیم ہوتے ہیں۔ یہاں سے جھگڑوں کا آغاز سمجھنا چاہیے اس لیے کہ ٹکڑے' رقبے' حیثیت اور موقع و محل کے اعتبار سے مختلف درجے رکھتے ہیں۔ اس تقسیم میں مساوات اور انصاف کا خیال رکھا جاتا ہے اور ممکن ہے آغاز میں تقسیم تسلی بخش بھی ہو' لیکن آہستہ آہستہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقی یا غیر حقیقی اختلافات رونما ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی وارث سمجھ لیتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ غیر مساوی تقسیم کے برے نتائج کو گھٹانے اور حصوں کو حقیقی مقبوضات کے عین مطابق بنانے کے لیے ایک طریقہ یہ اختیار کیا گیا تھا کہ ایک خاص مدت کے بعد میراث کی ملکیتیں بدل لی جاتی تھیں، یعنی خاندان کے تمام مقبوضہ ٹکڑے اکٹھے کر کے از سر نو بانٹے جاتے تھے۔ اب یہ دستور قائم نہیں رہا۔[1]

خاندانی قرابت داری میں ایک اور عنصر بھی زمین کے جھگڑوں کا باعث بنتا ہے۔ یہ بھائیوں کی مجلسی نامساوات ہے۔ چھوٹے بھائیوں سے امید رکھی جاتی ہے کہ وہ باپ اور بڑے بھائیوں کا احترام کریں گے۔ جب بڑا بھائی آتا ہے تو چھوٹے بھائی سے امید کی جاتی ہے وہ کھڑا ہو جائے اور بہترین جگہ بڑے بھائی کے لیے خالی کر دے۔ یہ امید بھی کی جاتی ہے کہ بڑے بھائی کی موجودگی میں نہ وہ حقہ پیئے گا اور نہ حجامت بنوائے گا۔ باپ کی وفات پر عموماً بڑا بھائی خاندان کے انتظام اور اختیار کا منصب سنبھال لیتا ہے۔ اگرچہ خاندان کے رہنے سہنے کے مقام میں سب کے حصے برابر ہوتے ہیں مگر بڑے بھائی کو بہترین جگہ کا حقدار مانا جاتا ہے اور اسی کو مہمان خانے کے استعمال میں ترجیح دی جاتی ہے۔ بڑے بھائی کی شادی بھی پہلے ہوتی ہے اور شادی شدہ مردوں کی حیثیت غیر شادی شدہ مردوں سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر چھوٹے بھائی کی شادی نہ ہوئی ہو اور باپ فوت ہو جائے تو بڑا بھائی خاندانی سرمائے کا انتظام سنبھال لے گا۔ وہی شادی کا بندوبست کرے گا اور وہی دلہن والوں کو مطلوبہ رقم دے گا۔ سرمائے کے انتظام میں اس ترجیح کی بنا پر بعض اوقات اختیارات کا غلط استعمال ہوتا ہے اور بھائیوں کے درمیان زمین کے متعلق جھگڑے پیدا ہونے کے جو امکانات موجود ہوتے ہیں ان میں مزید اشتعال کا سامان بن جاتا ہے۔

---

[1] آج سے قریباً ایک سو سال پیشتر کی بعض دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری زمینیں اکٹھی کر کے از سر نو بانٹی جاتی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ مثلاً دو بھائیوں نے مختلف ٹکڑے آپس میں بانٹ لیے۔ ایک سال یا دو سال کے بعد ان ٹکڑوں کی ملکیت بدل جاتی تھی یعنی 'ا' اپنا ٹکڑا چھوڑ کر 'ب' کی ملکیت سنبھال لیتا تھا اور 'ب' 'ا' کی ملکیت پر قابض ہو جاتا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ اس طرح توازن کا سلسلہ درہم برہم نہ ہونے پائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حد درجہ جھگڑوں کا امکان ان خاندانوں میں ہے جن کے مردوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کر رکھی ہوں۔ پٹھان مرد اکثر ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ حقیقی محرکات خواہ کچھ ہوں لیکن عام طور پر یا تو یہ وجہ پیش کی جاتی ہے کہ پہلی بیوی کے کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا یا کوئی رومانی سبب بن جاتا ہے۔ پہلی شادی کا انتظام عموماً خاندان والے کرتے ہیں۔ دوسری شادی اکثر لوگ محبت کی بنا پر خود کر لیتے ہیں۔

تعدادِ ازدواج سے شدید مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ رواج یہ ہے کہ زمین اور جائیداد تمام بیٹوں میں برابر تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ پہلی بیوی کے بطن سے ہوں یا دوسری کے بطن سے۔ بیویوں کے درمیان رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ دوسری بیوی کے بیٹے میراث میں شریک ہوں گے تو پہلی بیوی کے بیٹوں کا حصہ گھٹ جائے گا۔ ہر بیوی اپنے بیٹوں کو سوتیلے بیٹوں کے خلاف بھڑکاتی ہے اس وجہ سے بیٹوں میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔

میراث کی پیچیدگیاں' بھائیوں کے درجوں کی عدم مساوات اور تعدادِ ازدواج کشیدگی اور تنازع پیدا کر دیتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ جائیداد کے کسی خاصے حصے پر ضرور قبضہ ہو جائے۔ تنازع کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اول مختلف سوتیلے بھائیوں کے درمیان کھلی جنگ' دوم سوکنوں کی ایک دوسری کے خلاف جادو ٹونے' ٹوٹکے کے ذریعہ سے جدوجہد' تاکہ شوہر کی محبت صرف اسے مل جائے۔

جب کشمکش تشدد کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پٹھانوں کا ضابطۂ عزت بدلہ لینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان' چونکہ بدلہ بھی میراث کی طرح منتقل ہوتا رہتا ہے' لہٰذا ممکن ہے کہ ایک پشت گزر جانے کے بعد دو ایسے خاندانوں میں شدید جھگڑا پیدا ہو جائے جو ایک پشت پہلے ایک خاندان کی حیثیت رکھتے تھے۔ چچیرا بھائی چچیرے بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔

پٹھان کی زندگی میں یہ عام بات ہے۔ یہاں تک کہ چچیرے بھائی کے لیے ''تربوز'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جو ''دشمن'' کا مترادف بن گئی ہے۔ اس طرح دو خاندان دو جداگانہ خیل بن جاتے ہیں۔ ان کے درمیان پرانی نفرت قائم رہتی ہے۔ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی املاک کی حفاظت بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔ یہیں سے حقیقی اور واضح مجلسی نامساوات کا آغاز ہوتا ہے۔ پٹھان کا معاشرہ مختلف طبقوں میں نہیں بٹا ہوا' تاہم دولت اور اقتدار کے اختلاف کی بنا پر مجلسی حیثیت کی درجہ بندی قائم ہے۔

بعض خاندان بعض وارثوں کے لاولد مر جانے سے یا مختلف قسم کے دھوکوں سے یا اختیار و اقتدار کو غلط طریق پر برتنے سے اپنے قرابت داروں کے مقابلے میں زیادہ زمین حاصل کر لیتے ہیں۔ دولت کے ساتھ اثر ورسوخ بھی انہیں مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی حمایت کے لیے زیادہ آدمی فراہم کر لیتے ہیں اور ان کی حیثیت بڑھ جاتی ہے۔ یوں دولت مند آدمی اپنے ساتھ تنخواہ دار محافظ رکھ سکتا ہے' جنہیں وہ کھانا کھلاتا ہے' لباس دیتا ہے' رہنے سہنے کے لیے جگہ مہیا کرتا ہے اور ہتھیار بہم پہنچاتا ہے۔ یہ محافظ وادی کے باہر بھی اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ یوں دولت اور اثر ورسوخ اکٹھے چلتے ہیں۔ جن کے پاس زمین زیادہ ہو اور زیادہ ملازم رکھ سکیں ان کا مجلسی درجہ معاشرے میں زیادہ اونچا ہوتا ہے۔ خیل کا رئیس یا ملک سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ با اقتدار ہوتا ہے۔ اس کا درجہ بھی سب سے اونچا مانا جاتا ہے۔

سب سے نیچا درجہ ان غریب خاندانوں کا ہوتا ہے جن کے پاس کوئی اثر ورسوخ نہیں ہوتا۔ اگرچہ ذاتی طور پر دیانت داری' خدا ترسی اور حوصلہ مندی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور دولت مند یا با اقتدار لوگوں کی نظروں میں بھی یہ بہت اہم ہوتی ہے' ایسے ہی لوگوں کو ملازم رکھنے کیلئے منتخب کیا جاتا ہے اور وہ اپنے آقاؤں کی روزانہ زندگی میں براہِ راست شریک ہو جاتے ہیں۔ پٹھانوں میں مجلسی درجے کی واضح اور روایتی حدود یہ ہیں۔

1۔ مستورات پردے میں رہیں اور نسبتاً کوئی کام کاج نہ کریں۔

2۔ مہمانداری میں تکلف اور لوگوں سے بڑھ چڑھ کر کیا جائے۔

سخت کام عموماً مردوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ گھر کے باہر تمام کام وہی انجام دیتے ہیں مثلاً کھیتی باڑی' ریوڑ چرانا' تجارت' لوہار' بڑھئی یا معمار کے کام یا سیاسیات میں حصہ لینا۔ عورتیں صرف گھروں کے اندر کام کرتی ہیں' مثلاً گھر اور بچوں کی نگہداشت کرنا' کھانا پکانا کاتنا' سینا پرونا' دودھ نکالنا اور جو جانور زنانہ احاطے کے اندر ہوں انہیں چارہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈالنا۔صرف دو کام ایسے ہیں جن کے لیے عورتیں گھر سے باہر جاتی ہیں۔ ایک پانی لانا' دوسرا چارہ اور ایندھن فراہم کرنا۔

جو خاندان دولت اور اقتدار میں اونچے درجے پر پہنچ جاتے ہیں ان کی عورتیں زیادہ تر کام ایسی خادماؤں کے حوالے کر دیتی ہیں جن کا تعلق عموماً غریب خاندانوں سے ہوتا ہے۔خصوصاً ایسے کام جو ذرا' پست درجے کے ہوں یا جن کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ منظر عام پر شاذ ہی آتی ہیں۔ان کی تن آسانی اور خانہ نشینی ان کا درجہ بلند کر دیتی ہے۔

مردوں کے اونچے معاشرتی درجے کی نشانی تواضع اور پر تکلف مہمان نوازی ہے۔یعنی کھانا کھلانا' چائے یا دودھ پلانا' حقہ پلانا' بات چیت کرنا' مہمانوں کو ٹھہرانا' باہر سے جو لوگ پناہ کے لیے آئیں انہیں پناہ دینا' خصوصاً ان لوگوں کو جن کا درجہ ان کے برابر یا بلند ہو' لیکن ذاتی ملازموں اور پیغام لانے لے جانے والوں کی بھی حفاظت کی جاتی ہے۔ایسے لوگوں پر خاندان والے بھروسا کرتے ہیں جن کی ذاتی وفاداری کا یقین ہو چکا ہو یا ان کے متعلق اچھی اطلاعات ملی ہوں۔مہمان داری عموماً حجرے یعنی قلعے کے مردانہ حصے میں کی جاتی ہے۔یہی وہ حصہ ہے جس میں مرد دن کے وقت آرام کرتے ہیں لہٰذا اسے ایک عام اجتماع کی جگہ بھی سمجھا جاتا ہے اور لوگ جتنی تعداد میں کسی شخص کے پاس جاتے ہیں' اسی سے قوم میں اس شخص کا درجہ متعین ہے۔

پٹھانوں کے ضابطہء عزت میں اسے میلمستیا کہتے ہیں (میلما بہ معنی مہمان) مطلب یہ ہے کہ معزز پٹھان کو مہمانداری کرنی چاہیے' ورنہ اس کے خاندان کی مجلسی حیثیت کو نقصان پہنچے گا۔ پٹھان اس لیے بھی مہمانداری کرتے ہیں کہ ان کا وقار بڑھے اور اس لیے بھی مہمانداری کرتے ہیں کہ جو حیثیت انہیں حاصل ہے وہ محفوظ رہے۔ بلا شبہ دولت اور اثر ورسوخ بلند حیثیت کی بنیادیں ہیں' لیکن وقار عملاً بڑھانے کی شکل یہی ہے کہ دولت مہمانداری پر صرف ہو۔مہمانداری کے ذریعے سے وقار میں اضافے کا معاملہ مساوی حیثیت کے پٹھانوں کے درمیان مقابلے کا میدان بن جاتا ہے۔ ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے سے آگے نکل جائے' اسے مزاحیہ انداز میں مجلسی مقابلہ سمجھا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب ایک مہمان خوب کھا پی چکتا ہے تو وہ مسکراتا ہوا میزبان سے کہتا ہے کہ جب آپ میرے ہاں آئیں گے تو بدلہ چکاؤں گا۔

اس نقطہ نگاہ سے پٹھانوں کا معاشرہ بہ حیثیت عمومی تقسیم اور مقابلے سے حد درجہ لبریز ہے۔ مساوات اور خیر سگالی کی نمائشی سطح کے نیچے نامساوات اور کشمکش کے عناصر پائے جاتے ہیں' مثلاً یہ خوف کہ دوسرا آگے نہ بڑھ جائے' پٹھان کے دل کو ہمیشہ پریشان کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات مسکراہٹ کے نیچے جارحانہ اقدام چھپا ہوتا ہے یا یہ یکا یک بھڑک اٹھتا ہے۔ بھائی ایک دوسرے سے چوکس رہتے ہیں۔ چچیرے رشتہ دار پہلو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوست زیادہ نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔ حقیقی دوستی صرف برابر کے لوگوں میں ہوسکتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں میں عموماً نہیں ہوتی۔ زمین کے معاملے میں حمایت کے سلسلے میں وفاداریوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے' صورتحال غیر متعین رہتی ہے۔ دولت مند اور بااثر لوگ اسی صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ ان کے پاس فائدہ اٹھانے کے وسائل ہوں اور وہ ان وسائل سے کام لیں۔

اس کشمکش کے دوران میں سرحد کا ایک نہایت عجیب و غریب کردار نمودار ہوتا ہے' یعنی ہوشیار اور کامیاب بدمعاش' وہ مناسب قیمت لے کر ہر کام پورا کر دیتا ہے یا دولت منداور بااقتدار آدمیوں کی دوستی حاصل کرنے کے لیے ان کے حکم بجالاتا ہے' اس لیے کہ جانتا ہے کہ کامیابی کی حالت میں خود اس کی ناموری میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسے عام طور پر بدمعاش ہی کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اسے گولی مار دے یا بعض لوگ پہلو بچا کر نکل جائیں لیکن وہ بہت سے آدمیوں کے ساتھ کھلم کھلا پھرتا رہتا ہے جو اس کی جانبازی خوش باشی اور لطیفہ گوئی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ داڑھی نہیں منڈاتا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی ہے۔ ہر شخص پر گہری نظر ڈالتا ہے' ٹوپی ٹیڑھی رکھتا ہے۔ ایک حجرے سے دوسرے حجرے میں چلا جاتا ہے۔ غرض وہ اپنے خاص قسم کے وقار میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں کو عموماً قبائلی اور منظم دونوں علاقوں میں برداشت کیا جاتا ہے' لہٰذا وہ ہر جگہ پھرتے رہتے ہیں۔ کہیں سے کوئی بات سنی تو وہ دوسری جگہ پہنچا دی یا سرحد پار کے کسی مجلسی معاملے کو طے کرنے میں مدد دے دی۔ اس بنا پر وہ علاقے کے حاکم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے ایک حد تک تشویش کا باعث بن جاتے ہیں جو سرحد کے دونوں جانب امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

منظّم علاقے کا دیہاتی معاشرہ

پٹھانوں نے کوہستانی علاقے سے نکل کر وادیِ پشاور میں منظم طریق پر کھیتی باڑی شروع کی تو انہیں دوسرے نسلی گروہوں سے بھی سابقہ پڑا جو پہلے سے اس کو سنبھالے بیٹھے تھے' نیز وہ ان منظّم حکومتوں کے زیرِ اثر آئے جن کا مرکز پشاور تھا۔ چنانچہ پٹھانوں کے بہت سے ممتاز خاندان ایک ایسے معاشرے کے حلقے میں پہنچ گئے جہاں طبقے اور ذات کے امتیازات کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پٹھانوں کے معاشرے کا قبائلی سانچہ ٹوٹ گیا اور مجلسی درجوں میں امتیازات نمودار ہوئے۔

پرانے آباد کار قبیلوں کے باقیات آج بھی وادیِ پشاور میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور قبیلے یہ ہیں۔ یوسف زئی' خلیل' مہمند' محمد زئی' داؤد زئی اور خٹک۔ اگرچہ اب یہ سیاسی اکائیوں کی حیثیت میں منظّم نہیں رہے' لیکن پرانے قبائلی علاقے جنہیں ٹپہ کہتے ہیں اب تک انہی سے منسوب ہیں۔ ان ٹپوں کے دیہات سے جو پٹھان متعلق ہوں اگر ان سے ان کے قبیلے کے متعلق سوال کیا جائے تو اپنے آپ کو یوسف زئی' خلیل وغیرہ بتائیں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قبائلی علاقے ایک زمانے میں وادی کی ذیلی انتظامی تقسیمات کی بنیاد تھے۔ اگرچہ بعد میں تبدیلیاں ہوتی رہیں' لیکن قبائلی اور انتظامی حلقے آج بھی بڑی حد تک مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ اس ایک پہلو کو چھوڑ کر اور کسی بھی لحاظ سے قبائلی حلقوں کی کوئی انتظامی اہمیت نہیں۔

اسی طرح خاندانی ڈھانچے اس حد تک ٹوٹ چکے ہیں کہ بہت سے پٹھانوں کو اپنے قریبی اسلاف کے نسب ناموں کے سوا کچھ علم نہیں اور وہ انہی خاندانوں سے آگاہ ہیں جو ان سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ پدری نسب کا اصول اب تک جاری ہے لیکن نسب نامے اہرامی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اگر سرکاری ریکارڈوں کو دیکھا جائے تو تاریخی لحاظ سے مختلف نسب نامے بہت اوپر تک تیار کیے جا سکتے ہیں لیکن عام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پٹھان ان دستاویزوں کا حوالہ صرف اس وقت دیتے ہیں جب کسی زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنا ہو' لہٰذا اگر تھوڑے سے آبائی نسب نامے کے علاوہ تعلق ثابت کرنا مقصود ہو تو خون اور شادی کے رشتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پٹھان چند پشتوں تک اپنی خونی قرابت داری سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اپنے گاؤں کے دوسرے خاندانوں سے قرابت داری کا علم ہو ممکن ہے یہ بھی بتایا جائے کہ گاؤں کے تمام پٹھان خاندان ایک دادا کی اولاد ہیں لیکن' منظم طریق پر رشتہ ثابت کرنا خاصا مشکل ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ قریبی خونی رشتوں کے سوا گہرے تعلق کا سلسلہ شادیوں کی بنا پر تو بتایا جا سکتا ہے۔ پدری نسب ناموں کی بنا پر نہیں بتایا جا سکتا۔

نسبی تعلقات زیادہ تر دیہات کے اندر تک محدود رہتے ہیں لیکن پٹھانوں کو اس بارے میں بھی محض سرسری معلومات ہیں۔ بہت سے دیہات مختلف پٹیوں میں تقسیم ہیں۔ پٹھان صرف اس قدر جانتا ہے کہ اس کے ہم نسب ایک پٹی میں جمع ہو گئے لیکن اس میں کئی سقم بھی ہیں جن سے وہ آگاہ نہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ بھی ممکن ہے کہ قبائلی حلقوں کے اندر ہم نسبی کی بنا پر بڑے بڑے گروہوں کا پتا لگایا جا سکے۔ پھر ایک نسب کے آدمیوں نے مستقل گاؤں آباد کر لیے اور ان کے آس پاس کے گاؤں پر دوسرے نسب کے لوگوں نے اپنے قبضہ جما لیا۔ پٹھان کا نقطہ نگاہ یہ نہیں اور ایسی چیزوں کی ساری قدر و قیمت محض تاریخی ہے۔

بہر حال وادی پشاور کے عام دیہات مختلف نسبوں کے پٹھانوں کا مجموعہ ہیں' یعنی جو خاندان باہم قرابت کا تعلق رکھتے تھے ان میں سے متعدد ایک جگہ جمع ہو گئے۔ دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب ایک جد امجد کی اولاد تھے۔ لیکن یہ علم کم لوگوں کو ہے کہ سب مل جل کر ایک ہی نسب پر پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے دیہات بھی ایک ہی جدِ امجد کی اولاد نے آباد کیے لیکن عام طور پر قرابت کا جو ذکر کیا جاتا ہے وہ خون اور شادیوں کی بنا پر کیا جاتا ہے نہ کہ پرانے نسبوں کی بنا پر کسی گاؤں کے جو خاندان آپس میں قرابت دار ہوں ان کا سردار ملک کہلاتا ہے جو تمام خاندانوں میں سے نہایت اہم خاندان کا اہم رکن ہوتا ہے۔ قبائلی علاقے میں دستور یہ ہے کہ ملک مقرر کیا جاتا ہے لیکن اسے محض ایک عزت کا لقب سمجھنا چاہیے۔ اس کا کوئی خاص وظیفہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیہات میں ایک سے زیادہ ملک ہوں۔ عام طور پر ان کا درجہ یکساں ہوگا' البتہ اُن میں خوش اخلاقی عزت اور باہم تعلقات کی بنا پر تفاوت ہوسکتا ہے۔

منظم علاقوں کے پٹھانوں میں خاندان انہی اصول پر منظم ہوتا ہے جن پر قبائلی علاقوں میں عمل ہے۔ شادی کے سلسلے میں بھی انہی ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے' ان میں تعددِ ازدواج بھی شامل ہے اور یہ امر بھی کہ خاندان کے اندر شادی کو ترجیح دی جاتی ہے بیٹے باپ کی' چھوٹے بھائی بڑے بھائی کی عزت کرتے ہیں۔ گھر کی تنظیم کا طریقہ بھی وہی ہے یعنی اس کے دو حصے ہوتے ہیں ایک جس میں زنانہ رہتا ہے دوسرا جہاں مرد کھیتی باڑی کے آلات اور جانور رکھتے ہیں نیز مہمانوں کو ٹھہراتے ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ منظم علاقوں کے دیہات میں دونوں حصوں کے درمیان ایک گلی بنادی جاتی ہے تا کہ علیحدگی مکمل ہوجائے۔ مردانہ حصے کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں ہوتیں اور ان میں استحکامات بھی زیادہ نہیں ہوتے۔ اصل استحکامات صرف زنانہ حصے میں کیے جاتے ہیں۔

ان دیہات کے خاندانوں میں بھی اسی طرح کشیدگی اور کشمکش کے امکانات موجود ہیں۔ جیسے قبائلی گروہوں میں پائے جاتے ہیں۔ عام دستور یہ ہے کہ ایک گھرانے کے کنبے دوسرے گھرانے کے کنبوں سے دانستہ الگ رہتے ہیں یا زیادہ سروکار نہیں رکھتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خاندان کے اندر جھگڑے پیدا ہوجائیں' یہاں تک کہ جن لوگوں کے نسب ایک یا دو پشت اوپر جا کر مل جاتے ہیں۔ ان کے درمیان بھی بول چال ختم ہوجاتی ہے۔ عدالتوں میں مقدمے چلتے ہیں اور وہ خفیہ خفیہ ایک دوسرے کی جائیداد تباہ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ دیہاتی پٹھانوں میں ہم خاندانی ان خاندانوں کے ساتھ گنی جاتی ہے جن سے بول چال کے تعلقات ہوں۔ اسے ''کھیڈا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی نیک و بد میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا۔ پٹھان کہتا ہے' فلاں گروہ کے ساتھ ہم نے کھیڈا کا تعلق پیدا کرلیا یا فلاں گروہ کے ساتھ کھیڈا کا تعلق توڑ لیا۔ جو خاندان آپس میں یہ تعلق توڑ لیتے ہیں وہ نہ ایک دوسرے کی شادی یا مرگ میں شریک ہوتے ہیں نہ ان کے جھگڑے طے کرنے یا ان میں امداد دینے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ خاندانی تعلق کا اصول محو ہوگیا۔ قرابت داری کے واجبات صرف باہمی موافقت تک محدود رہے۔ کھیڈا پورے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاندانوں پر حاوی ہوتا ہے نہ کہ افراد پر۔ ذاتی دوستی کی بنا پر دو خاندانوں کے بگڑے ہوئے تعلقات بھی درست کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے خاندانوں میں نامہ و پیام کا سلسلہ دوستوں یا غیر جانبدار ملازموں کے ذریعہ سے جاری رہتا ہے۔

خاندانوں کے درمیان تعلقات کے پر پیچ سلسلے کے نیچے گروہ بندی کا زبردست عنصر بھی موجود ہے۔ اسے گاؤں میں ٹپیوں کی تقسیم سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ ٹپیاں اکثر دیہات کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ روزانہ زندگی میں مخالف گروہوں کے بعض خاندان آپس میں کھیڑا کر لیتے ہیں۔ دو آدمیوں کے درمیان ذاتی وفاداری اس سلسلے کو ختم کر سکتی ہے لیکن جب کسی مسئلے پر گاؤں کی عمومی حیثیت کا اندازہ کیا جائے تو گروہ بندیوں کا فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ قبائلی علاقوں کی طرح پٹھان خاندانوں کے زیادہ تر تنازعات منظم علاقوں کے دیہات میں بھی خاندانی جائیداد کی میراث یا انتظام کے متعلق حکومت نے زمین کی رجسٹری کا جو نظام جاری کر رکھا ہے اس میں قرآن مجید کے قانون میراث کی پابندی کی جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ بیٹیوں کو بھی زمین میں سے حصہ ملے لیکن جو طریقہ پہلے چلا آ رہا ہے وہ اب بھی جاری ہے۔ حصے عام طور پر بیٹوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ عورتوں کو زمین میں حصہ نہیں ملتا' البتہ بیٹے موجود نہ ہوں تو بیٹی ہی وارث بنے گی' لیکن وہ کسی زبردست مرد رشتہ دار کی امداد کے بغیر قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتی۔ جہاں آبیاری کی نہروں سے پانی کی تقسیم خاص اہمیت رکھتی ہے وہاں پانی کے حقوق بھی میراث میں شامل ہوتے ہیں۔

گاؤں کی قابل زراعت زمین دو بڑے حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک ملکیت جو مختلف افراد کے کھیتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دوسری شاملات جو سب کی مشترکہ ہوتی ہے البتہ ملکیت کے حصے کے مطابق شاملات میں سب کے حصے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جہاں ملکیت سینکڑوں چھوٹے چھوٹے قطعوں میں بٹ جاتی ہو وہاں شاملات عموماً تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ اگرچہ اب بہت سے دیہات میں اسے بھی ملکیت کی طرح بانٹ لیا گیا ہے۔ شاملات بھی جھگڑے کا باعث بن سکتی ہے اس لیے کہ گاؤں کے با اقتدار آدمی اس پر تصرف کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر چہ عام حالات میں قبائلی روایات کی پیروی کی جاتی ہے لیکن جو پٹھان منظم علاقوں میں آباد ہیں مجلسی حیثیت کے متعلق ان کے نقطۂ نگاہ پر اس وجہ سے بہت اثر پڑا کہ گاؤں میں دوسری نسلوں کے لوگ بھی موجود تھے۔ عام طور سے ایسا بھی دیکھا گیا کہ زمینوں کے مالک پٹھان ہیں اور دوسری نسلوں کے لوگ محض بے زمین کاشتکار ہیں۔ مگر اس کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں' مثلاً شہر پشاور کے مشرقی حصے کے بہت سے گاؤں اعوانوں کی ملکیت ہیں۔

پٹھان مالکان اراضی کی اکثریت ایسی ہے جو خود کاشت نہیں کرتی بلکہ اپنی زمینیں بے زمین کاشتکاروں کو ٹھیکے یا بٹائی پر دے دیتی ہے۔ بعض پٹھان مالکان اراضی اتنے غریب ہیں کہ ان کے لیے فصل میں کسی کو حصہ دار بنانا ممکن نہیں اور وہ لازماً خود کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اگر چہ یہ امتیازات نمایاں نہیں لیکن ان کے ساتھ حیثیت کے درجے وابستہ ہیں جن کا اندازہ مجلسی طور طریق کے گہرے تجزیے سے ہوا۔

پٹھان مالکان اراضی اور بے زمین کاشتکاروں کے درمیان بھی طبقاتی حد قائم ہے۔ یہ اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب مالکان اراضی بے زمین کاشتکاروں کے خاندانوں میں شادیاں کرنے سے گریزاں رہتے ہیں' نیز کاشت کار مالکِ اراضی کو خان یا ملک کہہ کر پکارتے ہیں اور مالکِ اراضی کاشتکار کو اس کا نام لے کر پکارتا ہے۔ بس ان کے طبقاتی اختلاف کا کوئی واضح نشان نظر نہیں آتا' نہ ڈیل ڈول میں' نہ وضع قطع میں' نہ میل ملاپ میں۔ البتہ مالکِ اراضی کا لباس بہترین کپڑے کا ہوتا ہے۔

دیہات میں ذات پات کے نظام کے عناصر برسرکار دیکھے جاسکتے ہیں۔ نچلے درجے کے کاشتکار زمین کی کاشت کے علاوہ اور بھی بہت سے کام انجام دیتے ہیں مثلاً حجامت بنانا' دانے بھونا' لوہار کا کام کرنا خاص خاندانوں تک محدود ہے۔ اگر چہ بعض خاندانوں میں ذات کا انتساب پایا جاتا ہے' لیکن بھارت کی طرح ذات پات کی بنا پر گروہ بندی کہیں نہیں پائی جاتی۔ البتہ یہ امکان موجود ہے کہ ایک پیشہ بطور میراث اولاد میں بھی چلا جائے۔

زیادہ دولت مند پٹھان خاندانوں کے افراد وقتاً فوقتاً کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتے ہیں یا جانوروں کو چارہ ڈال دیتے ہیں لیکن اور کسی کام میں مشغول نہیں ہوتے۔ لیکن جو پٹھان مالکانِ اراضی غریب ہیں اور اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کرتے ہیں یا جن پٹھانوں کی زمینیں بک چکی ہیں وہ وقتاً فوقتاً دوسرے کام بھی کر لیتے ہیں' مثلاً دوکان کرنا اور کرائے پر گاڑیاں چلانا' لیکن وہ اُن پیشوں کو کبھی اختیار نہ کریں گے جو خاص ذاتوں سے وابستہ ہیں۔ یہ رجحانات شہروں کے آس پاس زیادہ قوی ہیں جہاں ذات پات کا عنصر زیادہ واضح ہے۔ پٹھان ملازم بھی گھروں کے اندر وہ کام انجام دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں جو دوسری نسلوں کے ملازموں سے وابستہ ہیں۔

پٹھان جانتے ہیں کہ زمین کی ملکیت انہی کی ہے لہٰذا ان میں سے جو لوگ زمینیں فروخت کر دیتے ہیں اور عام مزدوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں انہیں زیادہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس سلسلے میں درجے کی افتادگی کا احساس کاشتکاروں کو بھی ہوتا ہے' جس پٹھان کی زمین چھن چکی ہو اسے خان کہہ کر کبھی نہیں پکارا جاتا۔

ان پٹھانوں میں طبقاتی احساس اعلیٰ پیمانے پر پہنچ گیا جو پشاور کے حاکموں سے وابستہ ہو گئے۔ برطانوی راج سے پیشتر بہت سے مشہور پٹھان خاندانوں نے اپنے آپ کو حاکموں کے لیے اچھی خدمات انجام دینے کا اہل بنا لیا تھا۔ وہ ان حاکموں اور کوہستانی قبیلوں کے درمیان ثالثی کی خدمات انجام دیتے تھے۔ اس اعتبار سے گویا وہ موجودہ دَور کے پولیٹکل ایجنٹوں کے پیشرو تھے۔ برطانوی راج سے پہلے اور اس راج کے دَوران میں ان خاندانوں کو ارباب اور نواب کے موروثی لقب مل گئے' نیز جاگیریں دے دیں گئیں یا مالیہ میں حصہ دار بنا دیا گیا۔ جب ان خاندانوں کا کاروبار پولیٹکل ایجنٹوں نے سنبھال لیا تو ان کی جاگیریں حکومتِ پاکستان نے واپس لے لیں۔ تاہم ان کے القاب اور مجلسی حقوق اب تک باقی ہیں اور طویل مدت میں انہوں نے جو خاصا اقتدار اور اثر و رسوخ حاصل کیا تھا وہ بھی بحال ہے۔ ان میں سے دو خاندان بہت وسعت اختیار کر گئے ہیں' ایک مہمند ٹپے کے ارباب دوسرے خیل ٹپے کے ارباب۔ انہیں مجلسی اور سیاسی اعتبار سے پشاور میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ بہت سے دیہات کے مالک ہیں اور عام پٹھان مالکان اراضی یا کاشت کار جو مذکورہ بالا ٹپوں یا ہمسایہ ٹپوں میں رہتے ہیں ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑی عزت کرتے ہیں۔ انہیں مقامی طور پر اشراف کا درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے نسب نامے بڑے محفوظ رکھے ہیں اور ان نسب ناموں سے انہیں دلچسپی بھی بہت ہے۔ پٹھانوں کے دوسرے خاندانوں سے شادیوں کی بنا پر ان کی قرابت داری کے رشتے دوسرے پٹھان قبیلوں تک بھی پہنچ گئے اور ان قدیم امراء کے علاوہ بھی ارباب کا لقب دوسری جگہوں میں پایا جاتا ہے۔

اپنے کوہستانی بھائیوں کی طرح منظّم علاقوں کے پٹھان بھی خاندانی درجے کے روایتی نشانات کا خاص خیال رکھتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں وہ انتہائی حد پر پہنچ گئے ہیں خصوصاً عورتوں کو پردے میں رکھنے میں۔ وادیٔ پشاور میں پردے کی پابندی کا مسئلہ زیادہ اہم ہے نہ کہ عورتوں کی سرگری کا مسئلہ۔ اس لحاظ سے مغربی پاکستان میں وادیٔ پشاور کو قدامت پسندی کا مرکز ہونے کی شہرت حاصل ہے۔

جو عورتیں پردہ کرتی ہیں ان کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ جب تک گھر کی چار دیواری میں رہتی ہیں' جہاں خاندان کے لوگ کھانا کھاتے اور سوتے ہیں' برقع نہیں پہنتیں۔ اس حصے میں دوسرے خاندانوں کی پردہ دار خواتین یا بہت قریبی مرد رشتہ دار ملنے کے لیے آسکتے ہیں' لیکن چھوٹے درجے کے خاندانوں کی ملازم عورتیں یا دائیاں یا ان خاندانوں کی عورتیں' جن میں پردے کا رواج نہیں' ملنے کے لیے نہیں آسکتیں۔ پردہ دار عورتیں مختلف ضرورتوں کے لیے گھر سے نکلتی ہیں مثلاً ان رشتہ داروں سے ملنے کے لیے' جو اسی گاؤں یا دیہات میں رہتے ہیں' شادی یا مرگ کی تقریبات کے لیے۔ ایسے موقعوں پر وہ سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی رہتی ہیں اور جب تک دوسرے گھرانے کے زنانہ حصے میں نہ پہنچ جائیں برقع نہیں اتارتیں۔ موجودہ زمانے کے ڈاکٹر شاکی ہیں کہ عورتیں ٹیکا لگواتے وقت بھی برقع اوڑھے رہنے پر اصرار کرتی ہیں۔ شادی اور مرگ کی تقریبات میں عورتوں اور مردوں کے حلقے الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ گھر کے مختلف حصوں میں جمع ہوتے ہیں۔ منظّم علاقے کے دیہات میں بڑے زمینداروں کی عورتیں اسی قسم کا پردہ کرتی ہیں۔ خاندانوں کے جو لوگ بڑے قصبوں اور شہروں کی زندگی کا خاصا تجربہ رکھتے ہیں' اور بظاہر موجودہ زمانے کے ہمہ گیر میل جول کے بعض اوصاف اختیار کر چکے ہیں' ان کے ہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی پردہ اسی طرح کیا جاتا ہے۔ تاہم پردے کی یہ شکلیں انہیں خاندانوں میں رائج ہیں جو اس پر کاربند رہنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور جو اپنے عام درجے سے بلند تر مجلسی درجے میں پہنچنے کے آرزومند ہیں۔ لیکن پردے کا اثر چھوٹے طبقوں میں بھی موجود ہے۔ ان کی عورتیں بھی کسی نہ کسی حد تک علیحدگی اور روز ۔ کاروبار میں پردہ داری کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر کوئی اجنبی گزر رہا ہو تو کاشت کار کی بیوی فوراً اپنے گھر کے صحن کی پست دیوار کے پیچھے چھپ جائے گی۔ وہ پانی لانے کے لیے نکلے اور گلی میں چلتے ہوئے کسی اجنبی سے سابقہ پڑ جائے تو یا منہ پھیر کر کھڑی ہو جائے گی یا چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لے گی۔

اصل مسئلہ پردہ داری کا ہے نہ کہ بے عملی کا۔ اس کا ثبوت یوں بھی ملتا ہے کہ نہایت دولت مند اور معزز پٹھان خاندانوں کی عورتیں اعلیٰ تعلیم پاتی ہیں، مختلف پیشوں میں داخل ہوتی ہیں، مگر پردہ قائم رکھتی ہیں۔ وہ زنانہ کالجوں میں جاتی ہیں یا جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو مشترکہ طریق پر اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، وہاں ان کے لیے ایک حصہ مخصوص ہوتا ہے جس میں پردے کا انتظام رہتا ہے۔ اگر وہ جلسۂ عام میں آتی ہیں تو پردے کی پوری پابندی کرتی ہیں اور انہیں سب سے آگے کی قطار میں بٹھایا جاتا ہے۔

مردوں میں ہر جگہ مہمانداری اور تواضع کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کوہستانی علاقوں کی طرح میدانی علاقوں میں بھی اسے حیثیت اور وقار کا خاص نشان سمجھا جاتا ہے۔ منتظم علاقوں کے پٹھانوں کے لیے قبائلی علاقوں کی مہمانداری مثالی حیثیت رکھتی ہے اور ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ ویسی ہی مہمانداری کا ثبوت دے۔ مہمانداری سچا پٹھا ہونے کا نہایت قابل فخر نشان ہے۔ اور جو مہماندار ہو اسی کو پٹھانوں میں قابل عزت و احترام سمجھا جاتا ہے۔ ان علاقوں کے پٹھان مہمان کی خدمت کے بعد معذرت پیش کریں گے کہ جیسی مہمانداری چاہیے تھی نہ ہو سکی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے قبائلی وطن سے نکل کر سنگدل شہری معاشرے کی آغوش میں پہنچ گئے اور اس میں وہ وسائل مہیا نہیں جو قبائلی وطن میں مہیا تھے۔ ہر ذی استطاعت کو ان کے لیے ایک مہمان خانے یا حجرے کی تعمیر خاص طور پر عزیز ہوتی ہے۔ مہمان خانے پر فخر کا یہ عالم ہے کہ لوگ عام طور پر مہمان خانہ پختہ اینٹوں اور سیمنٹ سے بنائیں گے، اگرچہ ان کا گھر مٹی کی دیواروں کا بنا ہوا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک پٹھان گاؤں

اگر ہم ایک گاؤں کا تجزیہ کریں تو منتظم علاقے کے پٹھانوں کے معاشرے میں جو مختلف عناصر ہیں' دیہات کی مجموعی زندگی میں ان کے ارتباط کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح گاؤں کے سیاسی نظام کو جس میں مختلف نسلی اجزا شامل ہوتے ہیں' زیادہ واضح صورت میں ملاحظہ کیا جا سکے گا۔

پشاور سے کوئی سات میل شمال مشرق میں داؤدزئی قبائلی ٹپے کے اندر ایک گاؤں ہے جس کی آبادی آٹھ سو کے لگ بھگ ہے۔ اس کی زمینیں ایسی ہیں جیسے ہوائی جہاز کا کوئی تین پھلوں والا پنکھا ہوتا ہے۔ شمالی حصے میں نہری پانی اتنا آتا ہے کہ گنے کی فصل بوئی جا سکتی ہے اور یہ گاؤں کی ایک نہایت اہم فصل ہے۔ اس گاؤں میں اور کوئی خاص فن رائج نہیں۔ البتہ ایک ہمسایہ گاؤں ہے جس میں ضلعے بھر کے لیے چکی کے پات تیار ہوتے ہیں۔ بیرونی دنیا سے تعلق زیادہ تر زبانی پیغامات یا قاصدوں کے ذریعے بھیجی ہوئی تحریروں تک محدود ہے۔ متعدد مالکانِ اراضی کے پاس ریڈیو سیٹ ہیں۔ وہ ریڈیو پاکستان کی مقامی نشریات سنتے ہیں۔ اخبارات وقتاً فوقتاً ان لوگوں ہی کے ذریعے آتے ہیں جو کبھی کبھار شہر چلے جاتے ہیں۔ گاؤں میں نہ کوئی ٹیلی فون ہے اور نہ ڈاک باقاعدہ آتی جاتی ہے۔

اس گاؤں میں نسلی اعتبار سے تین بڑے گروہ رہتے ہیں۔ پٹھان' اعوان اور سید۔ بعض غیر پٹھان عناصر کے دوسرے افراد بھی تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ موسم سرما میں مقامی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ قبائلی علاقے کے بہت سے خاندان نیز بھارت کے غلزئی یہاں آ جاتے ہیں۔ بحالتِ موجودہ تمام دیہات کے افراد سنی مسلمان ہیں۔

باشندوں کے مکانات کے علاوہ گاؤں میں نو دکانیں ہیں۔ ان کا کاروبار تبادلہ جنس کی بنا پر چلتا ہے۔ گاؤں کی فالتو پیداوار یا تو یہیں دے کر دوسری چیزیں خرید لی جاتی ہیں یا آڑھتیوں کے ذریعے سے اس پیداوار کو شہر میں فروخت کیا جاتا ہے۔ پانچ مسجدیں ہیں جن میں سے چار میں عام لوگ جا سکتے ہیں۔ پانچویں ایک نجی گھر کے اندر ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخوں کا ایک خاندان اس کا نگراں ہے۔ جہاں سے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے قریب ایک وسیع کھلی جگہ ہے جس میں بچے کھیلتے ہیں۔ گاؤں میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں عام لوگ جمع ہوسکیں۔ دولت مند خاندانوں نے متعدد مہمان خانے یا حجرے بنا رکھے ہیں جن میں مالکان اراضی اوران کے دوست اور ملازم وقتاً فوقتاً جمع ہو جاتے ہیں۔

مجلسی اعتبار سے گاؤں میں تین بڑے طبقے ہیں:

1- پٹھان مالکانِ اراضی

2- بے زمین اعوان اوران سے وابستہ نسلی اجزا

3- سید

گویا مجلسی طبقات زمین کی ملکیت اورنسلی گروہ دونوں سے متعلق ہیں۔

پہلا اور دوسرا طبقہ دو متضاد سروں پر ہیں اور ان کے درمیان ایک زبردست دیوار حائل ہے۔ نہ دوسرے طبقے کو زمین کی ملکیت مل سکتی ہے اور نہ اس کے ساتھ پہلا طبقہ شادی کرسکتا ہے۔ حق شفعہ کا قانون رائج ہے جس کے مطابق زمین وہی لوگ خرید سکتے ہیں جن کے پاس پہلے سے زمین ہو' اس بنا پر بے زمین لوگوں کو گاؤں میں زمین حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے' خواہ ان کے پاس خریدنے کے لیے روپیہ موجود ہو۔ پٹھان مالکانِ اراضی بے زمین اعوانوں کے ساتھ شادیاں کرسکتے ہیں لیکن عملاً ایسی کوئی مثال موجود نہیں' اس لیے کہ مالکانِ اراضی جن اوصاف کے متقاضی ہیں وہ بے زمین کاشت کاروں میں نہیں پائے جاتے' یعنی زمین کی ملکیت اور سخت پردہ۔ یہی دو چیزیں حقیقی حیثیت کا نشان ہیں۔ پوری زمین پٹھانوں کے قبضے میں ہے' گاؤں کا پانی بھی انہی کے قبضے میں ہے۔ اس طرح وہ دولت' اثر و رسوخ اور اختیارات کا مرکز بن گئے۔ ان خاندانوں میں بھی ہر فرد کی زمین کی مقدار کے مطابق خاصی درجہ بندی ہے۔ سب سے نیچے کے حصے میں ایک یا دو خاندان ہیں جن کے ہاتھ سے زمین نکل چکی ہے اور وہ عملاً نچلے طبقے کے افراد بن گئے ہیں۔ سب سے اونچا درجہ ان خاندانوں کا ہے جو صرف زمین کے مالک نہیں بلکہ بڑے زمیندار بھی ہیں۔ ان کو اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کی ضرورت نہیں' وہ چھوٹے طبقے کے کاشت کاروں کو اپنی زمینیں دے دیتے ہیں۔ ان خاندانوں کے بعض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارکان گاؤں سے باہر پشاور میں رہتے ہیں' بعض کالجوں میں پڑھتے ہیں' بعض فوجوں میں افسر ہیں' بعض نے نظم و نسق میں عہدے سنبھال رکھے ہیں اور بعض نے کاروبار شروع کر دیئے ہیں۔ نچلے طبقے کے خاندان نہ زمین کے مالک ہیں نہ مکانوں کے۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد کھیتی باڑی میں لگی ہوئی ہے۔ وہ یا تو موروثی کاشت کار ہیں یا عام کاشت کار' یا کاشت کے سلسلے میں مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسری خدمات انجام دیتے ہیں یا مختلف پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ یا تو پورا وقت انہی کاموں میں گزارتے ہیں یا کھیتی باڑی کے علاوہ کچھ وقت ان میں بھی صرف کرتے ہیں۔ مثلاً گاؤں کا حجام صبح کے وقت ہل چلائے گا تو دوپہر کے وقت لوگوں کی حجامت بنائے گا۔ ان میں سے بھی بعض لوگ کام کاج کے سلسلے میں شہر چلے گئے ہیں۔ بعض نے دوکانداری شروع کر دی۔ بعض کرائے پر گاڑیاں چلانے لگے۔ بعض نے دفتروں میں معمولی ملازمتیں اختیار کر لیں۔ موسم سرما میں قبائلی علاقے یا افغانستان سے نقل مکان کر کے جو لوگ آ جاتے ہیں انہیں کام مل جاتا ہے۔ بعض کھیتوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ بعض معماری کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

مالکِ اراضی اور کاشت کار کے درمیان اقتصادی تعلقات کی دو قسمیں ہیں ایک جنس سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری خدمات سے۔ مالکِ اراضی زمین دیتا ہے' پانی بہم پہنچاتا ہے اور دونوں کے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ کاشت کار بیج ڈالتا ہے' محنت کرتا ہے اور کھیتی باڑی کے لیے جانور اور آلات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وظائف کی یہ تقسیم بالکل واضح ہے اور قدیم زمانے سے اسی طرح چلی آ رہی ہے۔ چونکہ بے زمین لوگ مکانوں کے مالک نہیں ہوتے' لہٰذا وہ زمینداروں کے تعمیر کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں اس سلسلے میں زمیندار کی بعض خدمات انجام دیتے ہیں لیکن ان کا واضح تعین کوئی نہیں۔ اس وجہ سے زمیندار اور کاشتکار میں کشیدگی پیدا ہوسکتی ہے۔

زمیندار اور کاشت کار کے تعلقات اس لحاظ سے غیر مستقل ہیں کہ زمیندار ہر سال کاشت کاروں میں خاصا ردوبدل کرتا رہتا ہے۔ اس ردوبدل کی تحریک فریقین میں سے کسی کی بھی جانب سے ہوسکتی ہے۔ اس وجہ سے کاشت کاروں کو عام طور پر زمینداروں

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ البتہ ذاتی ملازموں اور محافظوں کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ حالانکہ وہ بھی چھوٹے طبقوں ہی سے لیے جاتے ہیں۔ انہیں عام طور پر ماہانہ تنخواہیں ملتی ہیں اور وہ اس حصے میں رہتے ہیں جو مردوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ چونکہ ذاتی معاملات میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے اور وہ کاشت کاروں کے مقابلے میں اپنے آقا کی زندگی کے ساتھ زیادہ گہرا تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے آقا و ملازم کا تعلق طبقاتی حد سے باہر بڑا ہی مستحکم ہوتا ہے۔

تیسرا بڑا طبقہ سیدوں کا ہے۔ ان کے متعدد خاندان ہیں لیکن نسب ایک ہے۔ ان کا درجہ پٹھانوں اور اعوانوں کے درمیان ہے لیکن یہ ایسی حیثیت اختیار کر گئے ہیں کہ انہیں مثلث کا کم و بیش تیسرا ضلع سمجھنا چاہیے۔ اگر چہ یہ لوگ اپنے خاندان میں شادی کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن سیدوں اور اعوانوں میں بھی شادیوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ البتہ سیدوں اور پٹھانوں میں شادی کی کوئی مثال موجود نہیں۔ اعوانوں کے مقابلے میں سید زیادہ خوشحال ہیں اس لیے کہ وہ اپنے گھروں کے مالک ہوتے ہیں اور پٹھان اپنی بعض زمینیں عارضی کاشت کے لیے انہیں دے دیتے ہیں اور ٹھیکہ یا بٹائی نہیں لیتے۔ سید ان زمینوں میں کاشت کاروں سے کھیتی باڑی کراتے ہیں۔ سیدوں کا عام پیشہ مذہبی قیادت ہے لیکن سید خاندانوں کے متعدد ارکان کھیتی باڑی، دکانداری یا گاڑی بانی بھی کرتے ہیں۔ گاؤں کا ایک سید پشاور کے پشتو اخبار کا مدیر ہے۔

گاؤں میں سیدوں کی پوزیشن بڑی عجیب ہے۔ گاؤں کے تمام لوگ بلا لحاظِ عمر انہیں خاص اعزازی لقب سے مخاطب کرتے ہیں۔ وہ قدیم مذہبی حیثیت کی بنا پر مُلا کے مقابلے میں زیادہ اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ مُلّا کا اثر ایک انفرادی معاملہ ہے جو اس کے علم، پس منظر، تربیت اور دیانت کی بنا پر گھٹا بڑھتا رہتا ہے۔ سید کا اثر و رسوخ نسب کی بنا پر ہے اور یہ عام طور پر مستقل مانا جاتا ہے۔ نچلے درجے کے دیہاتیوں کے نزدیک تو سیدوں کو خاص عزت حاصل ہے ہی، زمیندار بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جن سیدوں کو خاندان میں اونچا درجہ حاصل ہوتا ہے ان سے زمیندار اور کاشت کار دونوں وقتاً فوقتاً مشورہ لیتے رہتے ہیں لیکن اس اثر و رسوخ کے باوجود سیدوں کو وہ درجہ حاصل نہیں جو زمینداروں کو حاصل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لیے کہ وہ زمین کے سلسلے میں زمینداروں کے محتاج ہیں۔ البتہ وہ اونچا درجہ حاصل کرنے کے درپے ہیں اور وہ اس طرح کہ ان کی عورتوں میں پردے کا سخت رواج ہے۔

گاؤں میں ملاؤں کی بھی خاص تعداد ہے۔ بعض کو طالب علم کہا جاتا ہے۔ دوسرے ملا مقرر ہیں جو گاؤں کی تین مسجدوں میں امامت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ چوتھی مسجد کا امام ایک نوجوان سید ہے جس نے پشاور کی دینی درسگاہ میں تعلیم پوری کی۔ مسجدوں اور ملاؤں کی دیکھ بھال اور امداد دولت مند زمیندار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مُلا کی حیثیت اس کے ذاتی اوصاف یا امداد کی صورت اور سرپرستوں کے عطیات کے قبول پر موقوف ہے۔ پٹھانوں میں بہت سے ملا غریب قبائلی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا زیادہ تعلق نچلے طبقات سے ہے۔ ان میں سے بعض بظاہر بہت نااہل ہیں اور ان کا چنداں اعزاز نہیں کیا جاتا۔ اچھے تعلیم یافتہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے برعکس معزز ملاؤں کو جو امامت کی خدمت انجام دیتے ہیں زمینداروں کے خاندانوں نے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے اور یہ اپنے سرپرستوں کے خاندانوں کا مستقل حصہ بن گئے ہیں۔

گاؤں میں ایک ابتدائی سکول ہے جس کے مدرس کی تنخواہ سرکار دیتی ہے لیکن اس کی حیثیت کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ استاد احمدی یا قادیانی فرقے سے تعلق رکھتا ہے اور بچوں کو سکول کے اوقات میں تعلیم دینے کے سوا کسی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تعلیم دینے کے بعد یہ پاس کے ایک گاؤں میں اپنے گھر چلا جاتا ہے۔

گاؤں کا ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ اس میں ایسا اتحاد و تعاون موجود نہیں جو پورے گاؤں پر حاوی ہو' گو مختلف اوقات میں محدود قسم کے تعاون کی مثالیں ملتی ہیں۔ پٹھان خاندان اگرچہ ایک جد کی اولاد ہیں' لیکن اب ان کے کئی گروہ بن چکے ہیں اور ہر گروہ کئی خاندانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں مشترکہ مفاد کا احساس بہت کم ہے۔ بعض ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ بعض ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ کم از کم دو خاندان ایسے ہیں جن میں مدت سے خونی جھگڑا چلا آ رہا ہے اور وہ بندوقیں اٹھائے پھرتے رہتے ہیں۔ گاؤں کی دو پٹیاں ہیں' ایک بالائی دوسری زیریں۔ کچھ خاندان ایک میں آباد ہیں' کچھ دوسری میں۔ جب گاؤں میں حکومت کی طرف سے انجمن امدادِ باہمی قائم ہوئی تو ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گروہ بندی بالکل نمایاں ہوگئی۔

صرف چند خاندان جونسبتاً قرابت دار ہیں اتحاد و تعاون کا حقیقی احساس کر سکتے ہیں' لیکن یہ سلسلہ بھی محدود ہے۔ مختلف خاندانوں کے مالکان اراضی کے درمیان تعاون کی صورت اس وقت نکل آتی ہے جب ان کے لیے کوئی مشترکہ خطرہ پیدا ہو جائے۔ مثلاً ہمسایہ گاؤں کے ساتھ پانی پر جھگڑا رونما ہو' لیکن اس قسم کا تعاون پورے گاؤں کی حالت درست کرنے میں کام نہیں دے سکتا۔ اعوانوں کے نچلے طبقے کے خاندانوں نیز دوسرے نسلی گروہوں میں زیادہ اتحاد ہے۔ یہ لوگ مختلف کاموں کے سلسلے میں مل جاتے ہیں اور کھیتی باڑی کے ضمن میں مل جل کر ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں۔ اس طبقے میں بعض خوشحال کاشت کار ہیں جو بااثر ہیں۔ جب کوئی مشترکہ خطرہ پیدا ہوتو یہی لوگ اپنے طبقے کی طرف سے ترجمان بنتے ہیں۔ سید بھی اسی طبقے کے طرف دار ہیں اور وہ زمینداروں کے مقابلے میں اِکا دُکا کاشتکاروں کی بھی طرفداری کرتے ہیں اور کوئی بڑا معاملہ پیش آ جائے تو کاشت کاروں کے ترجمان کو امداد دیتے ہیں۔ جب اس گاؤں میں امریکی گندم کی تقسیم کاشت کاروں اور مزدوروں کی امیدیں پوری نہ کر سکی تو ان کے ترجمان اور ایک تعلیم یافتہ سید نے حکومت کے ذمہ دار افسر کے پاس ایک درخواست پیش کر دی۔

گاؤں کے حالات پر بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اگر وہاں وسیع پیمانے پر تعاون کی تحریک جاری کی جائے' خواہ اس کی حیثیت سیاسی ہو یا اقتصادی' تو تعاون کرنے والے گروہ یا تو مالکانِ زمین ہوں گے یا کاشت کار' دونوں بیک وقت کبھی تعاون نہ کریں گے۔ مالکانِ زمین میں بھی تعاون انہیں خاندانوں تک محدود ہوگا جن کا باہم تعلق ہے اور ان میں موافقت ہے۔ گویا مشترکہ عمل کی ہر تجویز کو انجام کار یا تو بے توجہی اور بے پروائی سے دیکھا جائے گا یا اس کی مخالفت کی جائے گی۔ گاؤں کے مذہبی رہنما بھی اس صورتِ حال کے متعلق واضح طور پر توجہ دلاتے رہتے ہیں' خصوصاً نمازِ جنازہ کے بعد دعاؤں میں۔ یہی ایک موقع ہوتا ہے جس میں زیادہ تر لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ مذہبی رہنما ایسے موقع پر نصیحت کرتا ہے کہ پورے گاؤں کو مل جل کر اور اتحاد سے رہنا چاہیے۔ مگر اس پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے یا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں جن کا اثر پورے گاؤں پر پڑتا ہو تو دیہات کے باشندے امداد کے لیے حکومت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وادیٔ پشاور میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک حکومت پر انحصار کا یہ سلسلہ بہت ترقی کر گیا ہے اور یہ خوب مستحکم ہے۔ مالکانِ اراضی اور کاشت کار دونوں کا اسی پر عمل ہے۔

گاؤں کی سیاسی تنظیم میں بھی عدم اتحاد نمایاں ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حکمرانی کے دو مختلف اصولوں میں تصادم پایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی بھی اصول مؤثر طور پر عمل میں نہیں آتا۔ ایک اصول ہے مرکزی اختیار اور قانون کا ہے جس کا نمونہ صوبائی حکومت ہے جس کا مرکز لاہور ہے۔ دوسرا اصول ثالثی اور مشورت کا ہے' جو قبائل میں رائج ہے۔

گاؤں میں صرف دو سیاسی کارکن ہیں' ایک نمبردار دوسرا چوکیدار' ان دونوں کو صوبائی حکومت کے کارندے سمجھنا چاہیے۔ گاؤں کے داخلی سیاسی ڈھانچے سے ان کا کوئی گہرا تعلق نہیں۔ نمبردار زمین کا مالک ہوتا ہے جو مالیہ اور آبیانہ جمع کرنے کا کام سنبھال لیتا ہے اور اسے اس خدمت کے لیے معاوضہ ملتا ہے۔ اگر کسی گھر کی تلاشی لینی ہو تو نمبردار کو پولیس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ گاؤں میں چار نمبردار ہیں اور وہ ان خاندانوں سے مالیہ وصول کرتے ہیں جن کا ان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ چوکیدار کاشتکاروں کے طبقے میں سے ہوتا ہے جس کا خاص کام یہ ہے کہ پیدائش اور مرگ لکھوائے اور وقتاً فوقتاً مقامی تھانے کو رپورٹیں بھیجتا رہے' وہ سمن بھی پہنچاتا ہے اور دورہ کرنے والے افسروں کو عام امداد دیتا ہے۔ یہ دونوں عہدے عام طور پر موروثی ہیں اور اثر و رسوخ والے لوگ ان پر فائز چلے آتے ہیں۔ گویا گاؤں میں کوئی مستقل مرکزی با اختیار عہدہ نہیں جو انتخاب یا تقرر کے ذریعے پُر ہوتا رہے۔

گاؤں میں جتنا بھی مجلسی نظم و ضبط ہے وہ مختلف غیر رسمی تدبیروں کے ذریعے سے ہے۔ مثلاً مذہبی پابندیاں' عوام کی تضحیک کا خوف اور بااقتدار زمینداروں کی طرف سے سزا کا ڈر۔ یہ تمام چیزیں کاشت کاروں پر دباؤ کا ایک ذریعہ ہیں۔ مالکانِ اراضی میں مذہب کی پابندیوں کا چنداں لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ڈر ضرور رہتا ہے کہ خود کنبے والوں کو ناگوار معلوم نہ ہو اور وہ میل جول ترک نہ کریں۔ پھر بدلے کا خوف بھی رہتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور یہ خوف بھی بالکل ہی ناقابل توجہ نہیں کہ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلا جائے گا لیکن گاؤں والوں کی عام عادت یہی ہے کہ معاملہ پولیس تک نہیں پہنچاتے۔

مختلف افراد کے درمیان تنازعات مدت تک قائم رہیں تو ان کا فیصلہ ثالثی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ اثر و رسوخ والے افراد ثالث مقرر کر لیے جاتے ہیں اور وہ فریقین کی طرف سے درخواست کی بنا پر زمیندار اور سید ہونے کی حیثیت میں فیصلہ کر دیتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے معاملات میں ذی اثر سید ثالث مانے جاتے ہیں' جہاں ثالثی کامیاب نہ ہو وہاں فریقین میں سے کوئی ایک غیر جانبدار فریق جرگہ بلا لیتا ہے۔ جرگہ اس معاملے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جرگے میں متعدد آدمی شریک ہو سکتے ہیں کہ عام طور پر زیادہ آدمی جمع نہیں ہوتے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ثالث یا کونسل کے رکن باہر سے بلا لیے جاتے ہیں تاکہ غیر جانبداری شبہ سے بالا رہے۔

زمینداروں کے درمیان خون کے جھگڑے شروع ہو جائیں تو وہ ان ذریعوں سے طے نہیں ہوتے۔ کونسل کے رکن گاؤں کے نمائندے نہیں سمجھے جاتے اور قبائلی علاقوں میں ایسی کوئی جماعت نہیں ہوتی جس کے رُو بُرو مقدمہ پیش کیا جا سکے۔ چونکہ پٹھانوں کے قرابت دار گروہوں میں افتراق پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہ رہا کہ جس گروہ سے مخالف فریقوں کا تعلق ہے اس کے آدمی جھگڑا طے کرنے کے بھی خواہاں ہوں اور ان کی رائے زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار بھی رہے۔ اس قسم کے معاملات میں ذمہ داری حد درجہ محدود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی خونی قرابت دار کی حمایت محدود رہتی ہے اور اس قسم کے جھگڑوں میں زیادہ آدمی نہیں الجھتے کہ مبادا پوری جماعت کی حفاظت کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے۔ انہیں دیہاتی معاشرے میں کیسہ بند سرطان سمجھنا چاہیے۔

گاؤں پر مجلسی کنٹرول نظری اعتبار سے صوبائی حکومت کا ہوتا ہے جو خاص قانون اور عدالتوں کے ذریعے سے عمل کرتی ہے۔ قانون اصل میں ایک حد تک مذہبی تھا لیکن نظم و نسق میں حکومت غیر مذہبی طور پر کام کرتی ہے بعض انتہائی معاملات اس کے روبرو پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسا حل نہیں ہوتا جو دیہاتیوں کے لیے باعثِ تسلی ہو۔ مقدمات لامتناہی طور پر جاری رہتے ہیں۔ خرچ بہت ہوتا ہے' سزائیں ہلکی دی جاتی ہیں' فیصلے ہمیشہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نافذ نہیں کیے جاتے۔ اگر معاملہ خونی انتقام کا ہو تو سچے پٹھان کی نگاہ میں موت کی سزا بھی اُس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ لہٰذا یہ سمجھنا چاہیے کہ گاؤں میں نظم وضبط کے روایتی اداروں کو اس ذریعے سے کوئی مؤثر مدد نہیں ملتی۔ البتہ یہ خارجی اور اعلیٰ اقتدار' ثالثی نظام' اور جرگے کے نظام کو ٹھیک ٹھیک چلنے میں ضرور مدد دیتا ہے۔

پشاور کی وادی کے طول وعرض میں دیہات کی سطح پر اصل صورتِ حال یہی ہے' لہٰذا اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ گاؤں کے اندر یا مختلف دیہات اور صوبائی قانون ساز مجلس کے درمیان کوئی منتخب مجلس نہیں بن سکتی۔ متعدد مرتبہ کوششیں کی گئیں کہ گاؤں میں مستقل سیاسی ڈھانچہ قائم ہو جائے' خصوصاً پنچایت کی شکل میں' لیکن ہر کوشش گاؤں کے اندر مخالف عناصر کی نمائش کا ذریعہ بنی اور مخالفت ختم نہ ہو سکی۔ 1954ء میں ایسا کوئی نظام موجود نہ تھا' اگرچہ سرکاری حلقوں میں نظام جاری کرنے کی بات چیت ہو رہی تھی۔[1]

شاید سمجھا جائے کہ گاؤں اور صوبائی حکومت کے درمیان انتظامی خلاء نظم ونسق کے مختلف افسروں کے ذریعے سے پُر کیا جاتا ہے۔ دیہاتی مجبور ہیں کہ افسروں اور ان کے مقرر کیے ہوئے ایجنٹوں کے فیصلے قبول کریں' خصوصاً ان افسروں کے جن کا تعلق محکمہ مال سے ہے لیکن ان کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔ اس لیے اندیشہ رہتا ہے کہ وہ رشوت لے کر ریکارڈ اور گواہیاں بدل دیں گے۔ اس طرح دیہاتیوں کے درمیان بے اعتمادی اور کشیدگی بڑھتی ہے اور دیہاتی معاشرے میں جو اختلافات موجود ہیں وہ انجام کار زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں۔[2]

---

[1] بنیادی جمہوریتوں کے نفاذ کے بعد یہ صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔

[2] اب ان حالات کی اصلاح ہو گئی ہے اور مزید اصلاحی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

6

قبائلی علاقے کے پٹھان

(جیمز ڈبلیو۔ سپین)

پاکستان کی جو مردم شماری 1951ء میں ہوئی تھی' اس میں وادیٔ پشاور سے ملے ہوئے قبائلی علاقے کی آبادی چھبیس لاکھ سینتالیس ہزار ایک سو اٹھاون بتائی گئی تھی۔ ساتھ ہی اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اندازہ محدود ہی ہے۔ مگر معتبر ترین اعداد جو اب تک حاصل ہو سکے ہیں یہی ہیں اور انہیں کسی زیادہ تامل کے بغیر قبول کر لینا چاہیے۔ مردم شماری سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پچیس لاکھ سے زیادہ آبادی میں صرف سترہ ہزار آٹھ سو پچھتر آدمی خواندہ ہیں۔ ان میں سے چار ہزار آٹھ سو بانوے خواندہ افراد صرف مالاکنڈ ایجنسی میں رہتے ہیں جو ریاست سوات پر مشتمل ہے اور یہ ریاست بڑی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ہے۔ پاکستان ابھی تک ان بے خانماں لوگوں کے بوجھ کے نیچے لڑکھڑا رہا[1] ہے جو فسادات میں گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ بہ ایں ہمہ قبائلی علاقے میں صرف بیس تارکین وطن آباد ہوئے ہیں (اس کے برعکس پنجاب کی ایک کروڑ نوے لاکھ آبادی میں سے پچاس لاکھ کے

---

[1] یہ کتاب 1957ء میں چھپی تھی جس وقت کا یہ ذکر ہے اس کے مقابلے میں اب حالات بہتر ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ مہاجرین پاکستان پر بوجھ ہیں' نہ پاکستان کسی لحاظ سے غیر مستحکم ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پچاس لاکھ کے قریب مہاجر ہیں) سرحد کے بارے میں مذکورہ بالا اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا نیز منقطع علاقہ بیرونی دنیا کی تمام شائستگیوں سے الگ تھلگ رہا اور اس نے بقیہ جنوبی ایشیا سے کوئی ربط وضبط قائم نہ رکھا۔

قبائلی علاقے کے انتظامات

حال ہی میں مغربی پاکستان کے تمام علاقوں کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے قبائلی علاقے کی جداگانہ حیثیت واضح نہ رہی۔ بہرحال ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلی حالت میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا' البتہ اس علاقے کی انتظامی ذمہ داری مرکزی حکومت کے بجائے مغربی پاکستان کی حکومت کے حوالے ہوگئی' مگر قبائلی علاقے کی داخلی انتظامی تقسیمات مغربی پاکستان کے ایک یونٹ کی حکومت کے باعث نہیں بدلیں۔ وہی پانچ ایجنسیاں ہیں جن کے ذریعے سے قبائلی علاقے پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں سے پانچ جغرافیائی ہیں اور ایک قومی یعنی شمال میں اول مالاکنڈ ایجنسی جس میں دیر' سوات اور چترال شامل ہیں' دوم مہمند ایجنسی جو ایک لاکھ مہمندوں کے انتظام کی ذمہ دار ہے' یعنی وہ مہمند جو پاکستان میں رہتے ہیں اور جن کی آبادیاں دریائے کابل کے شمال میں ہیں' سوم خیبر ایجنسی جو شہرۂ آفاق درۂ خیبر پر مشتمل ہے۔ (اس میں زیادہ تر آفریدی اور شنواری شامل ہیں) چہارم کرم ایجنسی۔ یہ وادیٔ کرم کے زیادہ ترقی یافتہ اور نسبتاً خوش حال علاقے پر مشتمل ہے اس میں عام طور پر توری آباد ہیں۔ پانچویں وزیرستان ایجنسی' جس کے دو حصے ہیں' شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان۔ شمالی وزیرستان میں تندخو اور زبردست وزیری قبیلہ آباد ہے' اس کے ساتھ بعض اور چھوٹے چھوٹے قبیلے بھی رہتے ہیں۔ جنوبی وزیرستان زیادہ تر پہاڑی چٹانوں پر مشتمل ہے اس میں وزیری اور محسود رہتے ہیں' ان کے درمیان مسلسل جھگڑے چلے آرہے ہیں۔

قبائلی علاقہ شمالاً جنوباً کوئی چار سو میل ہوگا۔ یہ ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ ڈیورنڈ لائن پاکستان اور افغانستان کے درمیان تنازعات کا سرچشمہ ہے۔ مہمند ایجنسی کے سوا تمام ایجنسیاں برطانوی نظم ونسق سے میراث میں ملی تھیں۔ مہمند ایجنسی 1952ء میں بنی تھی ہر ایجنسی میں ایک پولیٹکل ایجنٹ ہوتا ہے جس کے ماتحت چند پولیٹکل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افسر ہوتے ہیں اور مہمند ایجنسی کے تمام ایجنسیوں میں سکاؤٹوں کا ایک جیش رہتا ہے جس کی کمان پاکستانی فوج کے افسروں کو سونپی جاتی ہے۔ پولیٹکل ایجنٹ ضرورت کے موقع پر خاصہ داروں کو بھی بلا لیتا ہے۔ خاصہ دار سرحد میں ان قبائلی فوجیوں کو کہتے ہیں جن کی کوئی فوجی وردی نہیں ہوتی۔ ان سے صرف چوکی پہرے' نگرانی اور گشت کا کام لیا جاتا ہے۔ ان ایجنسیوں کے علاوہ قبائلی علاقے کے چھوٹے چھوٹے حصے پرانے صوبۂ سرحد کے چھ منظم اضلاع سے وابستہ ہیں۔ مثلاً ہزارا' مردان' پشاور' کوہاٹ' بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے علاقے ملے ہوئے ہیں۔ ان کے انتظام کی ذمہ داری متعلقہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کے حوالے ہے۔ قبائلی علاقے کے مختلف حصوں میں جو ذمہ دار افسر مقرر ہیں وہ اپنی رپورٹیں' مغربی پاکستان کے اس سیکرٹری کے پاس بھیجتے ہیں جو قبائلی معاملات کا ذمہ دار ہے۔ وہ نیز قبائلی معاملات کے ذمہ دار وزیر پشاور میں رہتے ہیں' باقی تمام محکمے اور ان کے رئیس صوبے کے دارالحکومت لاہور میں ہیں۔

پاکستان کی ہوائی فوج کا ایک چھوٹا سا مرکز شمالی وزیرستان کے مقام میراں شاہ میں ہے۔ اس کے سوا باقاعدہ پاکستانی فوج کا کوئی یونٹ قبائلی علاقے میں نہیں رہتا۔ حکومتِ برطانیہ نے جابجا جو فوجی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں وہ سب قیام پاکستان کے تھوڑے عرصے بعد ہٹالی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ نئی قومی حکومت کو قبائلیوں پر پورا اعتماد ہے۔ قبائلی علاقے کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں اب تک پاکستان کے تمام قوانین و ضوابط پوری طرح جاری نہیں ہوئے۔ پرانے انتظامی طور طریقے ہی چل رہے ہیں۔ خود مقامی قبائلی جرگے پٹھانوں کے روایتی قانون اور سرحد کے ضوابط جرائم کے مطابق امن قائم رکھتے ہیں۔ آخر الذکر ضوابط قوانین کا ایک یگانہ مجموعہ ہے جو 1901ء میں بنا تھا۔ اس کی رو سے شہادت کے عام قوانین معطل کر کے مقدمہ جرگے کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور جرگے کے آدمی پولیٹکل ایجنٹ تجویز کرتا ہے۔

جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے قبائلی علاقے کو دیکھا جائے تو اس میں ایک طرف شمالی چترال ہے جس کی بعض چوٹیاں پچیس ہزار فٹ بلند ہیں' دوسری طرف بلوچستان کا صحرائی ریگزار ہے۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے' مثلاً سوات اور کُرم کی وادیاں' تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ سارا علاقہ بنجر ہے مگر قبائلی علاقہ جغرافیائی اور ثقافتی لحاظ سے مشرقی ڈھلانوں پر مرتکز ہے جن سے نکل کر بہنے والے دریا پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد کی حیثیت رکھتے ہیں، قبائلی ایجنسیوں کی سرحدیں منظم اضلاع کے ان حصوں میں آ کے ملتی ہیں جہاں سے زمین یا ڈھلان شروع ہو کر دریائے سندھ تک آتی ہے۔ سارا علاقہ قابل کاشت ہے۔ مغربی جانب رہنے والے لوگ افغانستان میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی حالت بھی وہی ہے جو مشرقی جانب رہنے والوں کی ہے۔ یہ پہاڑی قبیلے عموماً مشرق و مغرب کی زرخیز میدانی زمینوں پر چھاپے مارتے رہتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ان دروں پر اپنا اقتدار قائم رکھا ہے جو پاک و ہند میں داخلے کے دروازے ہیں یعنی خیبر، کرم، ٹوچی اور گومل بہت سے اور چھوٹے چھوٹے درے۔

وسطی ایشیا اور وادیٔ گنگا کی بڑی طاقتیں باری باری اس علاقے کو اپنے درمیان سرحد بنانے کی کوشش کرتی رہیں۔ قبائلی ایجنسیاں 1901ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے بنائی تھیں اور انہیں داخلی سرحدی علاقے کی حیثیت دی گئی تھی۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ قبائلی مسئلہ دراصل اقتصادی ہے اور جب اس علاقے میں ایک حد تک خوشحالی کا دور شروع ہو جائے گا تو یہ مسئلہ باقی نہ رہے گا۔ یہ معاملے کو زیادہ سے زیادہ سہل سمجھنے اور سہل بنانے کی کوشش ہے۔ اصل مسئلہ اقتصادی اور جغرافیائی ضرورت پر مبنی ہے۔ ساتھ ہی یہ عجیب و غریب سیاسی تاریخ کا نتیجہ ہے، پھر ایک عامل ان آزاد اور خودمختار لوگوں کا طریق زندگی بھی ہے جو انہوں نے اختیار کر لیا ہے۔ ان میں اپنے معاشرے کو بیسویں صدی کے دوسرے معاشروں سے ہم آہنگ کرنے کے رجحان کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔

باشندے:

پٹھان ایک ہندی اصطلاح ہے جو برطانیہ نے اختیار کر لی۔ ابتدا میں اس کا استعمال صرف پشتو بولنے والے لوگوں کے لیے ہوتا تھا۔ اس میں نسلی لوازم شامل نہ تھے۔ مقامی تلفظ میں ''ہ'' حذف ہو جاتی ہے۔ اصطلاح کو ''پٹان'' یا ''پتان'' کہتے ہیں۔ برطانیہ نے اس اصطلاح کو ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جو ڈیورینڈ لائن کی مشرقی سمت میں رہتے تھے اور اب پاکستان میں ہیں۔ انگریز ان کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال کرتے تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنہیں قبائلی علاقے میں بہت غلبہ حاصل تھا۔ زیادہ صحیح لفظ پختون یا پشتون ہے' اگر چہ اس میں اک گونہ فریق بندی شامل ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ افغانستان' پختونستان نام ایک آزاد دولت کے ڈھونگ کی سرگرم مہم کا سرپرست بنا ہوا ہے۔[1] پختون یا پشتون کے سلسلے میں درشت اور نرم لہجے شمال اور جنوب میں مستعمل ہیں۔ اس سے مراد قبائلی گروہ کا وہ آدمی ہوتا ہے جو پشتو بولتا ہے خواہ وہ کہیں رہتا ہو۔ قبائلی بعض اوقات اپنے آپ کو افغان کہتے ہیں اور وہ پاکستانی اور افغانی قومیت میں تمیز روا نہیں رکھتے۔ سیاسی لحاظ سے افغان کا مطلب ہے افغانستان کی قوم کا فرد' اور یہ نام غیر پختون کے لیے بھی اسی طرح استعمال ہو سکتا ہے جس طرح افغانستان کے غیر افغان باشندوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حال میں بعض اہل قلم نے الگ الگ علاقوں کے باشندوں کے لیے الگ الگ نام اختیار کیے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے منظم اضلاع کے قبائلیوں کو پٹھان کہا اور قبائلی علاقے کے باشندوں کو پختون اور افغانستان کے باشندوں کو افغان سے تعبیر کیا۔ یہ طریقہ اگر چہ صحیح نہیں لیکن اس میں سہولت ضرور ہے اور پیش نظر تحریر میں اسی پر عمل ہوگا۔

بحیثیت مجموعی کوئی ایک کروڑ پشتو بولنے والے ایسے ہیں جو اصلاً ایک ہی قبیلے کے ہیں' اگر چہ اس باب میں اندازے مختلف ہیں۔[2] یہ تین بڑے گروہوں میں منقسم ہیں۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے ان میں ممتاز ترین درجہ دُرانیوں کو حاصل ہے۔ افغانستان کے حکمران اسی قبیلے میں سے ہیں۔ ان کا وطن افغانستان کے اندر قندھار کے شمال مغرب میں ہے۔ ان پر ایرانیوں کا بھی خاصا اثر پڑا ہے۔ غلزئی درانیوں کے مشرق میں پاکستان کی بلوچستانی سرحد کے پار رہتے ہیں۔ یہ بھی قریباً سب کے سب افغانستان کے اندر ہیں اگر چہ ان کا خاصا بڑا حصہ سال بہ سال خانہ بدوشوں کی حیثیت میں پاکستان آ جاتا ہے۔ یہ پوندے کہلاتے ہیں۔ تیسرا گروہ ان حقیقی پختونوں کا ہے جو پاکستان اور افغانستان کی سرحد کے

---

[1] الحمد اللہ اب دونوں اسلامی مملکتوں کے تعلقات بہت خوشگوار ہو چکے ہیں۔ (مترجم)

[2] آفریدی اعداد ہربرٹ پینزل نے اپنی کتاب ''پشتو کی گرامر'' میں پیش کیے جو واشنگٹن میں 1955ء میں چھپی۔ اس میں ایک کروڑ تین لاکھ کا عدد سرکاری رپورٹوں پر مبنی ہے لیکن حکومت افغانستان کا یہ دعویٰ مشتبہ ہے کہ افغانستان میں پچھتر لاکھ پشتو بولنے والے آدمی موجود ہیں۔ اس میں بہت مبالغہ نظر آتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دونوں جانب درانیوں اور غلزئیوں کے شمال اور مشرق میں رہتے ہیں مگر خانہ بدوش نہیں۔

اگرچہ حقیقی پختون اسی جدامجد کی اولاد ہیں جس سے دُرانی اور غلزئی چلے' تاہم پختونوں کا تعلق مندرجہ بالا گروہوں سے بہت کم ہے۔ ان میں سے بعض مثلاً جاجی' منگل اور جدون زیادہ تر افغانستان میں رہتے ہیں۔ دوسرے مثلاً یوسف زئی اور خٹک پاکستان کے منظم اضلاع میں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ سرحدی پہاڑیوں میں بڑے بڑے آزاد قبیلے رہتے ہیں یعنی محسود وزیری' آفریدی اور مہمند وغیرہ۔ ان پر بیرونی اثر سب سے کم پڑا۔ مقامی طور پر ان کے وطن کو یاغستان کہتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگوں کی سرزمین جن پر کوئی حاکم نہیں۔ بعض اوقات اس کا ترجمہ سرکشوں کی زمین کیا جاتا ہے جو زیادہ صحیح ہے۔

قبائلی تنظیم نسب نامے پر مبنی ہے' جو بڑا پرپیچ ہے بعض حالتوں میں اسے افسانوی سمجھنا چاہیے اور خاندانوں کا شجرہ آدم تک پہنچا دیا جاتا ہے۔[1] ہر بڑے قبیلے کی مختلف شاخیں ہوتی ہیں جو خیل کہلاتی ہیں۔ خیل کسی زمانے میں توسیع یافتہ خاندان تھے لیکن اب اس اصطلاح کو خاص سربراہوں کے ساتھ مشترکہ وفاداری اور مشترکہ مسلک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ خونی روابط کے لیے۔ مثلاً آفریدیوں کے مختلف خیل ہیں۔ کوکی خیل' ملک دین خیل' زکا خیل' آدم خیل' قمر خیل' آقا خیل' قبز خیل' اور سیپاہ[2] چونکہ ان ناموں کے خیل دوسرے قبیلوں میں بھی موجود ہیں اور بعض ایسے خیل ہیں جنہیں کسی بڑے قبیلے سے خونی رشتہ نہیں' لہٰذا ہر خیل کا نام لیتے وقت اس کے مقام یا پوزیشن کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ تاکہ اشتباہ پیدا نہ ہو۔

خیل سے چھوٹا گروہ کہول کہلاتا ہے (بعض اوقات اسے کور کہا جاتا ہے) یعنی خاندان۔ خاندانی رشتوں کی اہمیت صرف اس امر سے واضح ہوسکتی ہے کہ پشتو میں قرابت

---

1. مقامی افسانہ یہ ہے کہ افغان کا مورث اعلیٰ افغانہ بن جرنیہ بن طالوت تھا جس نے ہیکل سلیمانی بنایا۔

2. یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ آیا آفریدی پختون ہیں؟ بہت سے انگریز مصنفوں کو اصرار ہے کہ وہ وادئ پشاور میں بسنے والے ابتدائی بدھ باشندوں کی اولاد ہیں۔ افغان قبائل مشرق کی طرف حرکت میں آئے تو یہ لوگ مغلوب ہوگئے (دیکھیے رجولے کی کتاب ''پٹھان'' اور ڈیویز کی کتاب ''مسئلہ صوبہ سرحد'') تاہم اب وہ پختون ثقافت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

داری کے لیے ستر مختلف اصطلاحیں رائج ہیں' یہاں تک کہ بیٹی کے شوہر کے باپ کے بھائی کے لیے بھی الگ نام ہے۔ ہر گروہ کے سردار کو ملک کہا جاتا ہے اور ملکوں میں سے زیادہ اہم شخص کو خیل یا قبیلے کا ملک سمجھا جاتا ہے۔

قبائل کے درمیان کوئی خاص مذہبی تقسیم نہیں اس لیے کہ سب کے سب سنی ہیں۔ صرف چند چھوٹے چھوٹے گروہ شیعہ ہیں۔ مثلاً توری' قبائل میں بعض اور تقسیمات بھی ہیں جن کا آغاز ضلع کوہاٹ کے بنگشن قبیلے سے ہوا۔ پھر یہ تقسیمات آفریدیوں اور مہمندوں تک پہنچ گئیں' مثلاً گرا اور سارمل جو حامیوں اور توریوں میں رائج ہیں' دوسرے مقامات پر سپین اور تورکی اصطلاحات رائج ہیں۔ ان کا دوسری قبائلی گروہ بندیوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس بارے میں ایک مسلک یا مقصد پیش کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے ان تقسیمات کا تعلق ایک حد تک سیاسی پارٹیوں سے ہو۔ اب یہ اس غرض سے استعمال ہوتی ہیں کہ کسی گروہ کے آدمی کو مخالف ہمسایہ گروہ سے ممتاز رکھنے میں سہولت رہے' جس کے ساتھ اسے مذہبی اور خونی تعلق ہو۔ اگرچہ عام گروہ بندی موروثی ہوتی ہے' لیکن کبھی کبھی قبیلوں' خیلوں بلکہ کوہلوں میں بھی تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ مثلاً آفریدیوں میں سے قبنر خیل' کوکی خیل اور آدم خیل ''گر ہیں۔'' اُن کے برعکس ملک دین خیل''' زکا خیل' آقا خیل اور سیپا سامل ہیں'' یہ تفریقات گزشتہ چند سال میں اپنی اہمیت بڑی حد تک کھو چکی ہیں لیکن قبائل کے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو پھر نمودار ہو جاتی ہیں۔ دیہاتی زندگی میں وہ چھوٹی متفرق مقامی گروہ بندیاں خاص اہم وظیفہ ادا کرتی ہیں جنہیں گونڈی کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً پرانے جھگڑوں پر مبنی ہوتی ہیں اور پٹھانوں کے درمیان جھگڑے کے تین بڑے سبب ہیں۔ زر' زن اور زمین۔

مجلسی تنظیم:

قبائلی معاشرہ فرد سے شروع ہوتا ہے اور فرد ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ فرد کو قبیلے میں ''دفتری'' ہونے کے لحاظ سے ایک خاص درجہ حاصل ہے' یعنی وہ عملاً یا نظراً قبیلے کی زمینوں میں حصے دار ہے اور قبائلی جرگوں میں اسے رائے دینے کا حق ہے۔ ہر گروہ کی اہمیت اہل قبیلہ کی اس تعداد پر مبنی ہے جس سے وہ مرکب ہے۔ باہم وفاداری عموماً خونی رشتوں پر مبنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی قبیلوں یا خیلوں میں بھی تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات افراد بھی خاندان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نوجوان لازماً اپنے باپ یا دادا کو سرگروہ نہ مانے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی ہم نسب رشتہ دار یا خیل کے کسی فرد کو سربراہ مان لے' جو جوانمردی یا قابلیت میں زیادہ شہرت کا مالک ہو۔ وفاداری کا مرکز ملک ہوتا ہے۔ (نظم اضلاع میں خاں) اور یہ منصب وہ عوامی معاملات میں اپنے رضا کار پیروؤں کی صحیح قیادت سے حاصل کرتا ہے خواہ یہ قیادت حالتِ امن میں کی جائے یا حالتِ جنگ میں۔ وفاداری کے قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار ملک کی شخصیت یا اس کے کارناموں پر موقوف ہے' اگرچہ دولت' خاندانی اثر یا سرکاری حمایت کو بھی ایک حد تک باعثِ کشش سمجھا جاتا ہے۔

غیر پختون لوگ' جن کا انحصار پختونوں پر ہے' غلام یا ہمسایہ کہلاتے ہیں اور انہیں شرافت کا اونچا درجہ نہیں دیا جاتا۔ زمانۂ حال تک یہ لوگ یعنی گوجر' اعوان یا مختلف نیچ ذات کے غیر مسلم اپنی زندگیوں اور کام کاج کو کسی پختون کے ساتھ ملازم کی حیثیت میں وابستہ ہو جانے پر موقوف سمجھتے تھے۔ اسی حیثیت میں وہ لوگ پختونوں کی عام جائیداد کی طرح محفوظ رہ سکتے تھے اور حفاظت کا انحصار قوت کے سوا اور کسی چیز پر نہ تھا۔

حجرے پختون کے کردار کی زیادہ مجلسی حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ یہ تقریباً ہر گاؤں میں واقع ہیں اور نشو و ارتقاء کا ایک ذریعہ سمجھتے جاتے ہیں۔ مہمندوں کے دیہات میں حجرے بہت کم پائے جاتے ہیں' لہٰذا دوسرے قبیلے انہیں اس بنا پر اچھا نہیں سمجھتے۔ انہیں مردانہ کلب یا مجلسی مرکز سمجھنا چاہیے جہاں قبیلے کے غیر شادی شدہ جوان سوتے ہیں۔ جو لوگ ملنے کے لیے آتے ہیں وہ انہی میں ٹھہرتے ہیں اور یہ گروہ کے فکری و عملی مرکز ہوتے ہیں۔ وہاں گپ شپ بھی ہوتی ہے اور عام انتظامی احکام بھی وہیں سے جاری ہوتے ہیں۔ اب بہت سے حجروں میں ریڈیو لگ گئے اور قبائلی باہم بات چیت کرتے ہیں تو اس سلسلے میں انجمن اقوام متحدہ اور ''سرد جنگ'' کے موضوع بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔

مُلّا:

اگرچہ قبائلی لوگ اسلامی احکام کے بڑے پابند اور مذہب کی حفاظت میں گرمجوش تے ہیں لیکن بہت سے قبائلیوں کو مذہب کے متعلق زیادہ معلومات نہیں۔ یہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ ہے کہ مُلاؤں' پیروں اور سیدوں کے زیر اثر چلے جاتے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں ان لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔ تاہم یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ملا کو صرف منصب کے لحاظ سے قبیلے کے معاشرے میں اونچی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا درجہ اسلام اور پختون معاشرے کے متعلق انفرادی نقطۂ نگاہ کی بنا پر متعین ہوتا ہے۔ ملا زبردست حیثیت اسی صورت میں حاصل کرتا ہے جب مذہبی اخلاص کے ساتھ میدان جنگ میں جوانمردی دکھائے اور کامیابی حاصل کرے۔ وہ مذہب اور جنگ کو ملا کر جہاد[1] کی شکل دے دیتا ہے اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے قبائل کو ابھار کر انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے بھیج دیا۔ مثلاً ملا پوندا' حاجی ترنگزی اور فقیر ایپی۔ پاکستان کی اسلامی سلطنت کے ظہور پر انگریزی حکومت رخصت ہوگئی۔ ساتھ ہی کفر سے مقابلہ بھی نہ رہا' اس وجہ سے جہاد کا جوش بھی ناپید ہوگیا۔ البتہ فقیر ایپی اس وقت تک اپنے پہاڑی حصار میں مقابلے کے لیے موجود ہے[2] جو وزیرستان کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کا اثر تیزی سے گھٹ رہا ہے اور یہ جو کچھ بھی ہے' مذہبی تقدس کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ اسے قانون کی حفاظت سے بری کر دیا گیا ہے۔

جرگہ:

جرگے کی حیثیت ایتھنز کی جمہوریت سے ملتی ہوئی ہے۔ یہ ابتدا سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے قبائلی علاقے میں انفرادی اور اجتماعی کاروبار انجام پاتا ہے' قبائلی معاشرے کی خاص چیز ہے اور اس جمہوریت کو انارکی کی شکل اختیار کرنے سے بچاتی ہے جو کبھی نمائندہ نہیں بنی۔ اگر ضرورت پیش آ جائے تو جرگہ خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے' لیکن عام حالات میں اس کی حیثیت سراسر غیر رسمی ہوتی ہے۔ تین یا چار نامور آدمی اس کے رکن ہوتے ہیں جنھیں پولیٹیکل ایجنٹ کسی ایسے مقدمے کے لیے منتخب کرتا ہے جو قبائل میں کسی ایک فرد اور مسلح اضلاع کے ایک باشندے کے درمیان ہو لیکن اس کی تعداد

---

1. یہاں جہاد شریعتِ اسلام کی اصطلاح میں استعمال نہیں کیا گیا' مقامی طور پر اسے ہر غیر مسلم یا بدعقیدہ مسلم کے خلاف عملی تشدد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مختلف اسلامی احکام کی تعبیر قبائلی علاقے میں کس بے تکلفی اور آزادی سے کی جا رہی ہے۔

2. وہ اب فوت ہو چکا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہزاروں مسلح آدمیوں تک پہنچ سکتی ہے جو افغانستان' پاکستان اور انجمن اقوام متحدہ سے مطالبہ کررہے ہوں کہ ان کی فلاں قرارداد تسلیم کرلی جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چند اکابر جمع ہوکر نارضامند باپ کو متنبہ کریں کہ بیٹے کی دلہن کے لیے جو قیمت مقرر ہوئی تھی ادا کر دی جائے یا ایک دو درجن قبائلی وفد کی صورت میں پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس پہنچیں اور اسے یقین دلادیں کہ اگر ہمارے بلند ہمت نوجوانوں کو مقامی ٹیلی فون کے تار کاٹنے سے باز رکھنا ہے تو لازم ہے کہ وظیفوں کا کوئی بندوبست کیا جائے' تاکہ انہیں پاکستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لیے بھیج دیا جائے۔ بعض قبیلوں میں صرف ملک اور سپینز ریو ''یعنی'' ''سفید ریش'' جرگے میں شریک ہوتے ہیں۔ بعض میں تمام بالغ مرد جمع ہوجاتے ہیں۔ کوئی بھی صورت ہو نہ انتخابات ہوتے ہیں اور نہ کوئی ایسی کمیٹی ہوتی ہے جو مختلف لوگوں کے کاغذوں کی پڑتال کرے۔ ہر آدمی کی شنوائی اس امر پر موقوف ہوتی ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے' سننے والوں میں اسے کتنی اہمیت حاصل ہے اور کتنی بندوقیں اس کی حمایت میں اُٹھ سکتی ہیں۔[1] جرگہ وزیرستان میں کچی سڑک کے کنارے ایک درخت کے سائے میں بھی منعقد ہوسکتا ہے اور پشاور میں گورنمنٹ ہاؤس کے وسیع سبزہ زار پر بھی۔

جرگے کے تین وظیفے ہوتے ہیں۔ اول یہ ان مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے جو ضوابط سرحد کے مطابق مروجہ قانون کے ماتحت طے نہیں کیے جاسکتے اور جرگے کے فیصلے کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ وسیع معنی میں یہ جماعتی سطح پر زندگی کے اندر باقاعدگی پیدا کرتا ہے' یعنی جب قبائلی معاشرے میں کسی جماعتی کام کی ضرورت پیش آتی ہے' مثلاً نئی مسجد کے لیے جگہ کی تجویز یا فیصلہ کہ ہمسایہ قبیلے کے ساتھ خون کے متعلق جو جھگڑا چلا آتا ہے اسے طے کیا جائے یا طے کرانے کا ذمہ اٹھایا جائے۔ سب سے آخر میں یہ کہ جرگہ ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے سے قبیلے کی رائیں یا فیصلے حکومت تک پہنچائے جاتے ہیں اور حکومت

---

[1] قریباً ایک سو سال ہوئے ابتدائی دور کی ایک انگریزی کتاب میں بتایا گیا تھا کہ رئیس ایک قبیلے یا خیل یا خاندان کا نمائندہ ہوتا ہے لیکن وہ آزادانہ کوئی کام نہیں کرسکتا اور جرگے میں کچھ کہنے سے پہلے لازم ہے کہ زیرِ غور معاملے کے متعلق ان لوگوں کی رائے لے لے جن کا وہ نمائندہ ہے۔ یو-آر جیمز کی رپورٹ ضلع پشاور کے بندوبست کے متعلق 1865ء انڈیا آفس لائبریری لندن۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے فیصلے قبیلے کو سنا دیئے جاتے ہیں۔ ووٹ کا موقع شاذ ہی آتا ہے۔ اہل جرگہ کی رائے عموماً ووٹ کے بغیر ہی واضح ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس کے تمام رُکن فیصلے کے وقت بندوقیں پاس رکھتے ہیں' اس لیے اس کے اقتدار کا احترام کیا جاتا ہے۔ اسے جرگے کے طور پر تقدس کا جو درجہ حاصل ہے' وہ اسی سے ظاہر ہے کہ کبھی اس میں جنگ کی نوبت نہیں آتی۔ معلوم ہے کہ پختون بڑے تیز مزاج اور سیماب وش ہوتے ہیں اور ان کے پاس ہتھیار بکثرت ہیں' بہ ایں ہمہ جرگہ اس امر کا ثبوت ہے کہ روایت کو رجحان پر ترجیح دی جاتی ہے جو شخص جرگے کے فیصلے کی خلاف ورزی کرے یا اسے نہ مانے' اسے گھر جلانے اور جائیداد تباہ کرنے کی سزا دی جا سکتی ہے۔[1]

لشکر:

لشکر اس مجموعۂ افراد کو کہتے ہیں جو جنگ کی غرض سے جمع ہو جائے۔ زندگی کے متعلق پختونوں کا یہی نقطۂ نگاہ ہے۔ لفظ لشکر پشتو زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جو عام ہیں۔ جرگے کی طرح لشکر کے افراد کی تعداد بھی مقرر نہیں۔ یہ اصطلاح ان دس بارہ آدمیوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جو کسی پاس کے گاؤں سے بھیڑ یا دنبہ چرانے کے لیے جائیں اور پچاس ہزار کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جو 48-1947ء میں کشمیر گئے۔

کشمیر کا لشکر یا جہاد' جیسا کہ اسے کہا جاتا ہے' قبائلی قوت کے یقین افروز مظاہرے کا ایک ثبوت ہے۔ اس میں پختون کردار کے تمام خصائص دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس میں افغانستان کے اندر سے بھی لوگ حصہ لینے کے لیے آئے اور منظّم اضلاع کے پُرامن کاشتکار بھی شریک ہوئے' لیکن زیادہ تر لوگ قبائلی علاقے کے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ باہر سے بھی کچھ حوصلہ افزائی ہوئی ہے' لیکن اصل تحریک خود قبائل کے اندر پیدا ہوئی۔ انہوں نے لمبے فاصلے طے کیے' کشمیر کا دارالحکومت سری نگر ہے۔ یہ مقام قلعہ جمرود ہے' جو درۂ خیبر کے دہانے پر واقع ہے' اڑھائی سو میل دور ہے۔ رزمک وزیرستان کے

---

[1] پختون کا گھر ایک حلقہ ہوتا ہے۔ دیواریں چوڑی اور مضبوط' دروازے لوہے کے اور جابجا برج۔ اس کی عزت اور طاقت اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت کس حد تک کر سکتا ہے۔ انگریزی اقتدار کے زمانے میں بعض مہمیں اس غرض سے بھیجی جاتی تھیں کہ سرکش ملک کا گھر تباہ کر دیں۔ اس طرح وہ اپنے ہمعصروں اور ساتھیوں کی نظروں میں گر جاتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قلب میں ہے۔ وہاں سے سری نگر کا فاصلہ دگنا یعنی پانچ سو میل ہوگا۔ لداخ اور سکر دو بلند ترین پہاڑوں میں (سری نگر سے) ایک سو پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ 48-1947ء کے موسم سرما اور موسم بہار میں پختون کے جنگی نعرے ان تمام مقامات پر سنے گئے۔ کشمیر کے لشکر کو اب بھی قبائلی تصورات میں اولین حیثیت حاصل ہے۔ ایک ملک نے 1954ء میں بیان کیا۔ ''یہ میری زندگی کا بہترین وقت تھا۔ ہم گاتے ہوئے گئے' بندوقیں ہمارے کندھوں پر تھیں' کوئی چیز ہمارے مقابلے پر ٹھہر نہ سکی۔''

پختون ولی اور رواج:

وہ وسیع فلسفیانہ تصورات جن پر بہت سے قانونی نظام مبنی ہیں پختون کے اُفق سے بہت دور ہیں۔ عام انتظامی قانون' جس میں ہزاروں امور کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو' پختون کے نزدیک قابل نفرت ہے۔ وہ اپنی روایت اور عزت کے لیے پُر جوش اور سرگرم جذبے کے ماتحت سب کچھ کرتا ہے۔ اس قسم کی تمام چیزیں پختون ولی میں شامل ہیں جسے بعض اوقات ''ننگ پختنہ'' یا پختون کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ یہ نظام نامہ' روایت' نمونوں اور رواج پر مبنی ہے۔ اس کے بنیادی اصول یہ ہیں:

1- بدلہ' یعنی نتائج سے بالکل بے پرواہو کر انتقام لینا۔

2- ملمستیا' یعنی مہمان نوازی اور ہر مہمان کی حفاظت۔

3- ناوتی' یعنی ہر مفرور کو پناہ دینا اور صلح کی پیش کش ہو تو اسے قبول کرنا۔

ساتھ ہی بدرقہ کا انتظام یعنی ہر اجنبی یا دشمن کے لیے بخیریت گزر جانے کا بندوبست کر دینا۔

قانون میں سب سے آخری منظور شدہ دفعہ کو فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے۔ پختون ولی کے اصول میں اگر اختلاف پیدا ہو جائے تو اس ذمہ داری کو ترجیح دی جائے گی جو سب سے آخر میں اختیار کی جائے۔ البتہ انتقام لینا ہو تو بڑی سرگرمی سے لیا جاتا ہے اور اس کے لیے ''ملمستیا'' اور ناوتی بھی عارضی طور پر معطل کر دیئے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] پختون ولی کے واضح افسانوی بیان کے لیے ملاحظہ ہو ایشیائی افسانوں کے سلسلے میں گوبی نو کی کتاب ''قندھار کے عشاق۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بلاشبہ پختون ولی قبائلی معاشرے میں ایک حد تک نظم و جمعیت کا بندوبست ہے۔ مگر بعض اوقات اس سے خونی جھگڑے بھی پیدا ہوئے جن کے نتیجے میں اب تک قبائلی علاقے کے اندر خاندان ملیامیٹ کیے جا رہے ہیں۔ خون کا بدلہ پشت پہ پشت خاندان کے مردوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ 1918ء میں ایک انگریز نے خونی انتقام کے بڑے بڑے اسباب یوں بیان کیے تھے۔

1- عورتوں سے ناجائز تعلقات۔
2- کسی خاندان کے فرد یا اس کے ملازموں میں سے کسی کا قتل۔
3- بدرقہ کی بے حرمتی۔
4- میراث یا قرض کے متعلق جھگڑے۔
5- پانی یا زمین کے متعلق کشمکش۔

معاصر دستاویزیں دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا فہرست اب تک درست ہے۔

جرگے بعض خاندانوں کے مشورے کے مطابق' جو مقامی عادت و رسوم کے محافظ ہوتے ہیں' پختون ولی کی تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ ایسے خاندانوں کو سرشتہ کہا جاتا ہے۔ افراد کے سلسلے میں بھی پختون ولی ہی استعمال ہوتا ہے اور رائے عامہ کا بے پناہ وزن اس کا محافظ ہے۔ قبائلی علاقے میں قتل کی سزا موت ہے۔ البتہ اگر متعلقہ خاندانوں کے درمیان خون کے بدلے کا معاملہ موجود ہو یا خواہ مخواہ اشتعال دلایا جائے تو موت کی سزا نہیں دی جاتی۔ اگر مقتول کے رشتے دار بہرصورت جرگے پر راضی ہو جائیں تو قاتل کو موت کی سزا دینے کے بجائے خون' بہا دلوا دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ بدلے کے واجبات ختم ہو گئے۔ اگر مقتول یا قاتل کا رشتے دار ہو تو موت کی سزا تلوار۔ کے ذریعے تجویز کی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص قبیلے کی دعوت پر جنگ کے لیے نہ نکلے تو اسے جرمانے کے طور پر جائیداد کی ضبطی یا گھر جلانے کی سزا دی جاتی ہے۔ زنا کی حالت میں فریقین کو موت کی سزا ملتی ہے۔ عورت پہلے ماری جاتی ہے۔ اگر عورت کو زندہ رہنے کی اجازت مل جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مرد مجرم نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

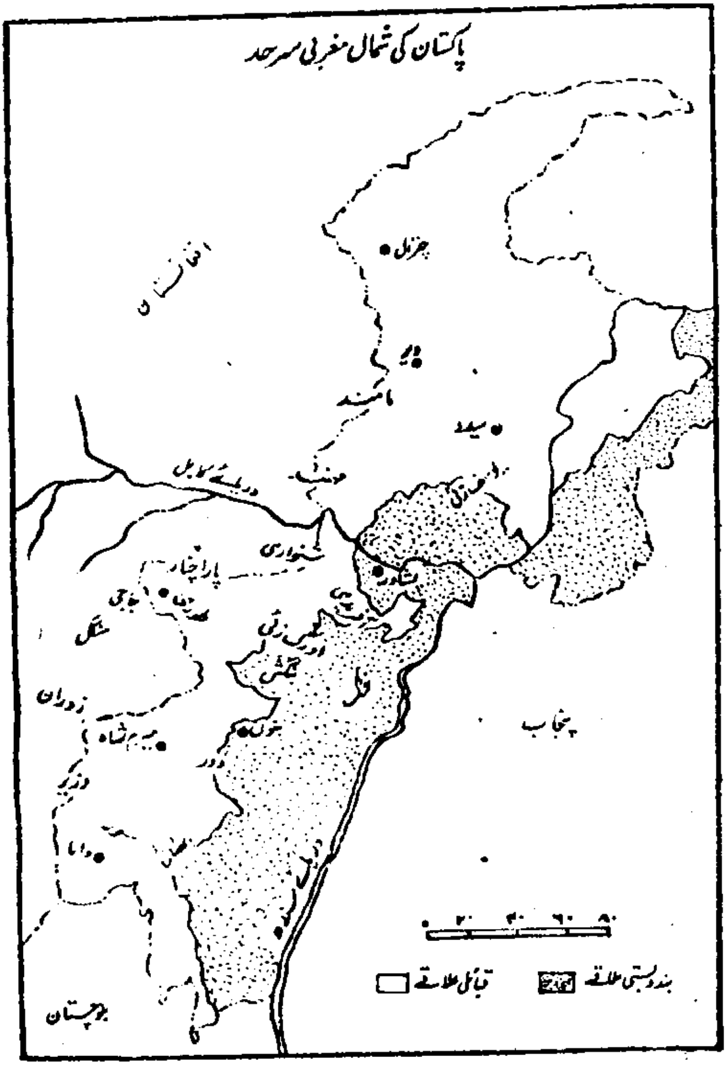

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبائلی علاقے میں اب بھی پختون ولی اور اس کے نفاذ کے سادہ جمہوری طریقوں کو سب سے بڑی قوت سمجھا جاتا ہے۔ اپنے افغانستانی بھائیوں یا پاکستان کے منظم اضلاع کے باشندوں کے برعکس پہاڑی پختون اپنے قانون کے سوا کسی اور کے قانون کو نہیں مانتے۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ان کے پاس قوت واقتدار ہے' اس وجہ سے قبائلی معاشرہ محفوظ ہے اور قبائلی لوگ ان ثقافتی یا نفسیاتی کشیدگیوں سے بالکل ناآشنا ہیں۔ جو ''مہذب'' پٹھانوں کے لیے مصیبت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ہاں انتظام کے تقاضے ایک مہذب قانون کے ماتحت عموماً پورے نہیں ہوتے۔ بلاشبہ آگے چل کر اقتصادی مجلسی اور سیاسی دباؤ اثر انداز ہوگا' لیکن فی الحال پختون اپنے آباء واجداد کے قانون کے ماتحت رہتا ہے اور باقی دنیا سے اسے بہت کم سروکار ہے۔ رواج یا رواج عام وہ پُر پیچ نظام عمل ہے جو پختون ولی نیز اسلامی اور برطانوی قانون کا مجموعہ ہے۔ یہ ہر قبیلے میں مختلف ہے۔ انگریزوں نے اسے منظم کرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی' مسلم پختون کا جب پاک وہند میں رہنے والے لوگوں سے تعلق پیدا ہوا تو انہوں نے انگریزوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی رواج کے پابند نہیں بلکہ شریعت یا عالم گیر اسلامی قانون کے پابند ہیں لیکن بعض اصول اب تک رواج پر مبنی ہیں اور ان کی ذریعے سے شادی یا میراث کے ضوابط میں ردو بدل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلامی قانون کے مطابق میراث میں تمام بیٹوں کا حصہ یکساں ہے' اس میں یہ ترمیم کر لی گئی ہے کہ سب سے بڑے بیٹے کو باپ کی جگہ اجتماعی ذمہ داری کا منصب مل جاتا ہے اور اسے کچھ زیادہ حصہ دے دیا جاتا ہے۔ مستقل طور پر نہیں تو کم از کم عارضی طور پر ہی سہی اور بیٹی میراث میں اپنے حصے کو کسی دوسرے کے حوالے نہیں کر سکتی۔

عورتیں:

پختون عورتیں اپنے گھروں سے باہر کسی مجلسی معاملے میں کوئی حصہ نہیں لیتیں۔ البتہ وہ ان گھروں میں وقتاً فوقتاً چلی جاتی ہیں جن کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہوں یا پھر مذہبی مقاصد کے لیے باہر جاتی ہیں۔ قبائلی علاقے میں غلاموں اور پوندوں کے سوا تقریباً سب عورتیں پردہ کرتی ہیں یا مردوں سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ بااثر نہیں ہوتیں۔ اپنی حدود میں وہ عادتاً بہت سمجھدار اور زبردست ہوتی ہیں۔ خانہ داری کے بہت سے معاملات انہی کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ وہ شادیوں اور خاندانوں کے درمیان رشتوں کے انتظام میں بڑا حصہ لیتی ہیں۔ ملمستیا یعنی مہمانداری کے لیے عملی وسیلے وہی مہیا کرتی ہیں جو پختون ولی کا نہایت اہم حصہ ہے۔ اس ضابطے کی پابندی میں وہ مردوں سے قطعاً پیچھے نہیں رہتیں اور جو مرد بدلے کے واجبات پورے کرنے میں کاہل یا نارضامند ہوں انہیں مجبور کرنے کا نہایت اہم ذریعہ عورتیں ہیں۔

پہلے قبیلوں میں یہ رواج تھا کہ دلہن کے لیے روپیہ دیتے تھے اب پاکستانی اور اسلامی رسوم شادی رواج پا رہے ہیں' یعنی شوہر بیوی کو حق مہر کے طور پر روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے اور جہیز لیتا ہے' تاہم غریب طبقوں کی لڑکیاں اب تک باپ کو روپیہ یا جنس دے کر خریدی جاتی ہیں۔[1] منظم اضلاع میں جو خوانین رہتے ہیں نیز کوہستانی علاقے کے بعض زیادہ طاقتور ملکوں کے انتہائی خاندانی غرور کا نتیجہ یہ نکلا کہ شوہر رسم کے طور پر بہت بڑی رقم حق مہر کے طور پر منظور کرتا ہے اور اس کا ادا کرنا اسی وقت ضروری ہوتا ہے جب طلاق کی نوبت آئے۔ اب یہ رواج بڑھ رہا ہے کہ برائے نام سی رقم مقرر کر لی جاتی ہے جسے ہر شخص بہ آسانی ادا کر سکتا ہے۔ یہ اس امر کا نشان ہوتا ہے کہ معزز خاندانوں میں کسی مالی تحفظ کی ضرورت نہیں اس لیے کہ وہ طلاق کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی تہ میں یہ حقیقت بھی ہے کہ تمام فریق جانتے ہیں کہ طلاق کی صورت میں طلاق دینے والا شوہر مطلقہ بیوی کے رشتہ داروں کے ہاتھ سے مارا جائے گا اور معاملہ محض مالی سزا تک محدود نہ رہے گا۔

ویش:

پختونوں میں زمین کے متعلق ایک عجیب دستور یہ ہے کہ قبیلے کے رکن وقتاً فوقتاً زمینوں کا قبضہ بدلتے رہتے ہیں۔ اسے ویش کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں خیال یہ تھا کہ ہر رکن کو بہترین زمین استعمال کرنے کا موقع مل جانا چاہیے۔ اگرچہ تھوڑی دیر ہی کیلئے ہو' اور ایسی

---

[1] یہ مصنف کی غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔ جو رقم شادی کے موقعے پر دلہن کے لیے دی جاتی تھی' ہمارے اندازے کے مطابق وہ مہر ہی کی رقم تھی۔ مہر پیشگی ادا کیا جائے یا ادا کرنے کا وعدہ کیا جائے' ایک ہی بات ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت پیدا نہ ہونی چاہیے کہ اقتصادی قوت حاصل کر کے کوئی فرد سربراہ کا منصب سنبھال لے۔ یہ امر موجبِ حیرت ہے کہ تبادلہ عموماً خونریزی یا تشدد کے بغیر ہی کر لیا جاتا تھا' لیکن اجتماعی زندگی کے ابتدائی مرحلوں میں بھی یہ امر ممکن العمل ثابت نہ ہوا۔ اب یہ رسم قریباً ہر جگہ ختم ہو چکی ہے۔ شاید بونیر کے بعض دور افتادہ حصوں میں اب تک موجود ہو۔

مذہب:

پختونوں کی اکثریت سنی مسلمان ہے اور وہ سب حنفی فقہ کے پابند ہیں۔ کرم کے توری جن کی شکلیں منگولوں کی سی ہیں' ایک نمایاں استثناء ہیں' جو شیعہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہمسایوں کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھاتے رہے ہیں۔

یہی قبیلے تھے جن میں سے سلطان محمود غزنوی نے فوجیں بھرتی کیں اور گیارہویں صدی میں ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ یہ لوگ اس وقت سے مذہب کے پکے پابند رہے ہے۔ البتہ دو موقعے ایسے آئے جن میں انہیں انحراف کا ملزم ٹھہرایا گیا۔ پہلا بایزید کا دور جو ''پیر روشن'' کے نام سے مشہور ہے۔ وہ صوفی مزاج آدمی تھا۔ اس نے بہت سے پیرو جمع کر لیے تھے اور سولہویں صدی میں متعدد قبائلی جنگوں کا سبب بنا۔ دوسرا موقع وہ ہے جب پختونوں نے سید احمد کی بیعت کی' وہ وہابی مسلمانوں کے گروہ کے قائد تھے۔ وہ انیسویں صدی میں بہ مقام ستھانہ آباد ہو گئے تھے جو کوہِ سیاہ کے حلقے میں واقع ہے۔ وہ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے وعظ کہتے تھے' اگرچہ ابتداء میں لوگ اس وجہ سے سید صاحب کی طرف کھچ آئے کہ وہ دو کافر طاقتوں کے خلاف جہاد کے لیے تیار تھے۔ نیز ان میں تصوف کے وہ طور طریقے موجود تھے جو مسلمانانِ ہند میں رائج تھے' لیکن جب اس وہابی نما مذہبی مصلح نے مجلسی رسوم میں مداخلت کی اور پٹھانوں کو منظم مذہبی جماعت بنانا چاہا تو قبائل مخالف بن گئے۔ انگریزوں اور سکھوں کے بجائے یہ قبائل سید صاحب کی تحریک کے ناکام ہونے کے زیادہ ذمہ دار تھے۔[1]

---

[1] یہاں سلطان محمود غزنوی کے سترہ حملوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کوئی تاریخی حقیقت نہیں بلکہ بڑی حد تک افسانہ ہے' اس لیے کہ ابتدائی حملے سلطان نے نہیں بلکہ راجہ پال نے کیے تھے۔ پھر وہ راجے مہاراجے سلطان کے خلاف...... (باقی اگلے صفحہ پر)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فنون:

پختون ہاتھوں کی ہنرمندیاں زیادہ تر ہتھیار بنانے اور سجانے پر صرف ہوتی ہیں۔اسلامی روایات کی پابندی میں وہاں تصویری فنون شاذ ہی نظر آئیں گے۔بدھوں کی گندھارا ثقافت کے بہت سے باقیات سوات نیز خیبر ایجنسی کے مختلف حصوں میں موجود تھے، مگر بت شکن قبائل نے انہیں بے دردی سے تباہ کر دیا۔موسیقی زیادہ ترقی نہیں کر سکی۔عام آلاتِ موسیقی یہ ہیں ڈھول، سادہ سی بانسریاں اور بین سے ملتا ہوا ایک ساز بعض عوامی گیت بھی رائج ہیں، جن میں سب سے مشہور ''زخمی دل'' ہے جو کابل کا ایک عشقیہ گیت ہے۔اسے تھوڑا سا تبدیل کر کے پٹھان فوجیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ناچوں میں سے زیادہ ہر دلعزیز وہ ہے جسے خٹک ناچ کہتے ہیں۔اگرچہ اس کا نام ایک خاص قبیلے سے وابستہ ہے مگر زیادہ تر قبیلوں میں یہی ناچ رائج ہے۔اس کی بہت سی شکلیں ہیں، لیکن سب میں بہت زیادہ آدمی شریک ہوتے ہیں اور ناچ میں صرف مرد حصہ لیتے ہیں۔خٹک ناچ پٹھان فوجیوں کی تفریحات میں بھی عام پر دیکھا جاتا ہے اور

(گزشتہ سے پیوستہ) ...... جنگ پر آمادہ ہوئے' ان کے خلاف تادیبی کارروائیاں یقیناً عمل میں آئیں۔اسی طرح بایزید یا پیر روشن یا پیر تاریک کے متعلق بیان حد درجہ مہمل ہے۔سب سے آخر میں سید احمد بریلوی آتے ہیں ان کی تحریک پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں' لیکن یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو نام نہاد وہابیت سے کوئی تعلق نہ تھا وہ مسلمانوں کو صحیح اسلامی عقائد' اعمال اور کردار کا نمونہ بنانا چاہتے تھے' لیکن جس حد تک فقہی امور کا تعلق ہے' وہ آخر تک حنفی فقہ کے پابند رہے اس واقعے کو بایزید کے واقع سے ملانا افسوسناک ہے۔مخالفت کی حقیقی وجہ وہی تھی جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے۔لیکن قبائلی اس میں شریک نہ تھے۔خاصا بڑا گروہ بعض نہایت ممتاز افراد سید صاحب کے ساتھ رہے۔مذہبی فتنہ انگیزی کا سلسلہ شروع کرنے کے ذمہ دار بڑی حد تک انگریز' ان کے علاوہ سکھ اور پشاور کے دُرانی سردار تھے۔سرداروں نے بے وفائی کر کے سید صاحب کے رفیقوں کی بہت بڑی تعداد اچانک شہید کرادی اور تحریک ان ثمرات و نتائج پر نہ پہنچ سکی جس کی امیدیں اس کے ساتھ وابستہ کی گئی تھیں' تاہم یہ صحیح نہیں کہ وہ ناکام رہی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبائلی علاقے کے لوگ بھی وقتاً فوقتاً یہ ناچ دکھاتے ہیں۔[1]

ادبیات:

اگر چہ پشتو زبان نشو و ارتقاء کی خاصی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس میں اظہار خیالات کی قوت موجود ہے مگر ادبی زبان کی حیثیت میں اس کا استعمال محدود رہا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی یہ مادری زبان ہے، ان کا تناسبِ نوشت و خواند بہت پست رہا اور اچھے پڑھے لکھے پختون اپنے خیالات کے اظہار کے لیے زیادہ مروج زبانوں یعنی فارسی اور اردو کو ترجیح دیتے رہے۔ پشتو میں لکھی ہوئی چیزیں کم ہیں۔ مگر ایک درجن کے قریب گزشتہ زمانے کے شعراء کی تصانیف اب تک محفوظ ہیں اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ ان میں سے دو شاعر بہت ہر دلعزیز ہیں، ایک خوشحال خاں خٹک جو جنگ اور اخلاق کا داعی ہے، دوسرا عبدالرحمٰن جو فلسفی ہے۔ یہ دونوں سترہویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں۔

پہلے مصنفوں نے وہ درجہ حاصل نہ کیا جو ان کے اخلاف حاصل کر گئے۔ ان کی تصانیف میں تصوف کا گہرا رنگ ہے جو مغل ہندوستان میں عام طور پر رائج تھا۔ زیادہ عام موضوع یہ ہے کہ سب ایک ایسے محبوب کی تلاش میں سرگرم ہیں جس تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ آج کل ان نظموں کو عام عشقیہ نظمیں سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ادب ایک خوبصورت عورت یا ایک خوش اندام اور قبول صورت لڑکے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ان شکلوں کو عشق حقیقی یا فلسفیانہ سچائی یا خیر محض کے نشان سمجھا جاتا ہے۔ صرف خوشحال خاں ایک شاعر ہے جس کے شعروں میں شکار، جنگ یا عام گھریلو زندگی کی مسرتوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ایک مثالی پختون قومیت کے گیت گاتا ہے اور مغل فاتحوں کی مخالفت و مزاحمت کو شوکت و سطوت کا لباس پہناتا ہے۔[2]

---

[1] خٹک ناچ کے ولولہ انگیز بیان کے لیے آئن سٹیفز کی کتاب ''سینگوں والا چاند'' لندن 1935ء 52,36 پڑھیے۔

[2] پشتو شاعری کا بہترین انگریزی ترجمہ وہ ہے جو سی-ای-بدلف نے کیا، یہ کتاب جس کا نام ''افغان شاعری'' ہے 1890ء میں بمقام لندن چھپی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبیلوں کے باہم تعلقات:

اگرچہ تمام قبیلے ایک نسل سے ہیں اور ان کی زبان اور ثقافت بھی ایک ہے لیکن وہ اپنے نقطۂ نگاہ کی انفرادیت کو مسلسل رزم و پیکار کی شکل میں نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ محسودوں اور وزیریوں کے درمیان مدت سے دشمنی چلی آ رہی ہے اور اسے بالا اہتمام ترقی دی جاتی ہے۔ اگر اجنبیوں کو وزیرستان میں سفر کرنا پڑے تو بدرقے ساتھ لینے پڑتے ہیں۔ پولیٹیکل افسر بھی ایک درجن بندوقچیوں کے بغیر شاذ ہی باہر جاتے ہیں۔ وجہ یہ نہیں کہ جنوبی قبائل کسی کے خاص دشمن ہیں' وجہ یہ ہے کہ قبائلیوں کی عام دغابازی سے حفاظت کی جا سکے۔ جب کوئی بیرونی شخص وزیریوں کے علاقے میں سے گزرتا ہے تو محسود اس پر گولی چلا دیتے ہیں۔ جب وہ محسودوں کے علاقے میں پہنچتا ہے تو وزیریوں کی طرف سے گولیوں کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ دونوں کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ گولی چلانے کا ذمہ دار وہ قبیلہ ٹھہرے جس میں سے اجنبی گزر رہا تھا' اس لیے حکومت کا عتاب اس پر نازل ہو۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ محسود کوئی الگ قبیلہ نہیں بلکہ وزیریوں ہی کی ایک شاخ ہے' لیکن اس نسلی حقیقت کو عام وزیری اور محسود فریقین نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی شخص کتابوں میں سے شجرے نکال کر اس حقیقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرے تو وہ کسی کو یقین نہ دلا سکے گا اور اندیشہ ہے کہ شاید اسے زندہ واپس نہ آنے دیا جائے۔

مختلف خیلوں اور خاندانوں میں کئی خونی انتقام موجود ہیں جو بعض ایسے خونریز جھگڑوں کا نتیجہ ہیں' جب ایک گروہ کے آدمی نے فوج یا پولیس کے آدمی سے جھگڑا مول لے لیا اور اتفاقیہ اسے قتل کر دیا۔ ایسی خونریزی بدلہ چاہتی ہے جو پشت بہ پشت خاندان میں چلا آتا ہے' حتیٰ کہ کسی خاندان میں بارہ تیرہ برس کے لڑکے پر بھی یہ فرض عائد ہو سکتا ہے اور اس کے لیے دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے فوج کے اندر اور سکاؤٹوں کی بارکوں میں' نیز دور افتادہ شہروں کے بازاروں میں بھی' بظاہر احمقانہ تشدد کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

یہ امر شمالی ہند کے زرخیز میدانوں میں رہنے والے پڑوسیوں کے لیے خوش نصیبی کا باعث ہے کہ قبیلے دوستی کا اہتمام اس پیمانے پر نہیں کرتے جس پیمانے پر جھگڑوں کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہتمام کرتے ہیں' لیکن بعض قبیلوں کے درمیان مدت سے اتحاد چلا آتا ہے۔ آدم خیل آفریدیوں اور خٹک کے درمیان اس وقت سے دوستی قائم ہے جب عام قبیلوں میں سے تنہا آدم خیل نے مغلوں کے خلاف جنگ میں خوشحال خاں کا ساتھ دیا تھا۔ 1908ء میں مہمندوں' آفریدیوں اور شنواریوں نے انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر ایک جتھا بنا لیا۔ 20-1919ء اور 38-1937ء میں مہمند اور وزیری الگ الگ مگر ایک ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑے۔ 1930ء میں کانگرس نے منظم اضلاع میں شورش کا انتظام کیا تو تاریخ میں پہلی مرتبہ قبیلے مخالفت پر آمدہ ہوئے۔ یہ تحریک مغربی جانب سے نہیں بلکہ مشرقی جانب سے ہوئی تھی۔ اسی سال وزیری' محسوذ دوڑ' اتمان خیل اور آفریدی میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ 1947ء میں تمام قبیلوں کے مختلف اجزا نے کشمیر کے لیے لشکر میں شرکت کی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تمام قبیلوں کی متحدہ جنگی قوت نے منظم اور متحد طریق کار پر کسی کام میں حصہ لیا ہو۔ اندازہ ہے کہ جنگجو آدمیوں کی کم سے کم تعداد پانچ لاکھ ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ پختونستان کی تحریک بڑے قبیلوں کے متفرق افراد کو ایک جگہ پر لے آئی ہے' لیکن یہ اتحاد صرف کابل میں پایا جاتا ہے جو اس تحریک کا مرکز ہے۔ اگرچہ اس تحریک میں ایک جذباتی کشش بھی ہے اور نسلی ولسانی خودمختاری کا پہلو بھی موجود ہے۔ تاہم قبائلی علاقے میں اس کے لیے مقابلتاً بہت معمولی کشش پیدا ہو سکی۔[1]

اقتصادی مسئلہ:

قبائلی اقتصاد کے نشوو ارتقاء کا پورا انتظام نہیں ہوا۔ کہیں کہیں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل جاتے ہیں جن میں چاول یا گیہوں بوئے جاتے ہیں اور ان کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ تھوڑی سی بھیڑ بکریاں پتھریلی پہاڑیوں پر چر کر پیٹ پال سکتی ہیں۔ البتہ ہتھیار خوب بنتے ہیں جن میں موجودہ زمانے کی بندوقیں اور پستول بھی ہیں اور سادہ ہتھیار بھی۔ یہ زیادہ تر آفریدی بناتے ہیں۔ بعض محسود اور وزیری اس غرض سے ڈیرہ اسماعیل خاں' ٹانک یا بنوں' پہنچ گئے کہ ہندو جو کاروبار چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے

[1] اس بارے میں جو کچھ مقالہ نگار نے لکھا اس میں اضافے کی چنداں ضرورت نہیں مگر یہ کہہ دینا لازم ہے کہ پختونستان عملاً بے وجود ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے سنبھال لیں۔ پشاور کی منڈیوں میں بھی مہمند موجود ہیں۔ درۂ خیبر کے آفریدیوں نے تجارتی مال اسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے انتظام کو خاصے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا ہے اور بعض کے پاس اس وقت ٹرکوں کے چھوٹے چھوٹے بیڑے موجود ہیں۔ آفریدی دوسرے پختونوں کی بعض ایسی ہی خدمات انجام دیتے ہیں جیسی سکھ بھارت میں انجام دے رہے ہیں یعنی وہ موٹروں کے ڈرائیور اور مکینک ہیں۔ موٹر کی کوئی چیز بگڑ جائے تو وہ اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ اسے درست کر دیں۔ قبائلی علاقے میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں ہوتی جسے بہ سلسلۂ تجارت باہر بھیجا جا سکے۔ البتہ ایک چھوٹے قد کا کھجور کا درخت ہوتا ہے جو وادیٔ کرم میں کاشت کیا جاتا ہے۔ اس کے پتوں سے ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔

کھانے پینے کی زیادہ تر چیزیں اور مصنوعات منظم اضلاع سے حاصل کی جاتی ہیں۔ ان چیزوں کے لیے روپیہ یا تو قیام امن کے لیے سرکاری وظیفوں کی صورت میں حاصل کیا جاتا ہے یا خاصہ دار کی حیثیت میں ملازمت سے ہاتھ آتا ہے۔

حکومت وظیفوں کی شکل میں جو روپیہ دیتی ہے وہ مختلف قبائلیوں کو نہیں بلکہ خیلوں اور قبائلیوں کے ملکوں کو دیتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص ایک خاص علاقے میں افراد کی خاص تعداد کے لیے قیام امن کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ ملک اپنی صوابدید کے مطابق روپیہ تقسیم کرتا ہے اور حکومت کا مواجب خور ہونے کی حیثیت میں اس کا وقار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ شاید خیال ہو کہ اس نظام میں خرابیاں بھی ہوں گی اور بے انصافی بھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی خوش اسلوبی سے چلتا ہے۔ ملک کے لیے مواجب کی مقدار اس کے پیروؤں کی وفاداری اور اطمینان پر موقوف ہوتی ہے۔ جب تک لوگوں کو یقین نہ ہو کہ جو روپیہ وصول کیا جاتا ہے وہ صحیح اور منصفانہ طریق پر استعمال ہوتا ہے۔ اطمینان اور وفاداری قائم رہنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی، چنانچہ ملک کا اثر و رسوخ ختم ہو جاتا ہے۔

سرحدی پالیسی میں خرابی اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کوئی تیز مزاج پولیٹیکل ایجنٹ کسی بے حیثیت آدمی کو باحیثیت بنانے کی کوشش کرتا ہے یعنی مواجب کسی ایسے ملک کے لیے مقرر کر دیتا ہے جس سے دوستانہ تعلق ہو مگر اسے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو۔ قبائلی لوگ ایسے مواجب قبول نہیں کرتے کہ یہ صرف اس ملک کو ملنے چاہئیں جو قبائلی معیار کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابق انہیں وصول کرنے کا حقدار ہو۔ جس ملک کے مواجب بند کردیئے جائیں، قبائل کا بڑا گروہ اس سے وفاداری کا اظہار کرتا رہتا ہے بلکہ حکومت اسے مخالف قرار دے کر علاقے سے نکال دے تو قبائلی گھربار چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ لیکن جس ملک کی ان کے دل میں عزت نہیں اس کے ذریعے سے مواجب قبول کرنے پر وہ آمادہ نہیں ہوتے۔ عام دستور کے مطابق مواجب قبول نہ کرنے کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنگ ہوگی، وجہ خواہ کچھ ہو۔ لہٰذا اگرچہ مواجب اور وظیفوں کا نظام قبیلوں پر قابو رکھنے اور انہیں امن کا پابند بنانے میں بڑا مفید ثابت ہوا ہے لیکن اس سے قبائلی معاشرے کی تنظیم یا نقطۂ نگاہ پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑا۔[1]

جب کوئی قبیلہ یا گاؤں بتا دیتا ہے کہ وہ مواجب قبول کرنے کے لیے تیار ہے تو حکومت قبائلی علاقے کے مرکز میں تعلیم اور طبی امداد کا انتظام کر دیتی ہے۔ چونکہ قبائلیوں کے ہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے نہ وہ مالیہ دیتے ہیں نہ ان پر ٹیکس لگتے ہیں اور جو رقم مواجب یا مجلسی فلاح پر صرف ہوتی ہے وہ حکومت کے خزانے پر بھاری بوجھ ہے۔ کوششیں کی جارہی ہیں کہ اس رقم کو گھٹایا جائے، چنانچہ گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے پر زور دیا گیا اور آبیاری کے ایسے سلسلے سوچے گئے جن سے کھیتی باڑی کو تقویت پہنچے، لیکن فی الحال اس وقت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب سرحد کے بنجر کوہستانی علاقے خودکفیل ہو جائیں گے۔

پختون اور بیرونی دنیا:

پختون بیرونی دنیا سے بخوبی آگاہ ہیں۔ جہاد کشمیر میں انہوں نے جو تجربے کیے ان سے انہیں بیرونی دنیا کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے ان کا موقع و محل بہت اچھا ہے اور اس پر ہمسایہ ملکوں کے مفاد کی حفاظت کا انحصار ہے۔ بڑی طاقتوں کی توجہ

---

[1] جو رقمیں قبیلوں کو ملتی ہیں انہیں مواجب کہتے ہیں ان کے علاوہ ایک امدادی رقم لنگی کہلاتی ہے یہ مختلف لوگوں کو سابقہ خدمات کے بدلے میں یا اعزاز کے طور پر سالانہ امداد یا پنشن کی شکل میں دی جاتی ہے اور اس کی مقدار چند روپے سے چند سو روپے ماہانہ تک جاسکتی ہے۔ ایک اور امدادی رقم خرچہ کہلاتی ہے۔ جب کوئی قبائلی پولیٹکل ایجنسی میں آتا ہے تو ایجنٹ اسے آمدورفت کے خرچ کے طور پر یہ رقم دیتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی ان کی طرف منعطف ہوئی ہے۔ حجروں اور ملکوں کے قلعوں میں جو ریڈیو لگے ہوئے ہیں' ان سے دنیا بھر کی خبریں آتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں جب یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔ ڈاگ ہمرشولڈ' ہنری کیبٹ لاج مولوٹوف' نکسن' کرشنا مینن' خروشیف اور اس قسم کے دوسرے نام اور چیزیں عام ہوگئی ہیں۔ قبائلی لوگ بے تکلف ان کی اچھائیاں اور برائیاں بیان کرتے ہیں' اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد منظم اضلاع کے لوگوں کے برابر نہیں' جو لوگ برطانیہ کی ہندوستانی فوج میں شامل ہو کر دنیا کے مختلف حصوں کی مہموں میں شریک رہے وہ بھی قبائلی علاقے میں مل جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے بھی بیرونی دنیا کے حالات علاقے میں پہنچے۔

پختونوں نے جو یگانہ صلاحیت پیدا کی وہ یہ ہے کہ تہذیبی نشو و ارتقاء کے بعض پہلو قبول کر لیے ہیں جنہیں وہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے خواہاں ہیں۔ تاہم وہ قبائلی معاشرے کا ڈھانچہ برباد نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ چیزیں دنیا کے بہت سے مختلف حصوں سے آئی ہیں لیکن انہوں نے ان میں سے بعض چیزیں چن لیں' اس لیے کہ انہیں احساس تھا کہ جو طریق زندگی انہیں پسند ہے' وہ بیرونی دنیا کے ساتھ تعلق کی بنا پر ضرور تبدیل ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان نے معتدل اور محتاط اصلاحی اقدامات کیے' مثلاً کہیں کوئی سکول بن گیا' کہیں ہسپتال کھل گیا تو ان چیزوں سے فائدہ اٹھایا گیا اور ذمہ داری کوئی قبول نہ کی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجلسی فلاح اور اقتصادی نشو و نما ضرور کامیاب ہوں گے اور پختون آہستہ آہستہ ذمہ داریاں اٹھالیں گے یعنی وہ پاکستان کی قومی زندگی میں اپنا اصل مقام حاصل کریں گے۔

○●○●○

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

7

مغربی پاکستان میں عورت

(جان جے۔ ہانگمن)

کسی مجلسی نظام میں عورت کی حیثیت کا اندازہ کرنے کی صورت یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ اپنی ثقافت میں کیا درجہ رکھتی اور کیا کیا کام انجام دیتی ہے۔ نیز مجلسی نظام کے دوسرے دائروں میں اس کے مقام اور کارِ منصبی کی کیا کیفیت ہے؟ یہ کام انجام دینے کے سلسلے میں یہ اندازہ ضروری نہیں کہ آیا اسے کسی اور مجلسی نظام میں عورت کے درجے سے نسبتاً اونچی یا زیادہ نیچی حیثیت حاصل ہے۔

پیش نظر مقالے میں تین اہم مفروضات ہیں جن کا ذکر ابھی کر دینا چاہیے۔ اول یہ کہ بھارت اور پاکستان کی ثقافت بدستور جاری ہے۔ اگرچہ دونوں ملکوں میں ثقافت کی داخلی شکلوں کے اندر تنوع پایا جاتا ہے اور بعض بدیہی اختلافات بھی موجود ہیں، تاہم دونوں قوموں کے افراد بہت سے مشترک یا حد درجہ یکساں تجربات سے دوچار ہوتے ہیں اور دونوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔[1] دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ ثقافت کی بڑی حد تک یکسانی کے پیش نظر ایک ملک سے حاصل کی ہوئی معلومات کو دوسرے ملک

---

[1] افسوس ہے کہ بالغ نظر مصنف نے ہندو مسلم ثقافت کے مسئلے پر صرف سطحی نظر ڈالی ہے اور دونوں ثقافتوں کے شدید اور گہرے اختلافات تک ان کی نظر نہیں پہنچی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ثقافت کے بعض دائروں کی توضیح کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے مگر اس کام کی حدیں مقرر ہیں اور ان حدوں کا اندازہ بڑی احتیاط سے کر لینا چاہیے۔ تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ ادبی اور اس سے ملے ہوئے مواد کو ثقافت کے متعلق معلومات کا ذریعہ سمجھ لیا جائے۔ علم انسانیت کے ماہر ایسے وسائل کو ملاقات یا مشاہدے پر ترجیح نہیں دیتے۔ البتہ دوسرے ذریعوں سے حاصل کردہ نتائج کی توثیق کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مختصر افسانے کو معاشرے کی کسی خاص حالت کا غیر جانب دار مرقع قرار نہیں دیا جا سکتا' اسے بڑی احتیاط اور چھان پھٹک کے بعد استعمال کرنا چاہیے۔ جہاں دوسرے وسائل کی بنا پر بعض قطعی باتیں معلوم ہوتی ہیں وہاں ادب یا فلموں میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار ان نمونوں میں گہرائی اور مفہوم پیدا کر دیتا ہے جنھیں بیان کرنا مقصود ہے۔ اس قسم کے مفروضات میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ثقافتی عناصر کے ارتباط کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ معاشرے کی طرف سے جو چیزیں بطور اظہارِ خیال پیش کی جاتی ہیں' وہ زندگی کے دوسرے دائروں میں امیدوں' افکار اور اندازِ جذبات کی بھی مظہر ہوتی ہیں۔

پاکستانی عورتوں کے متعلق بات چیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک عمومی مجلسی درجے کا ذکر کیا جائے' ایسا ذکر جو مختلف حیثیتوں پر حاوی ہو' مثلاً پھوپھی' بیٹی' بیوی یا گاؤں کے ملا یا حجام کی بیوی یا دوسری عورتیں۔ ان تمام حیثیتوں میں عورت کو خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس پر خاص ذمہ داریاں ہوتی ہیں' مزید برآں مغربی پاکستان ثقافتی اعتبار سے فی الحال یکساں نہیں۔ اس صوبے کی ایک کروڑ بیس لاکھ عورتوں کی روش مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ پھر کسی ایک علاقے میں بھی طبقے' ذات اور نسل کے اختلافات موجود ہیں۔ ایسے وسیع اختلافات کی بنا پر کوئی قابل اعتماد نتیجہ پیدا کرنا مشکل ہے۔

مثال کے طور پر پنجاب کے دیہات میں عورتیں اپنے مردوں کو مکئی کی فصل کاٹنے میں مدد دیتی نظر آئیں گی' لیکن ضلع مردان یا پشاور کے نزدیک پٹھانوں کے کسی گاؤں میں ایسی مثال شاذ ہی ملے گی۔ اس کے برعکس پنجاب میں بھی خوش حال زمیندار کی بیوی اور بیٹی برقعے کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہ نکلے گی اور نہ وہ کھیت میں کوئی کام کرے گی۔

خانہ بدوش بروہی عورت سے جو کارِ منصبی منسوب ہے وہ ان پٹھانوں کی عورتوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے کارِ منصبی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا جو وقتاً فوقتاً نقل مکان کر کے آتے رہتے ہیں، حالانکہ خانہ بدوش بروہی عورتیں بھی اپنے کنبوں اور بھیڑ بکری کے گلوں کے ساتھ دریائے سندھ کے میدانوں میں آتی ہیں۔ بے پردہ مسلم عورتوں کا کسی گاؤں کے کنویں پر گانا بڑا پُرلطف منظر ہوتا ہے، لیکن یہ منظر صرف پنجاب کے بعض دیہات میں دیکھا جا سکتا ہے، سندھ میں یا پٹھان علاقوں میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے۔ غالباً پاکستانی عورت کے متعلق کوئی بھی ایسا بیان پیش نہیں کیا جا سکتا جس کے بارے میں چترال اور تھرپارکر کے درمیان کسی نہ کسی جگہ مستثنیات موجود ہوں۔[1]

عورت کے متعلق تصور

پاکستان میں عورت کا ثقافتی تصور یہ ہے کہ وہ مردانہ پن کا زنانہ تتمہ ہے جو اپنی صنف کی وجہ سے خطرے کا شکار ہو سکتی ہے اور زنجیر کی وہ کڑی ہے جس کے ذریعے سے بچے اپنی شخصیت کا نشو و ارتقا پاتے ہیں اور ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ تصورات باہم متعلق ہیں لیکن ان پر الگ الگ غور کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ مارگریٹ میڈ نے واضح کیا ہے ثقافت کے لیے بالکل ممکن ہے کہ صنفوں کے درمیان جسمانی اختلافات کو بالکل نظر انداز کر دے اور دونوں صنفوں سے قریباً ایک ہی قسم کے اوصاف اور کارناموں کی امید رکھے۔ ہو سکتا ہے کہ حیاتیاتی اختلافات مردوں اور عورتوں کی بیان کردہ یکساں صلاحیتوں کے نشو و ارتقا میں انجام کار

---

[1] جو وسائل بیان کیے جا چکے ہیں ان کے علاوہ تین دیہات میں پھر کر مواد جمع کیے گئے ایک چھبوز ویڈعیدن ضلع نواب شاہ (سندھ) دوسرا چک نمبر 41۔ ایم۔ بی خردٹوانہ ضلع شاہ پور (پنجاب) تیسرا توڑ ڈھیر ضلع مردان (سرحد) ان تینوں دیہات کا مختصر بیان اس رپورٹ میں موجود ہے جو چھپی نہیں۔ اس سے معلوم ہو سکے گا کہ عورتوں کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہو سکیں۔ زیادہ تر معلومات از ماتو رنکار رنگ کے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ مِس ہربرٹ ڈریلنڈ کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاعات سے بھی مستفید ہوا۔ پاکستان میں سلسلۂ تحقیقات جاری رکھنے کے لیے جو امداد یونیورسٹی ریسرچ کونسل اور شمالی کرولینا کی یونیورسٹی کی سوشل سائنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ملی۔ اس کا اعتراف شکریے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سندھ پنجاب یا بلوچستان سے مراد مغربی پاکستان کے خاص ثقافتی حلقے ہیں جو سابقہ صوبوں کی سرحدوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلل انداز ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یکسانی کی تصدیق بعض اوقات پورے خلوص پر مبنی نہ ہو اور عورت یہ سمجھے کہ مرد زیادہ اختیارات سمیٹ رہے ہیں' حالانکہ نصب العین کا تقاضا اصولی مساوات ہو۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تصویر ایسی نہیں جسے جنوبی ایشیا کی صحیح تصویر سمجھا جا سکے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر زور بھی دیا جاتا ہے۔ ایک صنف دوسری صنف سے مقابلہ نہیں کرتی۔ شہری حلقوں سے باہر مرد اور عورت کے درمیان تعلقات کا ایک نیا تصور ترتیب پا رہا ہے۔ یہ تصور پاکستان پر منطبق ہوتا ہے۔ دیہاتی حلقوں میں مسلمہ تصور عام طور سے یہ ہے کہ دونوں صنفیں برابر نہیں۔ مردوں کو عورتوں پر فوقیت اور اقتدار مسلمہ طور پر حاصل ہے۔ یہ روش اس عقیدے پر مبنی ہے جس کا ذکر ایک مصنفہ نے یوں کیا ہے۔ ''عورت کی جسمانی حیثیت اور اس کی ذمہ داریاں مجبور کرتی ہیں کہ وہ مردوں سے جداگانہ حقوق کی طلب گار ہو۔''[1] عورتوں کا کارمنصبی کیفیت کے اعتبار سے مردوں کے مقابلے میں مختلف ہے۔ اس قسم کے تمام دعووں اور بیانوں میں عورت کو حرارتِ محبت کا بہتر مرکز قرار دیا گیا ہے۔ جذبات کا اظہار بھی وہ زیادہ کرتی ہے۔ اسے بہت جلد تکلیف اور اذیت پہنچ سکتی ہے اس لیے وہ حفاظت و احترام کی متقاضی ہے۔ مرد کو چاہیے کہ عورت کا زیادہ تر احترام کرے۔

چرنوں کو چھو کر پوچھا تو کس نگری کی رانی ہے؟
کس نگری سے آئی ہے تو؟ کس نگری کی ٹھانی ہے؟[2]

عورت زیادہ احترام کی مستحق ہے۔ مرد عورت کے رویے پر فخر کرتا ہے۔ وہ اپنے زیوروں کی طرح اس احترام کا نشان ہے جس کا خاندان متوقع ہوتا ہے۔ پٹھانوں میں ایک ضرب المثل ہے کہ مرد اپنی بیوی کے اوصاف سے پہچانا جاتا ہے۔

ہم جو تصور پیش کر رہے ہیں' اس کا مطلب یہ نہیں کہ مساوات کے مطالبات کے خلاف امتیاز کو تقویت پہنچائی جائے۔ بعض شہری حلقوں کے باہر مساوات کے مطالبے کے لیے زیادہ مستحکم آوازیں بہت کم اٹھتی ہیں۔ جنسی رشک کی واضح علامتیں عورت کی طرف سے نہیں بلکہ مرد کی طرف سے پیش ہوتی ہیں۔ جو عورتیں اپنے لیے مستقل کام تجویز کر لیتی

1۔ مشتاق حسین ''پردے کے پیچھے کیا ہے''۔ ''اسٹار''۔ 1951ء

2۔ احمد ندیم قاسمی ''جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں ان کے متعلق خیالات اچھے نہیں رہتے بلکہ انہیں سخت شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر وہ عام مجمعوں میں آئیں تو روایات کے خودساختہ محافظ ان کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ روایاتی تصور کے حامیوں کی دلیل یہ ہے کہ ایسی عورتیں خوش نہیں رہ سکتیں۔ مساوات کا مطالبہ پیش کر کے عورت اپنی حقیقی فطرت کی مخالفت شروع کر دیتی ہے۔ پاکستانی عورت کا اقتدار و احترام اسی وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک وہ کسی ایسے کام میں دخل نہیں دیتی جس کا تعلق مردوں کے دائروں سے ہو یعنی وہ اپنے اصل دائرے کے اندر رہتی ہے۔

عورت کا اصل کارِ منصبی، جس کے لیے ہر قلب میں انتہائی احترام ہے، مادریت ہے، یعنی اس کا ماں ہونا۔ اسی ذریعے سے وہ اپنا سب سے زیادہ قابل تعریف کارنامہ انجام دیتی ہے۔ اہل قلم اکثر عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ قوم کہاں ہے جو اس کا کردار ڈھالنے کا فرض انجام دیتی ہے۔ اقبال دور حاضر کا سب سے بڑا اسلامی شاعر ہے اس نے ''رموزِ بے خودی'' میں اس جذبے کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ''خطاب بہ مخدرات'' کے زیر عنوان کہتا ہے۔

کودکِ ما چوں لب از شیر تو شست
لا الہ آموختی اور انخست
می تراشد مہر تو اطوارِ ما
فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما

(بچہ جب تیرا دودھ پیتا ہے تو سب سے پہلے تو اسے لا الہ سکھاتی ہے۔ تیری محبت کے سانچے میں ہمارے تمام طور طریقے ڈھلتے ہیں، یعنی ہماری سوچ بچار، ہماری بات چیت اور ہمارا کردار و عمل)

پردہ

عورت کے لیے پردے کا رواج اس امر پر مبنی ہے کہ وہ مرد سے الگ تھلگ رہے۔ نیز اپنی صنف کی وجہ سے خطرے کا معرض نہ بنے۔ پردہ عورتوں کو بے حجابی سے روکتا ہے۔ نیز مردوں کے ساتھ خطرناک خلا ملا سے باز رکھتا ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کی نسائیت پر زور دیتا ہے۔ اس تصور کے مطابق پردہ چھوڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ عورتوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے دنیا کے کاموں میں مردوں کے برابر حصہ لینا ممکن ہو جائے۔ البتہ بعض طبقے پردہ نہیں کرتے۔ وہ دوسرے طریقوں سے اپنی علیحدگی محفوظ کر لیتے ہیں۔

پردہ ایک فارسی لفظ ہے جس کا مطلب ہے اخفا' علیحدگی اور حجاب۔ اس سے عام طور پر عورت کی اس حالت کا ذکر مطلوب ہوتا ہے کہ وہ منظر عام سے الگ رہے اور مردوں کے ساتھ خطرناک خلا ملا سے اسے محفوظ رکھا جا سکے۔ نیز ان معاملات سے بھی بچایا جا سکے جن کا انتظام وہ بطورِ خود نہیں کر سکتی۔ اس رواج کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسبتاً عورتوں کو الگ رکھنے کا ایک خاص اہتمام ہے مگر بنیادی طور پر دنیا بھر میں اس قسم کی علیحدگی کے ہزاروں طریقے موجود ہیں۔

پردے کے کئی طریقے ہیں۔ عموماً یہ کہ عورتوں کے رہنے سہنے کے مقامات مردوں سے الگ ہوتے ہیں' نیز برقع اوڑھا جاتا ہے' یعنی ایسا لباس جو سر سے پاؤں تک عورت کو چھپائے رکھتا ہے لیکن جس میں آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے لیے جالی لگی ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ اضطراب بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ زیادہ رنگین یا جاذبِ نظر برقعے اصل مقصد کے خلاف جاتے ہیں۔

پردہ سفر میں بھی قائم رکھا جاتا ہے۔ ریلوے نے پہلے اور دوسرے درجے میں سفر کرنے والی مستورات کے لیے الگ ڈبے بنا رکھے ہیں۔[1] نوکرانیاں سفر میں چونکہ عموماً تیسرے درجے کا ٹکٹ لیتی ہیں لہٰذا وہ آٹھ بجے شام سے چھ بجے صبح کے درمیان اس خاص ڈبے میں رہ سکتی ہیں' باقی وقت میں نہیں۔ موٹروں اور گھوڑا گاڑیوں میں زنانہ مسافروں کی نشستوں کے اردگرد کپڑا باندھ لیا جاتا ہے۔ اولیا کے مزاروں یا عام میلوں میں عورتوں کے لیے خاص دن مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ بھی پردے ہی کے انتظام کی ایک صورت ہے۔ پشاور یونیورسٹی کی جماعتوں میں لڑکیاں لڑکوں سے الگ ایک پردے کے پیچھے بیٹھتی ہیں۔

پردے کے مختلف درجے ہیں۔ چند اونچے درجے کے خاندان اس پر اتنی سختی

[1] محض پہلے اور دوسرے درجے ہی نہیں بلکہ ڈیوڑھے اور تیسرے درجے میں بھی عورتوں کے ڈبے الگ ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض مرد اپنی عورتوں کو پاس رکھنے کے خیال سے بعض اوقات مردانہ ڈبے میں بٹھا لیتے ہیں لیکن مرد زنانہ ڈبوں میں سوار نہیں ہو سکتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے عمل کرتے ہیں کہ لڑکی پیدائش سے شادی تک گھر کے اندر ہی رہتی ہے اور کوئی غیر رشتہ دار مرد' اگرچہ بچہ ہی ہو' اس کے سامنے نہیں آ سکتا۔ عام طریقہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے گھر کی چار دیواری میں رہتی ہیں اور اگر کوئی اجنبی مرد آ جائے تو وہ کمروں میں چلی جاتی ہیں۔ کبھی کبھار گھر سے نکلتی ہیں تو برقعے پہن لیتی ہیں۔ بازار سے چیزیں لانے کا کام ملازم کرتے ہیں۔ کسانوں کی عورتیں اتنا سخت پردہ نہیں کرتیں۔ سندھ میں عورتیں اپنے شوہروں کے لیے کھانا کھیتوں میں لے جاتی ہیں تو ان کے چہرے چھپے ہوئے نہیں ہوتے' لیکن سرحد کے ضلع مردان میں عورت کے چہرے کا نصف حصہ اور پورا جسم لمبی چادر میں چھپا ہوتا ہے۔ اگر راستے میں چلتے ہوئے کوئی مرد آ جائے تو پٹھان عورت منہ پھیر کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے اور مرد چلا جائے تبھی قدم اٹھاتی ہے۔

پردے کی انتہائی حد بیان کرنا مشکل ہے۔ بڑھی عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو چہرہ چھپا ہوا نہیں ہوتا' لیکن حجاب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی بے تعلق مرد سے بات نہیں کرتی۔ پنجاب کی عورتوں کو پاکستان کے دوسرے حصوں میں زیادہ بے باک سمجھا جاتا ہے۔ انہیں بھی اگر کسی اجنبی سے بات کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو حجاب اور تہذیب وسلیقہ خاص طور پر پیش نظر رکھتی ہیں۔ ''اپوا'' کی تحریک چلانے والی مستورات اگرچہ باہر نکلتی ہیں لیکن وہ سیاہ عینکیں لگا لیتی ہیں اور اسے ایک لحاظ سے برقعے کا بدل سمجھا جاتا ہے۔ عام تصور یہی ہے کہ جو عورتیں باہر نکلتے وقت چہرہ نہیں چھپاتیں وہ پردہ نہیں کرتیں۔ گویا پردے کی ایک حد یہ ہے کہ اول برقع پہنا جائے' دوم زنانہ مکانات میں کوئی غیر رشتے دار مرد جا آ نہ سکے مگر اس طبقے کی عورتیں بھی بعض اوقات باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں' مثلاً جب وہ شوہروں کی معیت میں کراچی یا کسی پہاڑی مقام پر جاتی ہیں۔

پردے کی تاریخ اور نظیروں کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے' خصوصاً یہ معلوم نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہ رواج تھا یا نہیں تھا۔ نیز اس ملک میں اسلام کی مداخلت کا کیا اثر پڑا اور اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ گزشتہ چند سال میں پردہ کم ہو گیا ہے یا نہیں ہوا۔

پردے کا ایک اہم وظیفہ یہ ہے کہ خاندان کی عزت بہت بڑھ جاتی ہے اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ سے ویسے ہی اقتدار کو تسلیم کرنے والے گروہوں سے مطابقت پیدا کرنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا رائے عامہ پردہ جاری رکھنے کے لیے ایک زبردست محرک ہے' جس خاندان کی عورتیں پردہ کرتی ہیں انہیں اپنے بچوں کی شادیاں اچھے گھرانوں میں کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ نیز پردہ عورتوں کی حفاظت کرتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کے لیے علیحدگی اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے لڑکیاں علیحدگی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتیں۔ ساتھ ہی ان کے سرپرست بہت احتیاط کرتے ہیں۔ ایک پٹھان زمیندار نے صاف صاف کہا کہ ہم اپنی عورتوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے' ان کی سیرت کو محفوظ رکھنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

کارہائے منصبی

لڑکوں اور لڑکیوں کے کارہائے منصبی کا فرق ابتدا ہی میں واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے متعلق توقعات مختلف ہیں۔ اور دونوں صنفوں کے ساتھ سلوک الگ الگ ہونا چاہیے۔ والدین کی زندگی کے مقاصد ہیں بچوں کی پیدائش کو انتہائی اہمیت حاصل ہے' خصوصاً عورت کے تعلق میں...... اس لیے کہ بچے سے محرومی عورت کے لیے حد درجہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کی پیدائش کا بڑی سرگرمی سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے بجائے لڑکوں کی پیدائش پر زیادہ خوشیاں منائی جاتی ہیں اور دلی جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ لڑکی کی پوری دیکھ بھال نہیں کی جاتی۔ لڑکی کو کم و بیش اڑھائی برس دودھ پلایا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لڑکے کو دودھ پلانے کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے۔ اس سے پیشتر دودھ چھڑانا اسلامی قانون کے منافی محسوس کیا جاتا ہے۔ اِلّا یہ کہ ماں بیچ میں از سر نو امیدواری سے ہو جائے۔ سورۂ بقرہ[1] میں بیان کر دیا گیا ہے کہ دودھ چھڑانے کی مدت میں خاصے

[1] قرآن مجید کی جس آیت کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بچے کو دودھ پلانے کی مدت پوری کرانا چاہے تو وہ دو سال ہے لیکن اس کے خلاف بھی اجازت ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت 233) لڑکی کو لڑکے کے مقابلے میں زیادہ دیر تک دودھ پلانے کی کوئی خاص مثال کم از کم ہمارے سامنے نہیں۔ اغلب ہے کہ مصنف کا یہ بیان ناقص معلومات پر مبنی ہو۔ (مترجم)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختلافات کی اجازت ہے۔ جہاں بچے کو دودھ پلانے کی مدت میں مرد اور عورت کے درمیان اختلاط سے پرہیز کیا جاتا ہے' وہاں دودھ پلانے کو بلاواسطہ منع حمل کا ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے۔لڑکی کے ساتھ لڑکے کے مقابلے میں زیادہ ہمدردانہ برتاؤ پاکستان میں عام ہے۔ یہ برتاؤ عورت کے عام کارِ منصبی کے بہت سے عناصر پر مبنی ہے۔ یہ اس تصور کے بھی عین مطابق ہے کہ عورت کی صنف کمزور ہے اور وہ مردوں سے عام حالات میں مختلف ہے۔لڑکوں پر زیادہ سختی سے پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ایک سندھی نوجوان نے کہا کہ لڑکی کو سزا دینا بہت ہی منحوس اور اخلاقی اعتبار سے مکروہ سمجھا جاتا ہے۔اسی وجہ سے لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ ذکی الحس ہوتی ہیں۔

بچپن میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے کھیلتے ہیں اور ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ گھر کے صحن یا گاؤں کی گلیوں میں وہ کیچڑ یا مٹی سے مل جل کر کھیلتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یہی کام آگے چل کر مردوں کے لیے گھر بنانے کی غرض سے اینٹیں تھاپنے اور عورتوں کے لیے گوبر تھاپنے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔لڑکیاں پانچ سال کی عمر سے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال شروع کر دیتی ہیں اور انہیں گود میں اٹھائے پھرتی ہیں۔ساتھ ہی اضافی اقتصادی ذمہ داریاں ان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ بعض بچے زمینداروں کے گھروں میں ملازم کی حیثیت سے زندگی شروع کر دیتے ہیں۔بعض ان امیر ہمسایوں کے بچوں کے ہمجولی بن جاتے ہیں۔

لڑکیاں گھروں میں برتن صاف کرتی ہیں' روئی میں سے بنولے نکالتی ہیں' چکی پر آٹا پسواتی ہیں اور جھاڑو دیتی ہیں۔جن لڑکیوں کے والدین کے پاس تھوڑی بہت زمین ہوتی ہے۔وہ کھیتوں میں سے گھاس کھود کر گائے یا گدھے کو کھلاتی ہیں۔بعض لڑکیاں راستوں میں پھر پھر کر گائے کا گوبر یا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چنتی ہیں۔لیکن زمینداروں کی بیٹیوں کے لیے یہ سرگرمیاں مناسب نہیں سمجھی جاتیں۔ وہ عموماً ابتدائی وقت کھیلنے میں گزار دیتی ہیں۔ ان کے لباس بھی صاف ستھرے ہوتے ہیں جن سے ان کے والدین کی اقتصادی اور مجلسی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ البتہ ان لڑکیوں کو اپنے یا ہمسایوں کے گھروں کے علاوہ اور کہیں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اِلّا یہ کہ وہ تعلیم کی غرض سے مدرسے جائیں۔

بڑے بھائی اور بہن کے درمیان تعلق وہی ہوتا ہے جس میں عورتوں کی تابعیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نمایاں رہتی ہے۔ بڑا بھائی بہن کے تعلق میں باپ کے تمام فرائض ادا کرتا ہے۔ پٹھان لڑکیاں جوان ہو کر اپنے بھائیوں سے بہت حجاب کرتی ہیں۔ لیکن پنجاب میں مختلف حلقوں کے بچوں کے درمیان اتنا حجاب نہیں' وہ سردیوں میں ایک ہی کمرے کے اندر سوتے ہیں۔ البتہ کسی ایک کی شادی ہو جائے تو وہ علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ بہرحال نصب العین یہی ہے کہ لڑکی حجاب کی پابند رہے' شادی شدہ عورتوں کی گفتگو میں شریک نہ ہو' دوسرے اس کے متعلق بات چیت کریں تو وہاں سے اٹھ جائے' بڑے مجمعوں سے دور رہے' خصوصاً ایسے مجمعوں سے جہاں صنف مخالف کے لوگ شریک ہوں' نیز بلند آواز سے بات نہ کرے۔

دیہات میں بعض لڑکیاں قرآن خوانی کے لیے مسجدوں میں جاتی ہیں یا ابتدائی درجے کے مدرسوں میں پڑھنے بیٹھ جاتی ہیں۔ البتہ لڑکی کے تعلق میں تعلیم کا معاملہ مختلف اسباب کی وجہ سے محدود ہے اور اس سلسلے میں لڑکی کے درجے کے متعلق بزرگوں کا تصور ہر چیز کی بنیاد ہوتا ہے۔ بھائی کی طرح بہن کی بھی ذمہ داریاں ہیں لیکن ان میں مدرسوں کے اندر تعلیم پانا شامل نہیں۔ جب کوئی خاندان اپنے مال و ثروت سے فائدہ اٹھا کر کھیتوں میں کام کاج کے لیے مزدور اور ملازم رکھ لیتا ہے اس حالت میں بھی لڑکیوں کے لیے سکول جانے کا سلسلہ محدود ہی رہتا ہے۔ اس لیے کہ سمجھا جاتا ہے لڑکیوں کو عام زنانہ کار ہائے منصبی کے دائرے سے باہر کے علم کی چنداں ضرورت نہیں۔

مزید برآں جب لڑکی بچپن کے دور سے قدم آگے بڑھاتی ہے تو حجاب اسے لڑکوں کے ساتھ میل جول سے باز رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبری تعلیم کی توسیع میں لڑکیوں کے شامل کرنے پر ناراضامندی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ بھی سکول بنائے جائیں تو یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ بہرحال نوجوان لڑکی کو سکول جانے کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑے گا اور اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ پنجاب میں بہت سے دیہات ایسے ہیں جن میں لڑکیوں کے ابتدائی مدرسے نہیں ہیں۔ اگر لڑکیوں کا مدرسہ گاؤں کے نزدیک نہ ہو تو والدین تعلیم کی مخالفت میں زیادہ سرگرم ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ ناخوشگوار خیال بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ چوتھے درجے (قریباً 9 سال کی عمر تک) کے بعد تعلیم لڑکیوں کو دور حاضر کے خیالات سے متاثر کر دیتی ہے' یعنی ان کی ضرورتیں بہت بڑھ جاتی ہیں اور وہ پردہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھانے پر کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ چوتھے درجے کے بعد انگریزی کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ غالباً قابل تعلیم لڑکیوں میں دس فیصد سے کم پاکستان کے سکولوں میں شریک ہیں اور ان میں سے زیادہ تر لڑکیاں شہری علاقوں میں رہتی ہیں۔

لباس' آرائش اور جسمانی زیب و زینت کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مخصوص زنانہ طور طریقوں کا معاملہ اتنا مختلف ہے کہ عمومی اصول پیش نہیں کیے جا سکتے۔ عام طور پر شلوار اور کرتا پہنا جاتا ہے اور سر پر دوپٹہ۔ کسانوں کی عورتوں کے عام زیور نیز زیب و زینت کے طریقے یہ ہیں۔ چوڑیاں' پازیب' بالے یا آویزے۔ جسم کے مختلف حصوں کو گودنا' ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی لگانا اور چہرے پر خال بنانا۔ جو عورتیں پردہ کرتی ہیں وہ سیاہ یا بھورے رنگ کا یا سفید برقع پہن لیتی ہیں۔ لباس کی حیثیت اور صفائی ہر فرد کی اقتصادی حالت پر مبنی ہے۔

اگرچہ زیورات پہننا عام نہیں لیکن قیمتی زیورات ہر عورت کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ جس عورت نے زیور نہ پہن رکھا ہو سمجھا جاتا ہے کہ اسے پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ وہ اپنے شوہر یا باپ کے احترام کا مظہر بھی قرار نہیں پا سکتی اور خاندان کے وقار کا نشان بھی نہیں بن سکتی۔ امریکہ کی عورتیں بظاہر بہت دولت مند ہوتی ہیں' تاہم وہ زیور بہت کم پہنتی ہیں۔ یہ امر پاکستان میں لوگوں کے لیے باعثِ تعجب ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ لڑکیوں کے لیے اچھے لباس اور زیورات پر بہت زور دیا جاتا ہے مگر یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ الگ تھلگ زیر حجاب رہیں گی۔ محکمۂ تعلیم کے افسر یا درسگاہوں کے معلم یہ سمجھتے ہیں کہ سادہ زندگی بہت اچھی ہے' لہٰذا وہ اپنے زیر تربیت لڑکیوں کو سادگی کی تعلیم دیتے ہیں جس میں ریشمی لباس یا خوشبوؤں کے استعمال سے پرہیز بھی شامل ہے۔

بالوں کو عام طور پر تیل لگایا جاتا ہے' جو افغان سردی کے موسم میں نقل مکانی کر کے پاکستان آ جاتے ہیں ان کی عورتیں شکر پانی میں گھول کر استعمال کرتی ہیں۔ بالوں کا سنوارنا عموماً گاؤں کے حجام کی بیوی کا کام ہے۔ خاص تقریبات پر بھی وہی یہ کام انجام دیتی ہے۔

شادی اور اس کی تقریبوں کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شادی مرد اور عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ ہر فریق اپنے فائدہ کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے سے شرطیں منوا سکتا ہے۔ مثلاً دلہن والے اس شرط پر بھی اصرار کر سکتے ہیں کہ شوہر اس کی زندگی میں دوسری شادی نہ کرے گا۔ عملاً گفت وشنید زیادہ طوالت نہیں پکڑتی۔ اس لیے کہ امکانی شوہر نہ یکساں ہم پایہ ہوتے اور نہ ان کی کثرت ہوتی ہے۔ کم از کم پہلی شادی کے موقع پر تمام تفصیلات والدین طے کرتے ہیں۔ عموماً ایک رقم شوہر کے والدین کی طرف سے دلہن یا اس کے والدین کو دی جاتی ہے۔ اسے طلاق کی صورت میں ذریعۂ حفاظت سمجھا جاتا ہے لیکن بیوی کو اصل حفاظت کا موقع آگے چل کر ملتا ہے۔ لڑکی کے والدین شادی کے موقع پر پارچات' زیورات اور دوسری چیزیں بطور جہیز دیتے ہیں۔ لڑکی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے لیے جہیز اکٹھا کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ شادی پر بہت زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے جس کی فراہمی کے لیے بعض اوقات خاندان کو بھاری قرض لینا پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں دولت خرچ کرنے کی بجائے دو خاندان اپنی بیٹیوں کو بالمقابل بیاہ دیتے ہیں۔ بہت سے مسلمانوں میں چچیرے اور ممیرے بھائی بہنوں کی شادی کو ترجیح دی جاتی ہے۔[1] ضلع مردان کے دو خٹک خاندانوں میں سگے بھائی کی بیٹی کو دوسرے رشتہ داروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو مناسب سمجھا جاتا ہے کہ بیوہ شوہر کے بھائی سے شادری کرے' خواہ اس کی بیوی موجود ہو۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ماں کسی اجنبی سے شادی کرے گی تو اس کے بچے بہت محسوس کریں گے اور انہیں اجنبی کے گھر جانا پڑے گا جو بچوں کے ساتھ مناسب برتاؤ نہیں کرے گا۔

نئی دلہن کو اپنے شوہر کے علاوہ سسرال کے دوسرے افراد سے بھی مطابقت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ جب شوہر کام کاج کے سلسلے میں شہر چلا جاتا ہے تو دلہن سسرال والوں ہی کی نگرانی میں رہتی ہے۔ شادی کو خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے فریقین میں سے کوئی بھی بے تکلف ایک دوسرے کا ذکر نہیں کرتا۔ خصوصاً عورت کو دوسرے فرد کے سامنے شوہر کا نام لیتے ہوئے بڑا تکلف ہوتا ہے' نیز مرد عورت الگ الگ کھانا کھاتے ہیں۔ اگرچہ بہت سی عورتیں شادی کے بعد

---

[1] انگریزی زبان کا لفظ کزن (Cousin) پاکستان میں مستعمل نہیں۔ سندھ اور پنجاب میں پھوپھی اور ماموں نیز چچا اور خالہ کے بچوں کے لیے الگ الگ نام ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کزن کے لیے آٹھ اصطلاحات ہیں۔ پشتو زبان میں خالہ اور چچا کے بیٹے بیٹیوں کو الگ درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں آٹھ کے بجائے چھ الگ الگ اصطلاحیں ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے مردوں سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ لیکن ان کے درمیان دو گہرے ساتھیوں کے سے تعلقات شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مرد اپنے دوستوں سے میل جول رکھتا ہے اور گھر کے مردانہ حصے میں ان ہی کے پاس سوتا ہے۔ بیوی دن کا پورا وقت زنانہ حصے میں گزارتی ہے۔

معاصر پاکستان میں تعددِ ازواج کی بھی ایک حد تک مخالفت کی جا رہی ہے۔ (یہ بتا دینا چاہیے کہ ایک سے زیادہ بیویوں والے آدمی بہت ہی کم ہیں) یہ مخالفت دیہاتی حلقوں کے بجائے شہری حلقوں میں زیادہ ہے۔ اگرچہ دور رشتے دار عورتوں کے ساتھ شادیاں کبھی کبھی کر لی جاتی ہیں لیکن عام طور پر ایک مرد کی مختلف بیویاں آپس میں رشتے دار نہیں ہوتیں۔ گھر میں اجنبی عورت مختلف افراد کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کا اہم مسئلہ پیش کر دیتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دو بیویاں اکٹھی رہنے میں کامیاب نہ ہوں گی۔ شوہر کے لیے ضروری ہے کہ بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ یہ نصب العین نہ بآسانی پورا ہو سکتا ہے اور نہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے۔ تعددِ ازواج کی حالت میں باہم جھگڑوں کو روکنے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ بیویوں اور ان کے بچوں کے لیے الگ الگ مکان بنا دیئے جائیں اور پہلی بیوی کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔

بالغ عورت کی زندگی کے خاص کام یہ ہیں۔ بچوں کی پرورش' خانہ داری کے امور کی بجا آوری اور بعض اوقات کھیتی باڑی میں امداد' دولت مند گھرانوں میں عام کام کاج ان لوگوں سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں معاوضہ دے کر بلا لیا جاتا ہے۔ ایسے گھرانوں میں عورتوں کو بچوں کی دیکھ بھال کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ وہ سینے پرونے اور کاڑھنے کا بھی کام انجام دیتی ہیں اور خاصا وقت بات چیت کے لیے بھی نکال لیتی ہیں۔ دہقانی عورت کے لیے دن کا کام کاج موسموں پر موقوف ہوتا ہے اور دوسری ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ کام کاج بھی بدلتا رہا ہے۔ پہلے عام نقشہ یہ ہوتا تھا کہ بیوی بہت تڑکے اُٹھتی تھی تاکہ آٹا پیس لے۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ بیلوں سے چلنے والی چکیاں یا تیل اور بجلی سے چلنے والی چکیاں عام ہو گئی ہیں اور ان میں پیسے یا غلہ دے کر آٹا پسوایا جا سکتا ہے۔ اب دہقانی عورت کا عام کام یہ رہ گیا ہے کہ دودھ بلوئے' چارہ کاٹے اور کھانا پکائے۔ اب سے پچیس سال پیشتر بہت سی عورتیں روئی میں سے بنولے نکالتی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوت کاتتی تھیں۔ اب یہ کام کرنے والی عورتیں بہت کم رہ گئی ہیں۔

یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ کھانا پکانا کوئی معمولی کام نہیں۔ کٹی ہوئی سبزیوں کو ملانا' مرچ مصالحہ ڈالنا' کبھی کبھار گوشت پکانا اور تازہ چپاتیاں تیار کرنا خاصا وقت لیتا ہے۔

پاکستان کے جس حصے میں عورتیں کھیتی باڑی میں امداد دیتی ہیں وہاں کے بارے میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہل چلاتی یا بیج ڈالتی ہیں' پنجاب میں عورتوں کا کام زیادہ تر یہ ہے کہ دودھ دینے والے جانوروں کو چارہ ڈالیں یا چرا لائیں یا پانی پلا دیں۔ باقی تمام کام مرد انجام دیتے ہیں۔ اس کی تصدیق سیالکوٹ کے قریب کی ایک عورت کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر ڈارلنگ[1] نے کیا ہے۔ اس نے کہا ''ہمارے کام میں کوئی برکت نہیں' مردوں کے کام میں برکت ہے' اس لیے کہ اسی سے فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔'' مرد اور عورت کے درمیان تقسیم کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان گہرا تعاون شروع ہو گیا۔ اس سے دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ مزید تعاون دیہات کے کمیوں سے حاصل ہوتا ہے اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ان کی عورتیں خاص فرائض ادا کرتی ہیں' خصوصاً تقریبات کے موقعوں پر۔

جن مشترکہ خاندانوں کی عورتیں مختلف کام مل جل کر انجام دیتی ہیں۔ مثلاً کھانا پکانا' جانوروں کو پانی پلانا' ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرنا' ایسے خاندانوں کے افراد کی تعداد پیش نظر رکھتے ہوئے فرصت کے مختلف نمونے سامنے آتے ہیں۔ چھوٹے خاندانوں میں عورتیں کوئی اور کام ختم کرتی ہیں تو سینے پرونے اور کاڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔

پنجاب کی مجلس تحقیقاتِ اقتصاد نے جو معلومات فراہم کیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد اور عورت نہ صرف کھانا الگ الگ کھاتے ہیں بلکہ ان کی خوراک کے نمونے بھی الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً عورتیں اور بچے دن میں کئی مرتبہ اور بعض مقامات پر بے وقت کھاتے ہیں اور ان پر آٹا کم خرچ ہوتا ہے۔ لیکن پنجاب کے مرد جو فصلیں کاٹنے میں مشغول رہتے ہیں صبح و شام گھی سے چپڑی ہوئی روٹیاں کھاتے ہیں۔ عورتیں اس طرح گھی سے چپڑی روٹیاں استعمال نہیں کرتیں۔ مرد عورتوں سے زیادہ دودھ پیتے ہیں۔ وہ تمباکو بھی زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عورتیں حقہ بالکل نہیں پیتیں۔ وہ کام کرتی رہتی ہیں اور

1۔ ڈارلنگ۔ صفحہ 256

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف فرصت کے وقت میں حقہ پیتی ہیں۔ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ہفتے بھر میں کسی دن فرصت نہیں ملتی۔ صرف زچگی کے دنوں میں گھر کے کام کاج سے کچھ عرصے کے لیے فراغت مل جاتی ہے۔ اگر خاندان میں کوئی مرگ ہو جائے تو رشتہ دار اور ہمسائے کھانا بھیج دیتے ہیں اور عورتیں مع اپنی رشتہ دار خواتین سادہ لباس پہنے بیٹھی رہتی ہیں۔ تعزیت کرنے والی مستورات آتی رہتی ہیں۔

ہم نے مستورات کے کارِ منصبی کے متعلق جو کچھ معلوم کیا اس میں خاص ذاتوں اور قبیلوں کے خصوصی نمونوں پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں یہ امر زیرِ غور آ سکتا تھا کہ بروہی عورت بھیڑوں اور دنبوں کی کھال یا بکری کے بالوں سے کیا کچھ بناتی ہے ''کافر'' ماں زچگی کی جھونپڑی میں کیوں کر وقت گزارتی ہے یا خانہ بدوش بھکاری عورتیں کیا کرتی ہیں جو پیسوں کے لیے سرِعام گاتی ہیں اور پردہ نہیں کرتیں۔

قانونی حقوق

پاکستان کے مسلمان فخریہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے صحیح قانون اور دوسرے ضوابط کے ذریعے سے عورتوں کے بہتیرے حقوق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ مخالفین کا جواب یہ ہوتا ہے کہ شرعی قانون کی بار بار خلاف ورزی ہوتی رہی' اسی وجہ سے اس کی دفعات پوری طرح مؤثر نہ ہو سکیں اور چونکہ عورتیں پردے میں رہتی ہیں اور انہیں تعلیم کا پورا موقع نہیں ملتا۔ لہٰذا انہیں اپنے خاص حقوق کے لیے دعوے کے لیے موقع نہیں ملا۔ مثلاً عورت ایک قانونی شخصیت ہے اور وہ عدالتوں میں جا کر اپنے مفاد کی حفاظت کر سکتی ہے۔ تاہم رواج یہ چلا آتا ہے کہ وہ علیحدگی میں اور منظرِ عام سے دور رہ کر زندگی بسر کرے۔ لہٰذا اس کے لیے اپنے حقوق میں خلل اندازی کے خلاف چارہ جوئی مشکل ہو جاتی ہے۔ مزید برآں وہ رضامندانہ بھی اپنے حقوق چھوڑ دیتی ہے' مثلاً جس زمین پر اس کا حق ہے...... اس سے اپنے بیٹوں یا شوہر کے حق میں دستبردار ہو جاتی ہے۔

والدین کی حد درجہ اطاعت اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے حالات کی بنا پر ممکن ہے' ایک لڑکی ذاتی احساسات سے کنارہ کش ہو جائے اور والدین نے اس کیلئے جو شادی کا بندوبست کر لیا ہے اسے قبول کرے۔ جب شادی کا معاملہ طے ہوتا ہے تو بہت کم لڑکیاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس امر پر اصرار کرتی ہیں کہ شوہر ایک شادی پر قناعت کرے۔ اگرچہ انہیں اصرار کرنے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے اور ان کیلئے موت کا تصور حد درجہ خوفناک بھی ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں عورتوں نے اپنے قانونی حقوق کامیابی سے محفوظ کر لیے۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ لہٰذا اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ دیہاتی حلقوں میں رائے دہی کے حقوق سے بہت کم عورتیں استفادہ کرتی ہیں۔ ایک لحاظ سے ایسے حقوق عموماً عمل میں بھی نہیں آتے۔

قانون نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا جو بندوبست کر رکھا ہے اس کی مثالیں مندرجہ ذیل امور کے سلسلے میں قانونی ضوابط پیش کرتی ہیں۔ یعنی مہر' تعدد ازواج' طلاق اور میراث۔ عورت مہر چھوڑ دینے کا حق رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شادی کے سلسلے میں اپنے شوہر کی دولت میں سے حصہ لینے کی حقدار ہے۔ ہم مقامی رواج کی پیروی کرتے ہوئے اسے کابین قرار دیں گے' اس کے مقابلے میں جہیز بھی عورت کا مال ہے۔ مال سے مراد وہ رقم ہے جو شادی کے سلسلے میں دلہن کے والدین وصول کرتے ہیں' اپنے خاص مفہوم میں کابین سے مراد یہ ہے کہ عورت بطور خود دولت و ثروت کی حقدار ہے اور اپنے شوہر سے آزاد رہ کر زندگی بسر کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی طلاق کے معاملے میں اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ جس مرد نے شادی کے وقت کابین کی زیادہ بڑی رقم منظور کر لی' وہ بیوی کو طلاق دینے میں حد درجہ تامل کرتا ہے۔ عورت کے پاس دولت کا خاصی مقدار میں ہونا بھی یہی وظیفہ بجالائے گا۔ کابین کی اہمیت یوں ظاہر ہوتی ہے کہ لڑکی کے والدین کو ہلکے کابین پر راضی نہ ہونا چاہیے۔ متعہ میں بھی کابین لازم ہے اور متعہ محض شیعوں کے یہاں جائز ہے۔

تعددِ ازواج کے سلسلے میں بیوی کے حقوق کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ تمام مفسر اس امر پر متفق ہیں کہ شریعت میں زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت خاص حالات میں ہے' جب کوئی مرد اپنی توجہ تمام بیویوں پر یکساں مبذول رکھے اور کسی سے تغافل نہ برتے۔ جو لوگ ایک شادی کے حامی ہیں وہ تعددِ ازواج کی مخالفت سے احتراز کرتے ہیں اور اس کی تنسیخ کا دعویٰ نہیں کرتے۔ ''پاکستان ٹائمز'' میں ایک خط شائع ہوا تھا۔ (13 دسمبر 1954ء) جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ ایک مقدس اسلامی اجازت ہے۔ تعددِ ازواج کے مخالف اس پر عمل کی صحت پر بھی زور دیتے ہیں تاکہ جس بیوی سے شوہر تنگ آ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیا ہو اس سے تغافل نہ برتے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آیا موجودہ زمانے میں قرآنی احکام کی پیروی کرتے ہوئے تمام بیویوں سے یکساں برتاؤ رکھا جاسکتا ہے؟

قانونی لحاظ سے طلاق کے سلسلے میں عورت بے دست و پا نہیں۔ بے شک شوہر بلاوجہ نکاح منسوخ کرسکتا ہے۔ لیکن اس قسم کا طرزِ عمل اخلاقی اعتبار سے مکروہ ہے۔ ضروری ہے کہ خاص وقت تک انتظار کیا جائے جس میں میاں بیوی کے درمیان صلح ہو جائے۔ مرد کا یہ حق عورت کی طرف بھی منتقل ہوسکتا ہے۔ اس طرح عورت کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک مؤثر حربہ مل سکتا ہے۔ فیضی کے قول کے مطابق مرد اور عورت رضامندی سے طلاق پر متفق ہوسکتے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں یہ رسم زیادہ بڑھ رہی ہے۔ اس کی ابتدا بیوی سے ہوتی ہے اور وہ مہر کا ایک خاص حصہ چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اگر کسی عورت کے خلاف فحش کاری کا الزام عائد کیا جائے اور وہ ثابت نہ ہو تو بھی عورت کو طلاق لے لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی قانون تنسیخ نکاح 1939ء کے رُو سے عورت کو یہ حق مل گیا تھا کہ اگر شوہر اچھا سلوک نہ کرے' نان نفقہ نہ دے' دو سال تک بے پتا رہے' کم از کم سات سال کے لیے قید ہو جائے یا اس کا دماغ پھر جائے یا اسے جذام ہو جائے یا وہ مکروہ جنسی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے تو عورت طلاق حاصل کرسکتی ہے۔ جب کوئی عورت اپنا مذہب بدل لے اور اسلام کو چھوڑ دے تو شریعت کے مطابق اس کا نکاح خود بخود فسخ ہو جاتا ہے۔

حنفی فقہ کی رو سے ہر عورت کو میراث کا حق حاصل ہے لیکن مرد کے مقابلے میں اسے عموماً نصف حصہ ملتا ہے۔ اگر کوئی مرد فوت ہو جائے اور اس کے پیچھے بچے رہ جائیں تو بیوی کا حصہ پوری جائیداد میں سے 1/8 ہوتا ہے۔ جہاں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں' وہاں یہ حصہ ان سب میں برابر بٹ جائے گا۔ کوئی مرد اپنی جائیداد کے ایک تہائی حصے سے زیادہ کے متعلق وصیت نہیں کرسکتا۔ یہ حکم بھی بیوی کے لیے سازگار سمجھا جاسکتا ہے۔

عورتوں کے قانون حقوق کی توسیع کا معاملہ سامنے آتا ہے تو زیادہ تر مخالفت ان امور میں ہوتی ہے جو پردے' حجاب اور مرد و عورت کے باہمی حقوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ 18 جنوری 1955ء کے ''پاکستان ٹائمز'' میں ایک خط چھپا تھا جس میں عورتوں کو حق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائے دینے کا ماتم کیا گیا تھا۔ وجہ یہ بتائی تھی کہ عورتوں کو حکومت کے معاملات میں دخل کا حق دینا زوال کی علامت ہے۔ عورتوں کو محض وہ کام انجام دینے چاہئیں جو قدرت نے انہیں انجام دینے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے برعکس اخبارات سے شہادتیں ملتی رہتی ہیں کہ شہری حلقوں کی عورتیں اپنی صنف کے حقوق کی حفاظت کے لیے کتنی سرگری سے کام کر رہی ہیں اور جو حقوق حاصل ہو چکے ہیں ان کا احساس سب کو دلا رہی ہیں۔

رسم ورواج

پاکستان میں لڑکی کیلئے سب سے زیادہ اہم تقریب اس کی شادی ہے۔ اس پر اچھے لباس' خاص زیورات اور تحفے پیش کیے جاتے ہیں۔ گھر کے اندر خاص اہتمام ہوتا ہے۔ اس کے اور دولہا کے خاندان کی عورتیں اس تقریب کو بڑی شان سے مناتی ہیں۔[1] ان تقریبات میں دلہن صرف حجاب پر عمل پیرا رہتی ہے۔

دوسری تقریب وہ ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہو تو زیادہ خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ضلع مردان کے موضع توڑ ڈھیر میں پٹھان زمیندار لڑکے کی پیدائش پر دو بکرے ذبح کرتا ہے اور ان کا گوشت مٹھائی کے ساتھ دوستوں میں بانٹتا ہے۔ اگر لڑکی پیدا ہو تو ایک جانور ذبح کیا جاتا ہے اور مٹھائی تقسیم نہیں ہوتی۔[2] بیشک لڑکے اور لڑکی کی پیدائش کے سلسلے میں تصورات کا اختلاف موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیدائش کی خوشی میں بھی اختلاف ہے۔ تقریبات عموماً ان جذبات کا اظہار ہوتی ہیں جو خاص مواقع کیلئے موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم ایسے اعمال کے سلسلے میں جو اہتمام کیے جاتے ہیں وہ اس امر کا نشان ہوتے ہیں کہ مختلف افراد یا ان کے درجے عوام کی نظروں میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں بچے کی پیدائش کے بعد رسم ختنہ کے موقع پر خاص تقریب انجام پاتی ہے۔

---

1. مسلمانوں میں شادی کے موقع پر جو رسمیں ادا کی جاتی ہیں' ان کے لیے ملاحظہ ہو مسز میر حسن علی کی کتاب باب نمبر 15 نیز ایچ اے روز کی کتاب صفحہ 88-813 اس کے علاوہ ایک افسانے میں بھی یہ رسمیں بیان کی گئی ہیں جو زینت فتح علی نے زہرہ کے نام سے لکھا ہے۔

2. لڑکے اور لڑکی کی پیدائش پر عقیقہ اسلامی رسم ہے۔ لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کے لیے ایک بکرا۔ یہ رسم تقریباً ہر مسلمان ادا کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثقافتی تعلقات:

ہم نے عورت کے درجے اور حیثیت کا وقتاً فوقتاً تفصیلی مطالعہ کیا مثلاً پردے یا تقریبات کے باب میں سوال بھی اٹھایا کہ اس عنصر کو عورت کی حیثیت کے دوسرے عناصر یا ثقافت کے دوسرے پہلوؤں سے کیا تعلق ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اختصار سے عورت کی حیثیت کی وضاحت مغربی پاکستان کی ثقافت کے دوسرے حصوں کے تعلق میں کر دیں۔ ایسے تجزیے میں ثقافت کو ایک منحصر نظام قرار دیا جاتا ہے۔ زنانہ حیثیت نظام کا ایک حصہ ہے اور یہ دوسرے حصوں پر منحصر ہے۔ گویا ہمارا سوال یوں ہو گیا کہ اگر دوسرے ثقافتی حالات بدل جائیں تو کیا عورت کی حیثیت بھی بدل جائے گی؟ یہ سوال بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ اس کا جواب ایک مفروضہ ہے جس کا جائزہ لینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ کوئی تقابلی ذریعہ استعمال کیا جائے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ اس تجربے کی تہ میں جو نقطۂ نگاہ ہے اس کی حیثیت علیت کی نہیں' انتساب کی ہے۔ یعنی ثقافت کا ایک حصہ دوسرے حصے کی علت نہیں ہوتا۔

عورتیں الگ تھلگ رہیں' کھیتوں میں کام نہ کریں' دکانوں پر نہ جائیں۔ زیورات پہنے رہیں۔ یہ سب چیزیں ایک خاندان کے درجے اور احترام کا نشان ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان دولت مند ہے۔ یہ عموماً وہیں ہوتا ہے جہاں لوگ اس کی استطاعت رکھتے ہیں۔ جن ثقافتوں میں عورت کے ساتھ ایسے برتاؤ کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ نسبتاً خوشحال و دولت مند گروہوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ یعنی ان گروہوں سے جو ضرورت کی ہر چیز کے لیے محنت پر مجبور نہیں ہوتے۔ پاکستان میں بہت سی ایسی جنسیں پیدا ہوتی ہیں جو عورتوں کے لیے مقابلتاً فرحت کی زندگی بسر کرنے کا موقع پیدا کر دیتی ہیں یعنی عورتوں کا متعلقہ کام ملازموں یا اُجرت پر کام کرنے والوں سے لیا جاتا ہے۔ علم الانسان کے ماہروں نے دوسرے جن گروہوں کے حالات کا جائزہ لیا۔ اہل پاکستان ان کے مقابلے میں غریب نہیں۔ یہاں کھیتی باڑی ہل کے ذریعے سے خوب ہوتی ہے اور آبیاری کے اچھے انتظامات ہیں اس لیے پیداوار خاصی بڑھی ہوئی ہے اور ملک خوشحال ہے۔ عورتوں کی حقیقی حیثیت کو سمجھنے کے لیے یہ پہلو بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

تمام دولت مند گروہ اس طرح عورتوں کو مردوں سے الگ نہیں رکھتے اور نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عورتوں کی اصل زندگی کو اپنے وقار کا نشان بناتے ہیں۔ بعض اوقات عورتوں اور مردوں کی مساوات پر زور دیا جاتا ہے، وہاں مثالی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ دونوں صنفیں پہلو بہ پہلو کام کریں۔ جنسی امتیازات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے گروہ عقلیت پر اس حد تک زور دیتے ہیں کہ ایشیا والے اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔ عقلیت روایات کے متعلق انتہائی معروضی نقطۂ نگاہ پیش کرتی ہے اور جن امور کو ڈرکہیم مجلسی تعامل کے مکانیکی وثائق قرار دیتا ہے، تاکہ پیداوار اور نشو وارتقاء کے نصب العین کی پیروی کرتے ہوئے جس صنف کو زیادہ مفید سمجھا جائے اختیار کر لیا جائے، عقلیت ان چیزوں کو پیش نظر نہیں رکھتی اور چیزیں صنعت کاری سے گہری وابستگی رکھتی ہیں۔ مغربی پاکستان کی دیہاتی زندگی میں جو ثقافت رائج ہے۔ اس میں یہ عناصر مثلاً ناپید ہیں۔

قوم کے یہی درجے ہیں جن میں مغرب کے ساتھ تعلق کی وجہ سے عقلیت کی نشو ونما ہوئی۔ ان ہی کی وجہ سے عورتوں کے روایتی رسم ورواج ختم ہو رہے ہیں۔ اس طرح صنفوں کے درمیان زیادہ مطابقت پیدا ہو سکتی ہے۔ دنیا کے عام رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ پیش گوئی کرنے کو جی چاہتا ہے کہ صنعت کاری کے ارتقاء سے پاکستان میں صنفوں کے درمیان مطابقت بہت بڑھ جائے گی مگر احتیاط اس امر پر مجبور کر رہی ہے کہ ایسا نہ کیا جائے اس لیے کہ صنعت کاری جنوبی ایشیا کے ثقافتی مجموعے کے ساتھ مل کر ایک ایسی ثقافتی صورت بھی پیدا کر سکتی ہے جو مغرب سے بالکل مختلف ہو۔

عورتوں کے درجے کی وضاحت کے متعلق جو کچھ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ثقافتی عنصر اسلام کا ہے۔ اسلام نے مرد کو قوامیت کی حیثیت دی ہے۔ ساتھ ہی جنسی حجاب پر زور دیا ہے۔ اس وجہ سے مردوں اور عورتوں کے درمیان غیر حیاتیاتی امتیازات پیدا ہو گئے۔ سب سے آخر میں لوگوں کے درمیان نسبتاً وقار اور مجلسی درجے کا احساس موجود ہے جو کہ مجلسی قدر و قیمت کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ عورت کو خاندان میں وقار و احترام کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔

مکتبہ ... 99- جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تخلیقات کی تاریخ پر مستند کتب

○ پاکستان بھنور کی زد میں	اوون بینیٹ جونز (نامہ نگار بی بی سی)
○ تاریخ پاکستان (1947-1997ء)	آئین ٹالبوٹ / طاہر منصور فاروقی
○ پاکستان تہذیب کا بحران	زبیر رانا
○ سامراج اور پاکستان	ڈاکٹر فیروز احمد اپ ڈیٹ: کاشف فراز احمد
○ پاکستان بدلتا سماج	حافظ تقی الدین
○ پاکستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا سیاسی کردار	منیر احمد
○ پاکستان، سائنس، تعلیم اور معیشت	ڈاکٹر عبدالسلام ترجمہ: شہزاد احمد
○ تاریخ پنجاب	کنہیا لال
○ تاریخ لاہور	کنہیا لال
○ تاریخ پنجاب	سید محمد لطیف
○ تاریخ لاہور	سید محمد لطیف
○ لارڈ کلائیو	کرنل جی بی مالیسن / ابن حسن ایم اے
○ لارڈ ڈلہوزی	کرنل جی بی مالیسن / ابن حسن ایم اے
○ مارکوئیس ویلزلی	کرنل جی بی مالیسن / ابن حسن ایم اے
○ وارن ہیسٹنگز	کرنل جی بی مالیسن / ابن حسن ایم اے
○ لارڈ کارنوالس	کرنل جی بی مالیسن / ابن حسن ایم اے

تخلیقات

تخلیقات: علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: 042-7238014
Email: takhleeqat@yahoo.com
www.takhleeqat.com